ماہنامہ
داستانِ دل
ساہیوال
ستمبر 2016
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

اہم نوٹ

تمام مصنفین، قارئین اور شعراء حضرات سے درخواست ہے کہ وہ داستانِ دل کی تحاریر کے سلسلے میں چیف ایڈیٹر اور ایڈیٹر کے علاوہ کسی سے لین دین مت کریں۔ تمام تحاریر نیک نیتی کی بنیاد پر بغیر مفت شائع کی جاتیں۔ اگر کوئی آپ سے پیسوں کے عوض ہمارا نام لے کر تحریر مانگے تو اسے ہر گز اپنا سرمایہ مت دیں اور ادارے کو فوری اطلاع کریں

شمارہ: 05

ستمبر 2016

خط و کتابت کا پتہ: ندیم عباس ڈھکو، چک نمبر 5/79 L ڈاکخانہ 5/78 L تحصیل و ضلع ساہیوال

فون نمبر 03225494228 ہمارا ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ابتدائیہ

افسانے

ناولٹ

قسطوار ناول

مکمل ناول

آرٹیکل

مستقل سلسلے

حمد باری تعالیٰ

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دور جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا ہے لطف عام اس کا
گواہی دے رہی اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے، ہے سچا ایک نام اس کا
ہر اک ذرہ فضا کا داستاں اس کی سناتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا آ کے دیتا ہے پیام اس کا
سراپا معصیت میں ہوں، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری، خطا پوشی ہے نام اس کا
میری افتادگی بھی میرے حق میں اس کی رحمت تھی
کہ گرتے گرتے بھی میں نے لیا دامن ہے تھام اس کا
ہوئی ختم اس کی حجت اس زمین کے بسنے والوں پر
کہ پہنچایا ہے ان سب تک محمد ﷺ نے کلام اس کا
بجھاتے رہے پھونکوں سے کافر اس کو رہ رہ کر
مگر نور اپنی ساعت پر، رہا ہو کر تمام اس کا

مولانا ظفر علی خاں

نعت نبوی ﷺ

خوش خصال و خوش خیال و خوش خبر خیر البشر ﷺ
خوش نژاد و خوش نہاد و خوش نظر، خیر البشر ﷺ
دل نواز و دل نشیں و دل کشا
چارہ ساز و چارہ کار و چارہ گر، خیر البشر ﷺ
سر بہ سر مہر و مروت، سر بہ سر صدق و صفا
سر بہ سر لطف و عنایت، سر بہ سر خیر البشر ﷺ
صاحبِ خلق عظیم و صاحبِ لطفِ عمیم
صاحبِ حق، صاحبِ شق و قمر، خیر البشر ﷺ
کارزارِ دہر میں وجہ ظفر، وجہ سکوں
عرصہ محشر میں وجہ درگزر، خیر البشر ﷺ
رونما کب ہو گا راہِ زیست پر منزل کا چاند
ختم کب ہو گا اندھیروں کا سفر، خیر البشر ﷺ
کب ملے گا ملت بیضا کو پھر اوجِ کمال
کب شبِ حالات کی ہو گی سحر، خیر البشر ﷺ

حفیظ تائب

اداریہ

اللہ تیرا شکر۔۔۔ میں خوش ہوں، ملک کے کونے سے داستانِ دل کے چاہنے والوں کے بے شمار خطوط مل رہے ہیں دل تو چاہتا ہے کہ اپنے قارئین کے سارے خطوط کو اپنے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سجالوں، اتنے ڈھیر سارے خطوط کے ذریعے تمام قارئین اور رائٹرز اپنی بے ساختگی اور شوخی بھری تحریروں سے داستانِ دل کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ ان تمام قارئین اور رائٹرز کا میں نہ دل سے مشکورو ممنون ہو ہر انسان کو کسی نہ کسی کا دکھ ہے۔۔۔۔۔ یہ دنیا ہی دکھوں کی نگری ہے یہاں پل پل دکھ ملتے ہیں۔ دل میں دکھ سینے میں دکھ آنکھوں میں دکھ ہونٹوں پر دکھ، سانسوں میں دکھ انسان دکھوں کا پتلا ہے۔ دل میں جب بھی دکھوں کے انبار لگنے شروع ہوتے ہیں اسی پل میں اپنی سانسوں میں ایک انجانی سی صورت سما کر دل میں لاتعداد خوشیوں کے ارمان لئے بہت سے غموں کے سہارے اپنے دکھوں کو بغیر دیکھے، اپنے سپنوں کو اپنے لبوں میں پیار کی شمع دل کے ستاروں میں سجا کر خوشیوں کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے ایسے میں مجھے بہت بڑا آسمان بھی بہت تھوڑا نظر آنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ زمین بہت ہی چھوٹی سی ہے اور پھر میں اپنی مجبوری کو اپنی ہار سمجھ کر جینے کی تمنا کرنے لگتا ہوں، کوئی روشن چراغ دکھائی نہیں دیتا۔ تمام رات بھر دل بہت گھبراتا ہے اپنی ہی نظروں سے دل شرماتا ہے۔ گھبراتا ہے اور مجھ ہی کو پانے کے لیے میرا دل تڑپتا ہے۔ دل سے کچھ بات کروں تو دل بھی بات کرنے سے گھبراتا ہے ٹوٹے ہوئے جو خواب جوڑے تھے وہ تنکا تنکا بن کر ٹوٹ گئے بکھر گئے۔ دل کے سارے ارمان ساری خوشیاں دل میں بکھر گئی ہیں زندگی میں دل کی خوشیاں بہت کم ہو چکی ہیں۔ خوشیاں تو دل میں ویسے ہی کم ہوتی ہیں۔ لیکن دل میں غم بہت سارے ہوتے ہیں دل سے غموں کی بہت دوستی ہوتی ہے۔ میں زندگی میں گزرے ہوئے لمحات کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دل میں ہزاروں خواہشیں اور مسکراہٹیں ہوتی ہیں ہر دل ہر بار چاہتا ہے کہ اسے ڈھیر ساری خوشیاں ملیں۔ اس کا دامن خوشیوں سے بھر جائے دل بہت ساری وعدے کرتا ہے دل کے سارے وعدے پورے نہیں ہوتے۔ دل کے وعدے وفا بھی کرتے ہیں۔ اور دل کے وعدے دغا بھی کرتے ہیں دل میں محبت کے زاویئے بھی بنتے ہیں اور نفرت کے انبار بھی لگتے ہیں دل جذبوں کو جگاتا ہے دل راتوں کو رُلاتا بھی ہے دل اپنے ہی

دل کے سپنوں کے لیے ستاتا بھی ہے۔ دل کے روگ کو کوئی مناتا بھی نہیں دل بیچارہ بہت دکھ اُٹھاتا ہے، دل اپنے سارے خواب بسا کر دل میں سجاتا بھی ہے۔ پھر دل ہی دل کو رُلاتا بھی ہے۔ دل کی نگری بہت عجیب ہے، دل محبت کے بہت سارے رنگ دکھاتا بھی ہے اور پھر کبھی کبھار دل رُلاتا بھی ہے، دل محبت کا سمندر ہے میں بھی اکثر اوقات سمندر پر ضرور جاتا ہوں لوگ سمندر پر جاکر بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر میں سمندر پر جاکر روتا ہوں نجانے کیوں یہ بات میں نہیں کہتا یہ دل کی باتیں ہیں دل ہی کہتا ہے۔ وفائیں بہت رُلاتی ہیں جفائی بہت رُلاتی ہیں، کبھی کبھار یادوں میں ڈوبی ہوئی ادائیں بھی بہت رُلاتی ہیں اور دُکھ زیادہ ہو جائیں تو ٹھنڈی ہوائیں بھی بہت رُلاتی ہیں زخمی گھٹائیں بھی بہت رُلاتی ہیں تڑپاتی ہیں ستاتی ہیں ار جب دل مجھے ستانے لگتا ہے تو یہ دل بے شمار تمناؤں کے ساتھ اپنی ترستی ہوئی دل کی نگری کے ساتھ کود کے سارے غم بھلاتا ہوا خود کو ستاتا ہوا خزاؤں کے موسم میں گھٹاؤں کے سمندر میں اپنے سارے زخموں کا بوجھ اٹھاتا ہوا ٹھنڈی ہواؤں میں خود کو رُلانے لگتا ہوں اور پھر چاند کی چاندنی دیکھنے لگتا ہوں۔ مگر مجھے چاندنی دکھائی نہیں دیتی پھر میں پھولوں پر پڑی شبنم میں صبح کے نکھار دیکھنے لگتا ہوں۔ میری آنکھوں میں کوئی بھی میرا عکس نہ پڑھ سکا، دل کی ویران بستی میں کوئی بھی محبت کے پھول کھلا نہیں سکا، میں کسی سے بھی گلے نہیں کرتا میرے دل کی زخمی دنیا میں کوئی پھول نہیں کھل سکا، میں اپنے دکھ نہیں دیکھتا میرا دل ہی میرے سارے دکھ درد دیکھتا ہے۔ میں کسی کو آواز نہیں دیتا میرے دکھوں کا سفر بہت پرانا ہے میں کود اپنے خوابوں کا انسان ہوں اکثر گہری شام میں بے شمار خواہشوں کے سپنے دل میں لئے اپنے ہی دل سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے سارے خوابوں کو اپنی آنکھوں میں سجا کر دل میں بے شمار خوشبوؤں کا ہجوم لئے اپنے اشکوں سے خود کو نہلاتا ہوا درد کی اوٹ میں محبت کی نئی دنیا کی تلاش میں غم کے موسم میں خوشیوں کی تمناؤں کے لیے اپنی امیدوں کا ماتم کرتے ہوئے ایک نیاز خم لگاتا ہوا اپنے دل کو رُلاتا ہوا بیتے ہوئے سارے دُکھ جگاتا ہوا اپنے دل کو اپنی ہی آنکھوں سے مناتا ہوا زندگی کے سارے چہرے دیکھ کر اپنے دکھوں کو ابھارتا ہوا دل کو کاٹنے لگاتا ہوا درد کے سمندر میں آہٹوں کے دھوکے کھاتا ہوا دل کے سارے گلاب کھلنے کی تمنا لئے ہوئے زندگی کے چہرے پڑھنے لگ جاتا ہوں۔ میں چاند سا مکھڑا نہیں دیکھنا چاہتا میں پھولوں کے گجرے کی خوشبو سونگھنا چاہتا ہوں چوڑیوں کا کھنکنا سننا چاہتا ہوں میں زلفوں کو لہراتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں مین بادلوں میں چاند دیکھنا چاہتا ہوں جب چاند دکھائی نہیں دیتا تو میں حالات کے صحراؤں میں آجاتا ہوں اور پھر اپنے دل سے اربار پوچھنے لگتا ہوں۔ دل اتنا دُکھی کیوں رہتا ہے۔ یہ دل کی دنیا میں اتنے سارے دکھ کیوں سمائے رہتے ہیں اب چھپانے کو اپنا کچھ بھی نہیں رہا۔ دل کے زخم پرانے ہیں اب راتوں میں خود کو بھول کر اپنے ہی خوابوں کے

ادھورے سپنے دیکھنے کی کوشش کیوں کرنے لگتا ہوں۔ دل میں سوچوں کے انبار لگے ہیں اور دل بھی تو ایک ٹوٹا ہوا کھلونا ہے یادوں کا ایک اجڑا گلشن ہے۔ دل بھی ایک گہرا دھوکا ہے دل میں بے شمار چہروں کی دھندلی تصویریں دیکھتا ہوں۔ مگر محبت کرنے والی کوئی تصور نظر نہیں آتی۔ آنسو واقعی آنکھوں سے بہت محبت کرتے ہیں بار بار بہہ جانے کے بعد بھی آنسو آنکھوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔

قارئین دل تو چاہتا ہے کہ آج ہی دل کا سارا انبار نکال لوں مگر کیا کروں آپ سب کو پریشان نہیں کرنا چاہتا، داستانِ دل کی مکمل ٹیم کا میں مشکور ہوں، بہت اچھا کام کر رہے ہیں ہماری کوشش ہے کہ ہم آپ سب کے معیار پر پورا اترے، اس سلسلے میں آپ سب کا تعاون چاہئے آپ ہمیں اپنی رائے لازمی دیں، انشاء اللہ بہت جلد داستانِ دل ڈائجسٹ کی شکل میں مارکیٹ میں بھی ماجود ہو گا،،، اگر آپ کو کوئی شکایت ہو یا معلومات لینی ہو تو آپ مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اپنی رائے بھی آپ میرے نمبر پر سینڈ کر سکتے ہیں۔

دوستو.. آج جو کچھ بھی میں ہوں وہ میں والدین کی دعاؤں سے ہوں ہمیشہ والدین کی قدر کرو اُن سے پوچھو جن کے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں۔۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔۔

(جو مجھے نہیں سمجھتے وہ اتنا سمجھ لیں کے مجھے کامیاب ہونا ہے۔۔)

آپ سب کا اپنا

ندیم عباس ڈھکو ساہیوال

چیف ایڈیٹر کے الفاظ

السلام علیکم! کہیئے کیسے مزاج ہیں آپ سب کے؟ امید ہے آپ سب خیریت سے ہونگے اور اپنے اپنے شہروں میں موسم کے مزے لے رہے ہونگے۔ الحمد اللہ آزادی کے اس مہینے میں اللہ پاک نے سارے ملک میں رحمتوں کی برسات کر دی۔ موسم خوشگوار ہو گئے اور اصل معنوں میں تب خوشگواری کا احساس ہوا جب آپ کی جسارتوں کی نظر داستانِ دل کا شمارہ کیا گیا۔ چند وجوہات اور قانونی مسائل کی وجہ سے کتابی شکل میں آنے کے لئے کچھ دیر ہو رہی ہے مگر انشاء اللہ بہت جلد کتابی شکل میں یہ داستانِ دل آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔ داستانِ دل کچھ بچوں کے بے تحاشہ محنت اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں آپ تک پہنچتا ہے۔ کبھی پرچے کی صورت میں تو کبھی ویب سائٹ پر۔ میں تو بہت دور بیٹھی ان بچوں خاص طور پر ندیم عباس ڈھکو کے لئے دعائیں ہی کرتی ہوں۔ اللہ پاک اس کی محنت کا صلہ دے کر اس کو کامیاب کرے۔ وہ ادب کی دنیا میں بہت جلد اپنا مقام پیدا کر سکے (آمین) آپ سب سے بھی درخواست ہے کہ آپ سب ان بچوں کے ساتھ تعاون کیجیے۔ دیر سویر ہونے پر ناراض ہونے کی بجائے اس کی مجبوریوں کو سمجھیں۔ ان لوگوں کے بہتر مستقبل کے لئے دعائیں دیجیے۔ میرا یہاں پر صرف نام ہے باقی سب کرتے یہ بچے ہی ہیں۔ ندیم عباس ڈھکو، منظور اور محمد شعیب۔۔۔ ان بچوں کے لئے میری ڈھیروں دعائیں۔ اب اجازت

نزہت جبیں ضیاء

آؤ دین سیکھیں

بسم اللہ کے فوائد (عنبرین اختر)

اللہ تعالی نے مسلمانوں کے لئے بعض چھوٹی اور مختصر چیزوں میں بڑی خیر و برکت رکھی ہیں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی ایسے ہی خزانے میں شامل ہے۔ اس آیت کے ذریعے اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے اور مدد بھی ایسی کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے پاس بسم اللہ جیسی قوت و طاقت ہونے کے باوجود اگر ہم مایوس اور ناامید ہوتے تو یہ بڑی ہی دکھ کی بات ہے۔

بسم اللہ کے بے شمار فوائد ہیں۔ جن میں سے کچھ یہاں بیان کئے جا رہے ہیں۔

1۔ جو شخص اپنی بیوی کے پاس جانے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لے تو شیطان دور ہٹ جاتا ہے۔

2۔ جو شخص کسی کسی جانور پر سوار ہوتے ہوئے بسم اللہ اور الحمد اللہ پڑھ لے تو اس جانور کے ہر قدم پر اس کے سوار کے حق میں ایک نیکی لکھ دی جائے گی۔

3۔ جو شخص کسی کشتی میں سوار ہوتے ہوئے بسم اللہ اور الحمد اللہ پڑھ لے گا۔ جب تک وہ اس میں سوار رہے گا۔ اس کے واسطے نیکیاں لکھی جائیں گی۔

4۔ جو بیمار بسم اللہ پڑھ کر دوا کھائے گا انشاء اللہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔

5۔ حضرت خالد بن ولید کے پاس کوئی شخص زہر لے کر آیا اور کہا کہ اگر آپ اس زہر کو پی کر صحیح سلامت رہیں تو ہم جان لیں گے کہ اسلام سچا ہے۔ آپ نے بسم اللہ پڑھ کر وہ زہر پی لیا اور وہ خدا کے فضل سے زندہ رہے۔ یہ دیکھ کر دشمن ایمان لے آیا۔

6۔ جو کام بسم اللہ پڑھ کر شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت رہتا ہے۔

غرض بسم اللہ کے بے شمار فوائد ہیں۔ جن کو ایک ساتھ بیان کرنا ناممکن ہے گویا اللہ تعالی نے بسم اللہ کی صورت میں انسان کو ایک تحفہ دیا ہے۔

پاکستان کی ابھرتی شاعرہ شازیہ کریم کے قلم سے

جب آنکھوں میں بہت سے آنسو جمع
ہوں
دل میں اک تڑپ ہو
درد برداشت سے باہر ہو
تو رب سے التجا کرنا
اس پاک مہینے کی
مبارک راتوں میں
اپنے رب سے مانگ لینا
اپنوں کی خوشیاں
اپنوں کی ہنسی تم بس دعا کرنا
یقین رکھنا اپنی مانگی سبھی دعاؤں پر
مایوس نہ ہونا کبھی بھی تم
وہ نواز دے گا تم کو
تمہاری چاہت بھی
جب تم کرو گے پرواسکی چاہت کی
نہیں ہے کن اسکا محدود
وہ جس کو چاہے عطا کرے
وہ رحیم ہے کریم بھی
لفظوں میں اور کروں بیاں میں کیسے
اسکی ذات پاک کو
نہیں کوئی چیز بھی پوشیدہ اس کی ذات

پاک سے وہ جان لیتا ہے روح میں
چھپی اذیتیں بھی وہ قریب ہے اتنا
شہ رگ سے بھی
ظاہر میں بھی تو
باطن میں بھی تو
تو ہی تو ہے کن فیکون

☆ ☆ ☆

تمہاری یادیں
تمہاری باتیں
تمہاری شوخیاں
وہ تمہاری شرارتیں
وہ مجھے تنگ کرنا
وہ پہروں تم سے باتیں کرنا
وہ میرا چھوٹی باتوں پر روٹھنا
اور تمہارا منانا وہ میرے ناز اٹھنا
جاناں
وہ سب یاد آتا ہے
تو چپکے سے میری آنکھیں بھر آتی
ہے
یہ میرے ضبط کی آخری حد نہیں

ہوتی
میری سسکیاں گونج اٹھتی ہے
شدت درد سے میری سانسیں
اکھڑنے لگتی ہے
در و دیوار چیخ اٹھاتے ہیں
تمہاری جدائی میں جاناں ہم پل
پل مرتے ہیں
تمہاری باتیں
تمہاری یادیں
جاناں
مجھے سونے نہیں دیتی
مجھے کسی کا ہونے نہیں دیتی
سنو
بس لوٹ آؤ تم
کہ ابھی وقت ہے باقی
تمہارے بہت اداس رکھتی ہیں
مجھے پل پل رولاتی ہیں
مجھے جینے نہیں دیتی
کسی کا ہونے نہیں دیتی

☆ ☆ ☆

پاکستان کی مایہ ناز شاعر ارشد محمد ارشد کا کلام

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہمکلام ہوا
بنانے والے نے سوچا یہ دل بناتے ہوئے
کہیں تو اپنے بھی رہنے کا انتظام ہوا
فلک سے یونہی تو ہم خاک پر نہیں آئے
ہمارے واسطے کیا کیا نہ اہتمام ہوا
لبھا رہے تھے اسے ہر طرف حسین منظر
ہمارے نفس کا گھوڑا نہ بے لگام ہوا
نجانے کونسی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا
بچا کے لایا تھا جنات سے میں شہزادی
اسی کے ساتھ کہانی کا اختتام ہوا
عجیب کیف میں ڈوبی تھیں انگلیاں ارشد
کسی کا لمس مری عمر بھر کا جام ہوا

☆ ☆ ☆

ایک بس تیری طلب کی ہے تو کیا کیا چھوڑا
کار الفت میں پڑا یوں کہ زمانہ چھوڑا
میرے اس عزم کو دیکھا تو فلک بوس کئی
آڑھی ترچھی سی چٹانوں نے ہے رستہ چھوڑا
جب بھی روٹھے ہو تمہیں ہم نے منایا ہے مگر
تم نے عادت ہی بنالی سو منانا چھوڑا
سورۃ الناس پڑھی اور پڑھی سورہ فلق
پھر بھی یادوں کی چڑیلوں نے نہ پیچھا چھوڑا
دھول راہوں کی ہوا یوں میں تمہارے کارن
اے میاں! عشق نہیں تم نے کہیں کا چھوڑا
شاخ سے لپٹا ہوا سانپ دکھائی جو دیا
خوف ایسا تھا کہ پنچھی نے ٹھکانہ چھوڑا
یہ بھی معلوم ہے ارشد وہ نہیں آئے گا
میں نے پھر بھی نہیں راہوں کو سجانا چھوڑا

☆ ☆ ☆

قرطاس پہ قلم سے یوں نشتر لگایئے
جب دل بنا لیا ہے تو دھڑکن بنایئے
جل کے میں راکھ ہو بھی چکا ہوں مرے حضور
بہتر یہی ہے آپ مجھے بھول جایئے
آنکھوں سے اپنی اس لئے الجھا ہوں رات بھر
نیندوں کے ساتھ خواب کوئی ہونا چاہیے
بڑھتے ہوئے سکوت کا یوں توڑیئے غرور
کوئی غزل تو میر کی اب گنگنایئے
اس نے کہا! خزاؤں میں کھلتے نہیں گلاب
میں نے کہا! کہ آپ ذرا مسکرایئے
طغیانیوں کے شور سے مرعوب کیوں ہوئے
دریا کو گھیر گھار کے صحرا میں لایئے
مل تو گئی ہے آپ کو میراث قیس کی
ارشد اب اپنے دوش پر وحشت اٹھایئے

☆ ☆ ☆

وہیں تک دیکھتا ہوں میں نظر میری جہاں تک ہے
خبر کیا ہے کراں ساگر ترا ساحل کہاں تک ہے
نجانے کب تصور سے حقیقت میں بدل جائے
کسی کا چاند چہرہ جو ابھی وہم و گماں تک ہے
عدو نے من گھڑت باتیں سبھی ہے پر اڑائی ہیں
حقیقت اس کہانی کی فقط اک راز داں تک ہے
ادھر آ میں بتاتا ہوں تخیل کس کو کہتے ہیں
اڈاری اس پرندے کی زمیں سے آسماں تک ہے
محبت کے کرشمے سے ہوئے تخلیق دو عالم
اسی کی سب عطا ہے جو مکاں سے لامکاں تک ہے
پھر اس کے بعد سب اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے
تری چوپال کی رونق ہماری داستاں تک ہے
یقیناً کچھ نہ کچھ اس کو تسلی ہو ہی جائے تی
دل مضطر کی ساری اضطراہی امتحاں تک ہے
کنارے ضبط کے اب ٹوٹنے کا خوف ہے ارشد
مری آنکھوں کا پانی بھی تو خطرے کے نشاں تک ہے

☆ ☆ ☆

میرا نام منظور اکبر ہے اور ادبی دنیا میں ڈاکٹر منظور اکبر تبسم کے نام سے پہچان ہے. زندگی کی 23 بہاریں دیکھ چکا ہوں. اپنی زندگی کو خدمت خلق کے لئے اور ادب کیلئے وقف کر رکھا ہے. ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں ڈیوٹی کے بعد ذاتی کلینک پر مصروفیات کے باوجود ادب سے بہت زیادہ قربت ہے اور دونوں شعبوں میں خود کو بہت پر سکون محسوس کرتا ہوں. والدین کا بہت چہیتا ہوں اور ایک چھوٹے بھائی کے علاوہ سب بڑے بہن بھائی ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں.

اس کے علاوہ "ماہنامہ داستان دل ساہیوال" بطور آفس مینجر فرائض سر انجام دے رہا ہوں. اس کو فرض کے ساتھ ساتھ اپنا ذاتی اہم زندگی کا حصہ سمجھتا ہوں اور یہ ذمہ داری جب تک سانس ہے نبھاؤں گا. انشاءاللہ

س: آپ نے ادبی سرگرمیوں کا آغاز کب کیا؟

ج: اس وقت میں مڈل کلاس کا طالبعلم تھا جب پہلی بار لکھنا شروع کیا.

س: سب سے پہلے کیا لکھا اور کس ڈائجسٹ میں لکھا؟

ج: لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا ہے لیکن ادبی دنیا میں بہت کم تحریریں شائع ہوئیں. نوعمری میں بہت سی تحاریر خط و کتابت میں گم ہو گئیں. جو ادارہ تک پہنچتی وہ اصلاح کی بجائے ردی کی ٹوکری کی نزر کر دیتے. بہر کیف ماھنامہ "تسلیم عرض (جسکو بعد میں سلام عرض بنا دیا گیا) میں میری پہلی تحریر " کبھی سوچا نہ تھا" تین اقساط پر 2012 میں شائع ہوئی.

س:اس کے علاوہ کس ڈائجسٹ نے پزیرائی دی؟

ج: حقیقت کو کبھی جھٹلایا نہیں جاتا اور لوگ نفی باتیں بہت کرتے ہیں لیکن ماھنامہ جواب عرض لاھور نے پورے پاکستان کے علاوہ پوری دنیا میں مجھکو بہت زیادہ عزت، شہرت اور پذیرائی دی. اس کی سب سے بڑی وجہ میری معاشرتی اور سچی کہانیاں تھیں جو وقت پہ شائع ہوتی رہیں.

س: ماہنامہ جواب عرض نے جہاں آپ کو اتنی عزت دی وھاں اور کیا ملا؟

ج: وھاں کہانیوں کے عوض انعام کا نہ لالچ تھا نہ کبھی دیا جاتا تھا لیکن وھاں سے بہت اچھے اور مخلص دوست ضرور ملے جن میں قابل ذکر ملک ندیم عباس ڈھکو ہیں جس کے ساتھ قریبی اور گہرے تعلقات ہیں

س: آپ کی نظر میں دوستی کیا ہے؟

ج: میری نظر میں دوستی بہت اچھا اور رازدرانہ رشتہ ہے مگر افسوس کہ اب یہ رشتہ برائے نام رہ گیا ہے. دوستی کو لوگوں نے صرف وقت گزاری اور خاص کر ہوس کا راستہ دے دیا ہے. اس لئے دن بدن لوگوں کے اندر یگانگت کم اور دھوکہ بازی کو فروغ مل رہا ہے. اگر دوستی کو کوئی دل سے سمجھے تو یہ ایک انمول اور قیمتی تحفہ ہے.

س: آپکی کون سی کہانیوں کو بہت زیادہ پزیرائی ملی؟

ج: میری بہت ساری کہانیاں دفاتر میں موجود ھین اور تمام ہی سچی کہانیاں ہیں. لیکن جن کہانیوں کو زیادہ پسند کیا گیا ان میں "بدلتے موسم، کبھی سوچا نہ تھا، دیوانگی کہاں جا کے ٹھہری، کہاں ہے تیرا پیار سجنا، یہی میرا نصیب تھا، عشق ہو تو ایسا، بس اک تیرا انتظار، گم نام تھی منزل، لالچی محبت، یہ ستم نہ بھولے گا، ایک ہی راستہ وغیرہ.

س: آپ کی زندگی میں ادبی لحاظ سے کون سا دن بہت زیادہ خوشی کا تھا؟

ج: ویسے تو جب پہلی تحریر کو ڈائجسٹ کی صفحات کی زینت پایا تو بہت خوشی ہوئی تھی لیکن خوشی کا یادگار دن 16 مارچ 2013 تھا جس دن جواب عرض اور سلام عرض کی طرف سے مجھکو "گمنام تھی منزل" کہانی پر ایوارڈ سے نوازا گیا اور اسی مقام پہ میری پنجابی شاعری کو حد سے زیادہ پسند کیا گیا.

س: یاد آیا کہ آپ تو لکھاری ہونے کے ساتھ شاعر بھی ہیں. کب سے شروع کی شاعری اور کس زبان میں کی؟

ج: جناب ھم کہاں شاعر ہوئے. ابھی تو طفل مکتب ہیں. بس جب دل پہ چوٹ لگی شاعر بن گئے. اچھے استاد کی تلاش جاری ہے. پنجابی اور اردو میں شاعری کرتا ہوں. پنجابی شاعری میں ایوارڈ یافتہ ہوں اور گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج جھنگ کے سالانہ میگزین "کاروان" میں شاعری شائع ہو چکی ھے جو کہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ھے

س: پنجابی شاعری میں اتنا لگاؤ کس وجہ سے ہے؟

ج: پنجابی ہمارے صوبہ کی پہچان، وصیبی زبان، اور ہماری ماں بولی ہے. یہ ہمیں ورثہ میں ملی ہے. اسکو چھوڑ دینا تو ایسے ہے جیسے اپنے آباؤ اجداد کو بھلا دینا اور انکی وصیت کا بھرم نہ

رکھنا. میں ہمیشہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی کو فوقیت دیتا ہوں.

س: اردو زبان کے بارے کیا کہنا چاہیں گے ؟

ج: اردو زبان ہماری قومی اور معیاری زبان ہے. ہمارے بزرگان نے اس زبان کو بہت عزت دی اور بہت ساری کتابیں لکھیں لیکن ہمیشہ اردو زبان کا معیار کو اس وقت گرا دیا جاتا ہے جب بہت بڑے دانشور، ادیب، شعرا اپنی تصانیف میں بڑھ چڑھ کر انگریزی کو لکھتے ہیں. اگر اردو ادب سے دلی وابستگی ھے تو کوشش کرو کہ اردو تک ہی محدود رہیں.

س: آپ ضلع جھنگ میں رہتے ہیں. سنا ہے جھنگ تاریخی لحاظ سے بہت مشہور ہے ؟

ج: جی ہاں، جھنگ تاریخی لحاظ سے بہت مشہور اور معروف ضلع ہے. تاریخی لحاظ سے کہتے ہیں جھنگ اور ملتان ایک ہی تھے مگر بعد ازاں ان کو دو اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا. عظیم عارفانہ شاعر حضرت سلطان باہو رح کا تعلق بھی جھنگ سے ہے جن کو سلطان العارفین کے نام سے پہچانا جاتا ہے. ان کا عارفانہ کلام ہر انسان جانتا، سنتا اور پڑھتا ہے. اس کے علاوہ مشہور بزرگان میں حضرت شاہ جیونہ کروڑیہ کا دربار بھی جھنگ میں ہے جس کی مشہور تاریخی رسم " رسم چراغ" دیکھنے ھر سال 10 مئی کے پورے ملک سے لوگ آتے ہیں. اس رسم کی خاص بات یہ ہے کہ چراغ کو پنجرے میں جلا کر 50 فٹ اونچے شاہتیر پر چڑایا جاتا ہے. اگر چراغ مقررہ مقام پر جانے سے پہلے بجھ جائے تو گدی نشین دربار عالیہ شاہ جیونہ کروڑیا اور ملنگ اسی وقت زائرین کے سامنے رحلت فرما جاتے ہیں. لیکن قدرتا آج تک تیز آندھی میں بھی چراغ نہیں بجھ سکا.

مشہور عاشق ھیر اور رانجھا کا مزار بھی یہی جھنگ شہر میں ہے.

اولیائے کرام میں حضرت لعل مرید، حضرت ماڑی شاہ سخیرہ، حضرت ہاتھی وان، حضرت شیخ علی، حضرت نور سلطان، مائی باپ و دیگر بزرگان کی درگاہیں اور خانقائیں یہاں موجود ھیں جہاں پوری دنیا سے لوگ تشریف لاتے ہیں. اس کے علاوہ جھنگ کو دو دریاؤں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ دو مشہور دریا جہلم اور چناب تریموں ہیڈ ورکس کے مقام پر ملتے ہیں. مشہور سائنسدان "ڈاکٹر عبد السلام" جھنگ سے ہین جن کو سائنسدان ھونے کو نوبل اعزاز ملا. مشہور پنجابی شعرا بھی جھنگ سے ہین جن میں شیر افضال جعفری اور اردو شاعر مجید امجد کا تعلق جھنگ سے ہیں. نوجوان نسل کے شعراء عاقب ستیانوی، شاہ محمد دانش، ریاض حسین ابرار، ڈاکٹر خوشنود، ثمرن، راقب اور گلوکاروں میں منصور ملنگی، اشاد ٹیڈی. طالب حسین درد، اشرف لٹی، اللہ دتہ و ندیم لونے والا کا تعلق بھی جہنگ سے ہے.. (دوسرا حصہ اگلے شمارے میں)

یہ انٹرویو آپ کو کیسا لگا؟

کس ھستی کا انٹرویو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں انبکس کریں، ہمارے فیس بک پیج پر

پہنچی کہاں بہار

نزہت جبیں ضیاء

''مالا! بیٹی، چھت سے لحاف اُتار لاؤ شام ہو رہی ہے کہیں اوس شروع نہ ہو جائے۔'' دادو کی آواز پر مالا۔ ''اچھا دادو۔'' کہہ کر چھت پر جانے لگی۔ وہ لحاف لے کر پلٹی ہی تھی کہ برابر والی چھت پر کھڑی ماہین کو دیکھ کر اس کے قریب آ گئی۔ دونوں مل کر باتیں کرنے لگیں۔ کافی دیر بعد وہ لحاف لے کر نیچے اتری دادو کے ساتھ برآمدے میں کسی اجنبی شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اجنبی کی پیٹھ اس کی جانب تھی۔

''آؤ بیٹی مالا! میراب آیا ہے!'' دادو نے کہا۔

''میراب۔۔۔؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ دل دھڑکا' اس نے لحاف وہیں تخت پر ڈال دیے۔ میراب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''السّلام علیکم!'' مالا نے جلدی سے کہا۔

''وعلیکم السّلام۔'' کہہ کر میراب آنکھیں پھیلائے اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔مالا ہے؟'' لہجے میں حیرت تھی۔

''کیوں کوئی شک ہے کیا؟'' مالا نے قریب آکر تلخی سے کہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''نہیں!'' اس بار وہ گڑبڑا گیا۔ کیونکہ آج کی مالا اور چند سال پہلے والی مالا میں بہت فرق نظر آ رہا تھا۔ تیل سے چپڑے لمبے بالوں کی جگہ جدید انداز کے ڈائی کیے بال اور جدید فیشن کے ٹراؤزر اور شرٹ میں چُنری اوڑھے بااعتماد اور پُروقار سی مالا اس کے لیے قطعی نئی تھی۔ مالا نے ایک گہری نظر میراب کے حیران چہرے پر ڈالی گزشتہ سالوں میں اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسے حیران چھوڑ کر مالا نیچے تلے

قدم اٹھاتی کچن کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد مالا آئی تو ہاتھ میں گرم گرم بھاپ اڑاتی کافی اور چاکلیٹ کیک تھا۔

''یہ کیک گھر میں بنا ہے کھایئے گا ضرور اور ہاں کافی بھی میں نے بنائی ہے۔'' ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ٹرے سامنے رکھ کر وہ منظر سے غائب ہوتے ہوئے میراب کو اچھی طرح نشانہ بنا کر گئی تھی۔ کچھ دیر بعد میراب چلا گیا۔

مغرب کی اذان کے ساتھ ہی دادو وضو کرنے اٹھ گئیں اور وہ نماز پڑھنے چل دی نماز سے فارغ ہو کر الماری کھولے کپڑے سلیکٹ کر رہی تھی کہ دادو آ گئیں۔

''بیٹی! میراب کا آنا تجھے برا لگا کیا؟'' سوال پر وہ چونک کر پلٹی۔

''ارے نہیں دادو کیسی بات کر رہی ہیں آپ' آپ کا نواسا ہے وہ۔ آپ کی مرحومہ بیٹی کا بیٹا۔'' دادو کے نڈھال وجود پر اسے ترس آ گیا تھا۔

''بیٹی مالا' وہ۔۔۔ وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔''

''پلیز دادو۔۔۔!'' اس نے آگے بڑھ کر دادو کو تھام لیا۔

''چھوڑیں بھی اب' آپ کچھ مت سوچیں' اللہ نے جو کیا بہتر کیا' میں۔۔۔ میں تو خوش ہوں نا آپ کے ساتھ، اچھا آئیں یہاں بیٹھیں میرے پاس' دیکھیں نا میرا یہ دوپٹہ جو ماہین نے کاڑھ کر دیا ہے۔'' اس نے دادو کی توجہ ہٹانے کی خاطر پنک کاٹن کا دھاگوں کے کام والا دوپٹہ ان کے سامنے پھیلا دیا اور کچھ دیر بعد ہی مالا نے انہیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر ان کا موڈ بالکل بحال کر دیا۔ بظاہر مطمئن اور ہنسنے والی مالا آج میراب کو دیکھ کر ایک بار پھر بکھر گئی تھی۔

ماضی کی تلخ یادیں پھر سے اسے ستانے لگی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد دواؤں کے اثر سے دادو تو جلد سو گئیں لیکن مالا۔۔۔ مالا کی آنکھوں سے جیسے نیند روٹھ چکی تھی۔

mm**mm

صدّیقہ بیگم کے دو بچے وہاب اور انیلہ تھے۔ وہاب بڑا تھا اور انیلہ چھوٹی صدّیقہ بیگم کے شوہر ایک بہت بڑے زمین دار تھے اس لیے ان کے انتقال کے بعد صدّیقہ بیگم مالی لحاظ سے مستحکم رہیں۔ وہاب نے بھی پڑھائی مکمل کر لی تھی۔ ابھی وہ زمینوں وغیرہ کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا پھر وہ لوگ شہر میں آباد تھے سارا انتظام منشی عنایت سنبھالتے۔ وہاب کبھی کبھی گاؤں جا کر زمینوں وغیرہ کا حساب دیکھ لیتے۔ انیلہ ابھی میٹرک میں تھیں' صدّیقہ بیگم بہو لانا چاہتی تھیں ایسے میں گاؤں جاتے جاتے وہاب نے وہاں کی ایک لڑکی پسند کر لی اور جب ماں سے اپنی پسند کے بارے میں بتایا تو صدّیقہ بیگم نے صاف انکار کر دیا۔ وہاب نے طیش میں آ کر خود ہی شادی کر لی اور صدیقہ بیگم نے انہیں جائیداد سے بے دخل کر دیا۔ وہاب جو گاؤں گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے اور صدّیقہ بیگم نے بھی دل پر پتھر رکھ لیا۔ وہاب کی بیوی ایک ان پڑھ اور

گاؤں کے ماحول میں پلی جاہل لیکن خوب صورت عورت تھی۔ نہ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ نہ بات کرنے کا ڈھنگ۔ صدّیقہ بیگم نے مناسب رشتہ دیکھ کر انیلہ بیگم کی شادی کر دی اور اس شرط پر کہ وہ گھر داماد رہیں گے۔ انیلہ کے شوہر احمد دوبئی میں جاب کرتے تھے۔ کئی ماہ و سال بیت گئے کبھی کبھار گاؤں سے وہاب کی کوئی خبر مل جاتی جسے سن کر صدیقہ بیگم سنی ان سنی کر دیتیں احمد چھٹیوں پر آتے کچھ ماہ رہ کر واپس چلے جاتے پھر احمد کو وہاں اچھا گھر وغیرہ مل گیا تو انہوں نے انیلہ کو بلوانے کا سوچا۔ انیلہ کا ایک بیٹا میر اب تھا جو اَب بیس بائیس سال کا ہو گیا تھا اور ایم بی اے کر رہا تھا۔ انیلہ اور احمد نے سوچا کہ میر اب کو بھی یہیں بلوائیں گے ورنہ صدّیقہ بیگم اکیلی رہ جاتیں یوں انیلہ دوبئی چلی گئیں اور میر اب نانو کے پاس رہ گیا۔

پھر اچانک خبر آئی کہ وہاب کا انتقال ہو گیا ہے' اس کی بیوی کے انتقال کی خبر تو کئی سال پہلے آچکی تھی لیکن بیٹے کی موت کی خبر اور پھر ایک جوان پوتی کی موجودگی کی خبر نے صدّیقہ بیگم کے حواس چھین لیے اور وہ دھڑام سے گر پڑیں۔

میر اب نے دوڑ کر نانوں کو سنبھالا ہوش میں آئیں تو ایک ہی رٹ تھی کہ ''مجھے میری پوتی لا دو۔ ہائے میری معصوم پوتی' میرے بچے۔ تُو نے ماں کو شکل تک نہ دکھائی۔'' وہ دوبارہ بلک پڑیں۔ پھر منشی عنایت کی کوشش سے مالا اپنی دادو سے ملی۔ دونوں دادی پوتی دھواں دھار روتی رہیں۔ مالا جو خود کو بے آسرا سمجھ رہی تھی اپنی دادو کی نرم آغوش میں آکر اسے تحفظ کا احساس ہوا۔

میر اب کسی کام سے گیا ہوا تھا' جب شام کو لوٹا تو بر آمدے میں نانو کے ساتھ بیٹھی مالا کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پندرہ سولہ سال کی ذرا موٹی سانولی رنگت والی لڑکی تھی جس کے بالوں میں تھوک کے حساب سے تیل چپڑا ہوا تھا اور تیل کی چکناہٹ سے چہرہ بھی متاثر تھا۔ لمبی لمبی چوٹیوں میں رنگ برنگا پراندہ ڈالے شاکنگ پنک اور اورنج بڑے بڑے پھولوں والے ڈھیلے ڈھالے اور بے تکے کپڑوں پر لمبی سی کالی چادر لپیٹے وہ عجیب بے وقوف لڑکی نظر آرہی تھی۔

''آؤ' آؤ میر اب یہ مالا ہے۔ وہاب کی بچی۔'' صدیقہ بیگم کی آواز بھر اگئی۔ مالا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اونچا لمبا' سانولی رنگت' گھنے بالوں والا وہ نوجوان اسے اچھا لگا تھا۔

''السّلام علیکم!'' مالا نے سلام کیا۔

''وعلیکم السّلام!' کہہ کر میر اب تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ مالا کو دیکھ کر میر اب کو عجیب سی گھِن آرہی تھی۔ واقعی اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ گاؤں سے آئی ہے۔

مالا کے آجانے سے صدّیقہ بیگم بہت مطمئن ہو گئی تھیں کہ اب میر اب دوبئی جائے گا تو مالا تو ساتھ رہے گی۔ میر اب کو مالا کے وجود سے ہی وحشت ہوتی' وہ اپنے کام سے کام رکھتا

اور کوشش کرتا کہ مالا سے سامنا ہی نہ ہو، لیکن گھر کے سارے کام مالا نے سنبھال لیے تھے۔ وہ میر اب کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کر دیا کرتی۔

ایک دن شام کو میر اب اتفاق سے گھر پر تھا۔ مالا دادو کے ساتھ بیٹھی دوپٹے پر کڑھائی کر رہی تھی، دادو سبزی بنا رہی تھیں، میر اب کچھ فاصلے پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ مالا پر ڈالی، شاید آج نہا کر بیٹھی تھی تب ہی لمبے لمبے بالوں میں تیل چپڑا ہوا نہیں تھا۔ میر اب نے اسے آج تک کچھ پڑھتے نہ دیکھا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی میر اب اس سے پوچھ بیٹھا۔

''مالا! کیا تم کبھی اسکول نہیں گئیں؟''

''ہاں جی، میں نے گاؤں کے سرکاری اسکول سے دس جماعتیں پڑھی ہیں، پھر ابا نے کہا کہ بس اب کون سی ماسٹرنی کی نوکری کرنی ہے، اس لیے بس آگے نہیں پڑھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تمہیں شوق بھی نہیں ہے پڑھنے کا؟'' دوبارہ پوچھا۔

''نہ جی نہ، اتنا سارا تو پڑھ لیا، لکھ پڑھ سکتی ہوں۔ خط بھی لکھ سکتی ہوں۔ اب کیا ضرورت ہے؟'' لہجے میں فخر کے ساتھ ساتھ پڑھائی سے قطعی بیزاری بھی تھی۔

''واقعی اتنا سارا پڑھ لیا ہے۔ پی ایچ ڈی کر لی ہے سرسوں کے تیل پر۔'' طنز سے بڑبڑاتا ہوا وہ اپنی کتابیں سنبھال کر اٹھ کر اندر چلا گیا اور مالا حیرت سے اس کی پشت دیکھتی رہی۔ کتنا اچھا لگتا تھا اسے میر اب، بالکل فلموں کے ہیرو جیسا، لیکن اس کی جانب وہ دیکھتا بھی نہیں تھا۔

پھر جب مالا کو دادو کی زبانی معلوم ہوا کہ میر اب دوبئی جا رہا ہے تو مالا کے اندر جیسے کچھ کھلبلی سی ہوئی۔ عجیب سی اداسی نے اسے گھیر لیا۔ اتنی دور جا رہا تھا وہ، اپنے اس جذبے پر خود ہی حیران ہو رہی تھی۔ یہ کیا تھا؟ شاید وہ میر اب کو چاہنے لگی تھی۔ معصوم سی مالا کا معصوم سا دل اس کی چاہ کر بیٹھا تھا جو ہر لحاظ سے اس سے کوسوں دور تھا۔ اس کا دل جب بہت پریشان کرنے لگا تو وہ دادو کے پاس آگئی جہاں آکر اسے سکون ملتا تھا۔

دادو بھی اس کا بہت خیال رکھتیں۔ بچوں کی طرح اس سے ایک ایک بات پوچھتیں، مالا دادو کے ساتھ مطمئن تھی ایک بے کلی تھی تو میر اب کے رویے سے۔

''بیٹی تُو یہاں آکر خوش تو ہے نا؟ تجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، اگر کچھ چاہیے تو کہہ دے۔'' ایک روز دادو نے پیر دباتی مالا سے پوچھا۔ تب اس کا دل چاہا تمام تر حیا بالائے طاق رکھ کر کہہ دے۔ ''دادو! میر اب مجھے دے دو۔''

''مالا کیا سوچ رہی ہے بچی؟'' دادو کی آواز پر وہ چونکی۔

''دادو! آپ نے مجھے بہت پیار، ہر چیز تو دے رکھی ہے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' آنکھوں میں آئی نمی کو چھپا کر وہ دادو کی

بانہوں میں سما کر دھیرے سے بولی اور دادو نے مسکرا کر اسے سینے سے لگالیا۔

میر اب کے جانے کے دن بالکل قریب آ گئے تھے۔ مالا کا دل چاہتا تھا کہ وہ میر اب سے بہت سی باتیں کرے، اس کے ماضی کے بارے میں معلوم کرے، اپنا ماضی اسے بتائے اور آنے والے دنوں کی بھی اچھی اچھی باتیں لیکن۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو بالکل بھی گھاس نہ ڈالتا بلکہ اب تو اس کی مصروفیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔

مالا کی دوستی تو آس پاس کی لڑکیوں سے ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ اکثر ان کے ساتھ بازار چلی جاتی، گرمیوں کی آمد تھی اس لیے دادو نے اسے گرمیوں کے کپڑے لانے کے لیے کہا تو وہ اس روز ماہین کے ساتھ بازار آ گئی۔ اپنے لیے اور دادو کے لیے بھی دو سوٹ لے آئی۔ شاپر سنبھالے وہ خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئی خلاف معمول دادو بر آمدنے کے بجائے اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھی اور اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔ اندر میر اب بھی تھا۔

''میر اب بیٹا، انیلہ نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تمہارے جانے سے پہلے تمہارا اور مالا کا نکاح کر دوں۔ مالا گھر کی بچی ہے، سلیقہ مند اور سگھڑ ہے یقیناً اچھی بیوی ثابت ہو گی اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے تسلی رہے گی۔''

''اوہ نو نانو، یہ۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔'' میر اب کی آواز قدرے تیز تھی۔ ''وہ۔۔۔ وہ بے وقوف اور گاؤں کی لڑکی، جسے نہ پہننے کا ہوش ہے نہ بات کرنے کا سلیقہ۔ جو پاؤ بھر تیل سر میں بھر کر ہر وقت تھیلوں میں ملبوس دو شالہ لپیٹے رہتی ہے، نہ لباس کا خیال ہوتا ہے نہ ہی فیشن اور دنیا کے بارے میں خبر۔ میں ایم بی اے ایسی لڑکی کے ساتھ۔ اوہ گاڈ۔۔۔! آپ لوگوں نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ اسے تو نہ کافی بنانی آتی ہے نہ ہی اچھی کوکنگ بیکنگ، نانو آئی ایم سوری لیکن میں۔۔۔ میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔''

اتنی تذلیل، اف خدایا۔۔۔! مالا کو لگا جیسے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں انڈیل دیا گیا ہو۔ وہ الٹے پیر پلٹی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی اتنی تضحیک اور تذلیل پر اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ اسے لگا جیسے اس کے سارے وجود میں آگ سی لگ گئی ہو۔ اس کا روم روم جلنے لگا تھا۔ شدتِ غم اور شرمندگی سے وہ بکھر رہی تھی، لیکن اسے خود پر قابو پانے میں کمال حاصل تھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ سنبھل کر بظاہر ہنستی مسکراتی شاپر سنبھالے دادو کے کمرے میں تھی اور وہ دشمنِ جاں ایک نگاہ اس پر ڈال کر کمرے سے نکل چکا تھا۔

پھر میر اب چلا گیا اور جاتے جاتے مالا کی سوچوں کو نیا رنگ دے گیا۔ اس کی سوچوں میں واضح تبدیلی آ گئی تھی، شاید

اسے اپنی کم وقعتی کا احساس ہو گیا تھا۔

"دادو! میں نے سوچا ہے کہ پڑھائی دوبارہ شروع کر دوں۔" مالا کی بات پر دادو نے چونک کر اسے دیکھا۔ "ہاں دادو' میرے خیال میں اس دور میں پڑھائی بہت ضروری ہے۔' پڑھائی کے بغیر انسان تو کسی قابل نہیں رہتا۔ نہ ہی زمانے کے بارے میں سمجھ سکتا ہے۔ نہ ہی اس میں عقل اور رکھ رکھاؤ آسکتا ہے۔" اس کے لرزتے لہجے پر دادو نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ۔۔۔یہ۔۔۔ لڑکی اتنی گہری بات' یقیناً میراب کی بات پر۔

"مالا۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔"!

"ہاں' دادو میں پڑھوں گی بہت زیادہ' میں۔۔۔ میں خود کو بدل دوں گی دادو۔ میں جاہل اور گنوار نہیں رہوں گی دادو۔" دفعتاً وہ ہذیانی انداز میں کہتی ہوئی دادو سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی۔ آج بھی میراب کا ایک ایک لفظ نشتر بن کر اس کے وجود کو زخمی کر رہا تھا دادو بھی مالا کے غم میں اس کے ساتھ رو دیں۔

اب تو جیسے مالا کی دنیا بدل رہی تھی۔ اس نے دوسرے دن سے ہی ماہین کے ساتھ مل کر ایڈمیشن کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی ماہین سے کورس لیا اور دن رات مصروف رہتی اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ بیکنگ کلاسز بھی لینا شروع کر دیں' ساتھ ساتھ جدید تراش خراش کے لباس کی کلاسز بھی ہفتے میں ایک بار لینے لگی۔ زندگی کو مصروف کر کے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

میراب کا کبھی کبھار فون آجاتا وہ آواز پہچان کر دادو کو تھما دیتی۔ حالانکہ انیلہ سے وہ بات کرتی' میراب نے وہاں ایک کمپنی جوائن کر لی تھی جس کا رابطہ کراچی سے بھی تھا لیکن وہ کافی عرصہ نہیں آیا ماہ و سال گزرتے رہے۔

اس عرصے میں مالا نے امتیازی نمبروں سے گریجویشن کیا اور ساتھ ہی ایم اے کی تیاری کرنے لگی ایسا لگتا تھا کہ وہ پڑھائی کے معاملے میں جنونی ہو گئی ہے۔ اس عرصے میں اس کے لیے بہت سے رشتے بھی آئے لیکن اس نے دادو سے صاف کہہ دیا کہ ابھی وہ صرف پڑھنا چاہتی ہے۔ دادو بے چاری خاموش ہو گئیں۔ اُدھر میراب کی شادی کی اطلاع بھی ملی نہ جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی مالا تکیے میں منہ دیے بے آواز سسک پڑی۔ لگتا تھا اتنے عرصے کے بعد آج بھی وہ دشمنِ جاں دل کے کسی کونے میں دھرنا دیے بیٹھا تھا۔

کچھ عرصے بعد میراب کے آنے کی خبر ملی'. وہ پاکستان آنے والا تھا۔ کمپنی کے کسی کام کے سلسلے میں رہنا تو اسے ہوٹل میں تھا' البتہ صدیقہ بیگم سے ملنے وہ آ گیا اور۔۔۔اور۔۔۔ آج مالا کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ یہ وہ۔۔۔ وہ مالا تو نہ تھی۔ جسے وہ کچھ سال پہلے ریجکٹ کر کے گیا تھا۔ اُس مالا اور اِس مالا میں

زمین آسمان کا فرق تھا اور میراب ایک ہفتے بعد لوٹ گیا۔ وہ نانو کے لیے اور مالا کے لیے کپڑے لایا تھا۔

کچھ عرصہ گزرا، پھر ایک دن میراب کا فون آیا، وہ بہت رو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا کہ انیلہ اور احمد دونوں ہی ایک حادثے میں فوت ہو گئے ہیں۔ اِدھر نانو بھی بلک پڑیں یوں دونوں بچوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایسے میں مالا نے بہت ہمت اور صبر سے دادو کو سنبھالا۔

"بیٹا میراب۔۔۔ اب تو پاکستان آجا اپنی بیوی کو لے کر وہاں رہ کر اور پریشان ہو گا۔" نانو کی بات پر اس نے کہا۔

"ہاں نانو، میں خود بھی آنا چاہ رہا تھا لیکن، لیکن نانو میں نے وہاں پر فلیٹ خرید لیا ہے اور میں وہاں رہوں گا۔" اس کی بات پر نانو سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔

میراب آگیا اس کے ساتھ ڈیڑھ دو سال کی پیاری سی بیٹی بھی تھی۔

"ہائے میرے بچے۔" نانو اس سے لپٹ کر دھواں دھار رونے لگیں نواسے کو دیکھتے ہی بیٹی داماد کی یاد آگئی تھی۔ اس طرح روتا دیکھ کر ننھی منی بچی گھبرا کر رونے لگی، مالا نے آگے بڑھ کر بچی کو گود میں لے لیا۔ بچے تو ویسے بھی اس کی کمزوری تھے۔ بچی فوراً چپ ہو گئی۔

"میراب بیٹا تیری بیوی؟" کچھ دیر بعد سنبھل کر نانو نے میراب سے پوچھا۔

"نانو۔۔۔ میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔" میراب نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"کیا۔۔۔؟" نانو نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "مگر کیوں بچے؟" نانو کی بات پر مالا نے چونک کر میراب کے دکھی چہرے پر نظر ڈالی۔

"بس نانو شاید وہ اس قابل نہ تھی، وہ ایک بدتمیز اور ماڈرن لڑکی تھی۔ اسے گھر بار یا بچے سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس نے خود ہی طلاق مانگی اور ننھی روما کو بھی چھوڑ کر چلی گئی۔" میراب کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔ کتنا بکھرا ہوا اور نڈھال سا لگ رہا تھا وہ پے در پے حادثات نے گویا اسے توڑ کر رکھ دیا تھا حالات اور پھر ننھی بچی کا ساتھ، وہ پریشان تھا۔

ہر چند راہ میں تھے کانٹے بچھے ہوئے
جس کو تیری طلب تھی گزرتا چلا گیا

☆ ☆

آگ اور اوس کہاں ساتھ دیا کرتے ہیں
آج غم خوار کے ملنے سے میں گھبراتا ہوں

انتخاب (عبداللہ)

مالا سے اب نظریں ملاتے بھی اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔

صدیقہ بیگم کے لاکھ کہنے پر بھی میراب کبھی یہاں پر رکتا نہیں تھا۔ آتا کچھ گھنٹے بعد چلا جاتا اس طرح عرصے میں مالا روما کے ساتھ کھیلتی رہی میراب اور صدیقہ بیگم باتیں کرتے رہتے۔ میراب نے پاکستان میں ایک فلیٹ خرید لیا تھا اور ایک گورنس رکھ لی تھی۔

اس روز بھی میراب آیا ہوا تھا۔ میراب اور دادو کمرے میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ مالا کچن میں مصروف تھی۔

"میراب بچے! تو کب تک اس طرح رہے گا' گھر میں بچی ہے سو مشکلات ہوتی ہیں' کم از کم تو کوئی ڈھنگ کی لڑکی دیکھ کر نکاح کر لے' گو کہ تُو نے مالا کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے' لیکن میرا دل کرتا ہے کہ مالا سے بات کر کے مالا اور تیرا۔۔۔"

"خدا کے لیے نانو۔۔۔! اب ایسا مت کریں' میرے ہاتھوں اتنی تذلیل کے بعد میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا اور نانو پھر۔۔۔ جس لڑکی کو میں نے بری طرح دھتکارا۔ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں نانو' اس وقت میں خود غرضی کی انتہاہ پر تھا اور آج میں' اپنی مجبوری اور ضرورت کی بھینٹ اسے چڑھادوں' نانو کوئی بھی لڑکی اتنی تضحیک کے بعد مجھ جیسے شخص کی شکل نہ دیکھے' وہ تو پھر بھی مجھ سے بات کر لیتی ہے۔

ناجانے کیسے ہوتے ہیں لوگ
جو اپنا بنا کر چھوڑ جاتے ہیں
ہم یہ سوچیں تو ڈر جاتے ہیں
ناجانے کیسے ہوتے ہیں لوگ
یہ بچھڑ کر جانے والے
دل جو ٹوٹا سو ٹوٹا
آنکھیں ہیں بنجر ہیں
بکھری ہیں زلفیں
اب نہ پکارے گے ہم مڑ مڑ کر
لوگ رستے میں چھوڑ جاتے ہیں
اسلیئے تھامتے نہیں ہاتھ کسی کا
رسمی سا رابطہ ہے سب سے

آگے بڑھتے نہیں لوگ
رستے میں ہی ٹھہر جاتے ہیں
خالی ہے دامن سو شکاتیں کیسی
اسک آنکھوں میں تو بھر جاتے ہیں
اور چھوڑ جاتے ہیں لوگ
موسم سی فطرت رکھنے والے
شام ہوتے ہیں بدل جاتے ہیں
اب نہ دیکھو میری بنجر آنکھیں
چڑھتے دریا تو اتر جاتے ہیں
شام ہوتی ہی لوگ گھر کو لوٹ جاتے ہیں
ناجانے کیسے ہوتے ہیں لوگ

از قلم شازیہ کریم

اب مجھ سے رشتہ جوڑے ناممکن ہے نانو اور یہ بات میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں۔"میراب کے لہجے میں دکھ' شرمندگی اور ندامت تھی۔

"لیکن میراب۔۔۔! آپ کا یہ دعویٰ غلط بھی ہو سکتا ہے۔" مالا کی آواز پر دادو کے ساتھ ساتھ میراب نے بھی چونک کر دروازے میں کھڑی مالا کو دیکھا۔

"ہاں میراب' میں نے بہت سوچا ہے۔ مجھے روما آج اس مقام پر نظر آتی ہے جس پر کل میں تھی' میراب میں جانتی ہوں بن ماں کی بیٹی کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ میں بہت چھوٹی تھی جب ماں کا انتقال ہوا۔ ابا نے اکیلے مجھے کس طرح سنبھالا' مجھے کوئی سمجھانے' بتانے اور سکھانے والا نہ تھا۔ جو ملا پہن لیا' جیسا ملا کھالیا نہ صحیح غلط کا پتا تھا نہ ہی اچھے برے کا' پھر مجھے تو دادو نے سنبھال لیا لیکن روما کو کون سنبھالے گا۔ مجھے ایسے بچوں کی نفسیات سمجھ میں آ گئی ہے۔ میں نے بہت کڑا وقت گزارا ہے۔ خود کو بنانے میں' بہت دقّت اور دشواریاں دیکھی ہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ میں۔۔۔ میں روما کو دوسری مالا نہیں بننے دوں گی۔ میں۔۔۔ میں روما کے لیے سب کچھ بھولنے کے لیے تیار ہوں۔ "

"مالا! تم۔۔۔ تم بہت عظیم ہو مجھے۔۔۔ مجھے معاف کر دو مالا۔" میراب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے' جب کہ دادو فرطِ مسرت سے مالا کو دیکھ رہی تھیں۔

مالا کے لہجے میں اعتماد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی اعتماد نے اسے حوصلہ بخشا تھا۔

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے آج' میرے بچوں کی روحوں کو قرار مل گیا ہو گا۔۔ اِدھر آؤ میرے بچوں۔" صدیقہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔ میراب اور مالا ان کے پاس گئے تو انہوں نے دونوں کو سینے سے لگا کر آنسو بہا ڈالے۔

حدیث دل سناتے ہیں تو روتے ہیں
تمھیں جب ہم مناتے ہیں تو روتے ہیں
جھلستے پیڑ پر جب آشیانہ ہو
پرندے گھر بچاتے ہیں تو روتے ہیں
ہمیں خود سے زیادہ ہے یقین تم پر
مگر جب آزماتے ہیں تو روتے ہیں
سجالیں بے نیازی لاکھ چہرے پر
عداوت وہ دکھاتے ہیں تو روتے ہیں
غزل اک شوخ سی کہہ دیتے ہیں اکثر
مگر جب گنگناتے ہیں تو روتے ہیں

نائمہ غزل

میں۔۔۔میں شکرانے کے نفل پڑھنے جا رہی ہوں۔" کچھ لمحے بعد وہ اٹھ کر نماز پڑھنے چل دیں۔

"بہت شکریہ مالا' آج۔۔۔ آج تم نے مجھے اپنا مقروض بنالیا ہے۔" میراب نے مالا کے قریب آکر پیار سے اس کے ہاتھ تھام کر جذب سے کہا۔

"نہیں میراب' یہ مت سمجھنا کہ یہ فیصلہ میں نے ترس کھا کر کیا ہے۔ بلکہ مجھے تورو ما کا مستقبل عزیز ہے اور۔۔۔!" وہ کچھ لمحے کے لیے رکی، حیا اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

"اور۔۔۔اور کیا مالا۔۔۔؟" میراب کا لہجہ بے تاب تھا۔

"اور۔۔۔اور شاید میرے دل میں اس دشمنِ جاں کے لیے آج بھی سوفٹ کارنر تھا۔" خوب صورت اعتراف پر میراب کے دل میں اُترتی چلی گئی۔ میراب نے آگے بڑھ کر مالا کو سینے سے لگالیا اور میراب کے فراخ سینے سے لگ کر مدتوں سے مچلتے دل کو ڈھیروں سکون مل گیا۔

چاندرات تھی اور تیری یاد تھی
عید بھی گزر گئی تنہائی ساتھ تھی

از قلم:۔ عائشہ انصاری

اب لوٹ بھی آؤ
مجھے اب نیند کی تلاش ہے
جاناں کہ اب لوٹ بھی آؤ
کہ راتوں کو اب جاگا نہیں جاتا
اب بن تمہارے رہا نہیں جاتا
مجھے نہیں معلوم وہ میری تقدیر میں ہے یا نہیں
مگر خدا سے اسے مانگنا اچھا لگتا ہے
پتہ نہیں مجھے یہ حق ہے یا نہیں
اس کی خوشیوں کی دعا کرنا
اسکی فکر کرنا
اچھا لگتا ہے
مجھے نہیں معلوم
اسے پیار کرنا سہی ہے یا نہیں
پر اس احساس میں جینا اچھا لگتا ہے
مجھے یہ بھی نہیں معلوم
کبھی ہم ساتھ ہونگے یا نہیں
پر یہ خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے
پتہ نہیں وہ میرا ہے یا نہیں
پر اسے اپنا کہنا اچھا لگتا ہے اسے پکارنا اچھا لگتا ہے
کہ اب لوٹ بھی آؤ
جاناں
کہ راتوں کو اب جاگا نہیں جاتا
اب بن تمہارے رہا نہیں جاتا

از قلم شازیہ کریم

بہت زیادہ سوچ وبچار کے بعد آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ محض اپنے والدین کی خواہش کی خاطر جاب ضرور کرے گی مگر اس سلسلے میں وہ کسی کی مدد نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ اپنا مقام خود بنانا چاہتی تھی۔ کسی دوسرے کی سفارش پر کی گئی نوکری سے بہتر ہے انسان محنت مزدوری کر لے۔ کسی کا احسان لینے سے تو بہتر ہے۔ اس نے جاب کرنے کا ذہن ضرور بنالیا تھا مگر وہ اب بھی اسلام کے اسلاف پر قائم تھی۔ وہ کوئی ایسی جاب نہیں کرنا چاہتی تھی کہ جو اس کی ذات کے منافی ہو۔ جس جاب کو کرنے سے اس کا ضمیر اسے ملامت کرے۔ اگرچہ اس کے پاس قانون کی ڈگری تھی اور باآسانی عدالت میں ایک وکیل کی حیثیت سے اپنے فرائض کو سرانجام دے سکتی تھی۔ لیکن وہ وکیل بن کر اپنی آواز کو نامحرم کے کانوں تک نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ وکیل کا کام دوسرے کو اپنے دلائل سے متفق کرنا ہوتا ہے اور اس کے لئے اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی آواز کو بادلوں کی سی گرج دینی پڑتی ہے تو کبھی شہد کی سی مٹھاس سے دوسروں کی چاپلوسی کرنا پڑتی ہے مگر وہ ان میں سے کسی کے بھی حق میں نہ تھی۔ اس کے نزدیک اپنی عزت وناموس سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ حجاب صرف چہرے کا ہی نہیں ہوتا، حجاب تو جسم کے ایک ایک عضو کا ہوتا ہے۔ آنکھوں کا بھی پردہ ہوتا ہے۔ آنکھوں کا پردہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی نامحرم کو نہ دیکھا جائے۔ کانوں کا بھی پردہ ہوتا ہے۔ کانوں کا پردہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے کسی نامحرم کی آواز نہ سنی جائے، ہاتھوں کا بھی پردہ ہوتا ہے۔ ہاتھوں کا

پردہ یہ ہے کہ یہ کسی نامحرم کے جسم سے مس نہ ہو، پاؤں کا بھی پردہ ہوتا ہے۔ پاؤں کا پردہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی نامحرم کی طرف چل کر نہ جائیں۔ ذہن کا بھی پردہ ہوتا ہے۔ ذہن کا پردہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی نامحرم کا خیال نہ آئے اور دل کا پردہ تو سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ دل کا پردہ یہ ہے کہ اس میں نامحرموں کو دیکھنے کا ذوق پروان نہ چڑھے۔ اکثر لڑکیوں کو اپنی سہیلی کا دولہا دیکھنے کی بڑی چاہ ہوتی ہے، پہلے پہل تو کن انکھیوں سے دیکھا جاتا تھا اور پھر رفتہ رفتہ سب کے سامنے اس کے چہروں کو دیکھا جانے لگا اور پھر اس کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بنائی جانے لگیں۔ یہ بے حیائی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔؟ نامحرموں کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے سے دل میں صرف نفاق ہی جنم لیتا ہے اور پھر یہی نفاق آگے بڑھ کر سیاہی کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب بڑے سے بڑا گناہ بھی معمولی لگتا ہے اور اگر وہ اس حد کو بھی پار کر جائے تو گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آج تک کبھی اس نے ایسے فنکشن میں شرکت نہیں کی جہاں مرد اور عورت کا اخلاط ہو۔ اور وکیل میں تو ایسا بہت کم ممکن ہے۔ وہاں تو اکثر مردوں کے ساتھ ہی کام کرنا پڑتا ہے اور اگر نہ بھی کیا جائے تو جج کے سامنے بھری عدالت میں چیخ چیخ کر اپنی آواز کو نامحرموں تک پہنچایا جاتا ہے۔

صبح کو جلدی اٹھ کر اس نے سیاہ عبایا پہنا اور پھر چادر سے اپنے سر کو ڈھانپ کر گھر سے نکل پڑی۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ اس لئے بنا کسی کو کچھ کہے وہ گیٹ کو بند کر کے باہر آئی۔ باہر کی دنیا اسے بہت عجیب لگی۔ آج کافی عرصہ بعد اس نے گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔ انسان جہاں کافی عرصہ بعد جائے تو اسے کچھ نہ کچھ عجیب ضرور لگتا ہے۔ چاہے وہ جگہ اس کی من پسند ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ تو اس جگہ کو پسند بھی نہیں کرتی تھی پھر بھلا وہ کیسے اس جگہ کو پسند کر سکتی تھی۔ صبح کے وقت ہر طرف چہل قدمی تھی۔ مائیں اپنے بچوں کا ہاتھ پکڑ کر سکول چھوڑنے جا رہی تھیں، باپ اپنے بچوں کو بائیک پر بٹھا رہا تھا۔ سکول کے دروازے پر بھی بچوں کا رش تھا۔ وہ نظریں جھکائے بس آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سب کو صرف اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ لیکن لوگوں کے اس ہجوم میں بھی اس کا وجود نمایاں تھا۔ سر تا پا سیاہ حجاب تھا۔ ہاتھوں میں سیاہ دستانے، پاؤں میں سیاہ جرابیں، صرف اس کی آنکھیں تو جو دیکھی جا سکتی تھیں۔ یہ پھر ہلکا ہلکا سا گندمی رنگ تھا جو آنکھوں کے ارد گرد تھا۔ سب کی نگاہیں اس پر اٹھ تو ضرور رہی تھیں مگر ناکام لوٹ جاتی۔ وہ دوسری لڑکیوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے آپ کو نمائش کے لئے نہیں پیش کیا تھا۔ ایک بار جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا دوسری

اٹھانے کی جرات نہ کرتا۔ کوئی بھی اس کے وجود کی تابناکی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک غائبانہ طاقت سب کو اپنی نظریں جھکانے پر مجبور کر رہی تھی۔ لیکن وہ چلتی جا رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر۔ جب کوئی آدمی سامنے سے آتا تو خود بخود فٹ پاتھ سے اتر جاتا اور اسے راستہ دیتا۔ پیچھے سے آنے والے بھی اسی طرح کرتے، فٹ پاتھ سے اتر کر آگے چلے جاتے۔ کسی نے اسے میلی آنکھ سے نہ دیکھا۔ جب انسان کے اندر کوئی میل نہیں ہوتا تو حالات بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ دنیا کی ہر شے اس کے تابع ہوتی ہے لیکن جب انسان کے دل میں میل ہو تو اس کا ضمیر خود اس کو ملامت کرتا ہے۔ وہ خود اپنے پاؤں سے چل کر گناہ کی طرف جاتا ہے اور پھر چلتا ہی جاتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں نہ ہی کوئی کھوٹ تھا اور نہ ہی کوئی میل۔ وہ آدھ گھنٹے میں اپنی منزل پر تھی۔ کل شام وہ لان میں ٹہل رہی تھی تو کوئی ایک پمفلٹ دروازے کے نیچے سے پھینک کر چلا گیا۔ وہ کسی برائٹ انڈسٹری کا اشتہار تھا۔ جنہیں اپنی نئی برانچ کے لئے سٹاف کی ضرورت تھی۔ پوسٹ بھی اچھی تھی اور سب سے بڑی بات وہ پوسٹ صرف خواتین کے لئے خاص تھی۔ انٹرویو کا ٹائم آٹھ بجے تھا۔ اس لئے اس نے صبح اٹھتے ہی وہاں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ناشتہ بھی ہلکا پھلکا کیا۔ بس وہ جتنی جلدی ہو سکے وہاں پہنچ جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ جتنی دیر سے وہاں پہنچتی، اتنی دیر ہی اسے انتظار کرنا پڑتا۔ وہ مضبوط قدموں کے ساتھ بلند و بالا عمارت میں داخل ہوئی۔ اس کی نظریں صرف بلڈنگ کے باہر ایک بار اوپر اٹھی تھیں وہ بھی نام دیکھنے کے لئے۔ اندر آئی تو وہ ٹائل میں اپنا عکس دیکھ سکتی تھی۔ اسے ایسا لگا کوئی نیچے ٹائیل میں سے اس کا چہرہ دیکھ لے گا۔ اس نے اپنی چادر کو کس لیا۔ اور ریسپشن کی طرف بڑھی۔ وہاں ایک بیس بائیس سالہ لڑکی، کھلے بالوں کے ساتھ فون پر کسی کے ساتھ ہنستے ہوئے بات کر رہی تھی۔ چہرے پر سرخ لپ سٹک، آنکھوں کا کاجل کسی کا بھی دل مائل کرنے کے لئے کافی تھا۔ ''انسان گناہ کی طرف ابھرتا نہیں ہے بلکہ ابھارا جاتا ہے۔'' اس کے دل نے کہا تھا، مگر وہ یہاں کسی کو ملامت کرنے نہیں آئی تھی۔

''السلام علیکم!'' وجیہہ کے سلام کرنے پر اس نے ایک حیرت سے بھری نگاہ اس کے وجود پر ڈالی۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے، جیسے اس نے کوئی لفظ بولنے کے لئے کھولے ہوں مگر اس کا وجود دیکھ کر بول نہ پائی ہو۔ اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا اور استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا
''وعلیکم السلام۔۔ جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔۔'' اس کا لہجہ بہت شیریں تھا، جو کسی بھی نامحرم کو اس کی طرف کھینچ سکتا تھا

''میں وجیہہ عظمت ہوں اور جاب کے سلسلے میں آئی ہوں۔'' یہ سن کر وہ لڑکی سکتے میں آگئی جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا ہو، وہ یک ٹک اس کے عبایا کو دیکھ رہی تھی، اور پھر اس پر لپٹی ہوئی چادر کو۔

''سس سی۔ وی۔'' اس کے لب لڑکھڑائے

''جی؟؟'' وجیہہ اس کا مطلب سمجھ نہ سکی

''میرا مطلب ہے آپ مجھے اپنی سی وی دے دیں، میڈم آتی ہیں تو میں ان کو دے دیتی ہوں'' اس لڑکی نے اپنا ہاتھ سی وی پکڑنے کے لئے آگے بڑھایا تو کوئی کپڑا حائل نہ تھا۔ اس نے ہاف سلیو قمیض پہنی ہوئی تھی۔ دودھیا بازو دوپٹے سے بھی عاری تھی۔ دیکھنے والے کے دل میں خود بخود چھونے کی حرص پیدا ہو سکتی تھی۔

''آپ اتنے وہاں بیٹھ کر انتظار کر سکتی ہیں۔'' اس نے مسکراہٹ کے ساتھ سامنے صوفے پر اشارہ کیا، مسکراہٹ بھی دلنشین تھی۔ وجیہہ وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ بلڈنگ میں صرف خواتین تھیں، کوئی مرد نظر نہیں آیا۔ اس کے ساتھ دوسری خواتین بھی انٹرویو کے لئے آئی تھیں۔ کچھ بہت ینگ تھیں تو کچھ ذرا اولڈ مگر ان سب میں اس کا وجود نمایاں تھا۔ وہ اب پہلے کی طرح نیچے نگاہ نہیں کئے ہوئے تھی بلکہ نگاہیں اٹھا کر بلڈنگ کا جائزہ لے رہی تھی۔ پوری بلڈنگ شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ کیبن بھی گلاس کے تھے۔ کام کرنے والے تمام اپنے کولیگز کو دیکھ سکتے تھے۔ سامنے ایک کیبن تھا۔ وہاں ایک چالیس سالہ عورت پیپر پر کچھ لکھ رہی تھی مگر اپنا کام کرتے ہوئے وجیہہ کی طرف دیکھنا بھی وہ اپنے کام کا حصہ سمجھ رہی تھی۔ ریسیپشن پر موجود لڑکی نے وجیہہ کی سی۔ وی کو بغور پڑھا اور پھر یک ٹک بس اسے ہی دیکھتی رہی۔ تقریباً آدھا گھنٹا انتظار کے بعد وہ لڑکی انٹرویو کے لئے آئیں خواتین کے پاس آئی۔

''سوری! میڈم تو آج کسی وجہ سے نہیں آسکتیں مگر انہوں نے انٹرویو کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا ہے، وہ صرف پانچ منٹ میں یہاں آتے ہی ہونگے۔ آپ کچھ دیر انتظار کیجیے۔۔'' یہ کہہ کر وہ تو چلی گئی مگر وجیہہ کے چہرے کے رنگ متغیر ہو گئے۔ یہاں آنے کے بعد جب اس نے دیکھا کہ کوئی مرد نہیں ہے تو اس نے اپنا نقاب اتار دیا تھا۔ لیکن کسی نامحرم کے آنے کی خبر کا سن کر اس نے ایک بار پھر نقاب کر لیا۔ ریسپشن پر موجود لڑکی نے دوبارہ اس کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ وجیہہ کی آنکھوں میں موجود بے چینی پڑھ سکتی تھی۔

''انٹرویو ایک مرد لے گا۔۔ ایک نامحرم۔۔ ایک بند کیبن میں۔۔ وہ اور میں۔۔۔ اور۔۔ تیسرا شیطان۔۔'' وہ یہی سوچتے ہوئے ریسیپشن پر گئی اور اپنی سی وی واپس طلب کی

''مگر کیوں؟'' اس نے حیرت سے استفسار کیا

''آپ کے پمفلٹ پر لکھا تھا کہ عورت انٹرویو لے گی لیکن

اب آپ نے اچانک جو خبر دی تو بس اس لئے۔۔ سوری میں کسی مرد کے ساتھ اکیلے بند کیبن میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی وقت نہیں گزار سکتی۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا

"لیکن آپ نے یہاں کے کیبن تو دیکھ ہی لئے ہیں۔ باہر سے سب کچھ نظر آتا ہے۔۔" شائد وہ جانتی تھی، اسی لئے وجیہہ کی بات مکمل ہوتے ہی جواب دیا

"ٹھیک ہے یہاں تقریباً تمام کیبن گلاس کے ہیں اور اندر کیا کچھ ہو رہا ہے سب نظر آتا ہے لیکن ہے تو ایک بند کمرہ ہی، اندر کیا بول رہے ہیں وہ تو سنائی نہیں دیتا ناں۔۔ آپ برائے مہربانی مجھے میری سی وی دے دیں۔۔"

"اگر یہی وجہ ہے تو آپ کو جانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں آپ کے ساتھ سر کے کیبن میں آجاؤں گی۔" وہ لڑکی بس یہ چاہ رہی تھی کہ وجیہہ یہاں سے انٹرویو دیئے بغیر نہ جائے۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ خود حسن پرست تھی مگر وجیہہ کی سادگی اس کے دل میں اتر چکی تھی۔ اس لڑکی کے اصرار پر وجیہہ مان گئی اور اپنی جگہ پر دوبارہ آکر بیٹھی ہی تھی کہ مردانہ کھنکار اس کے کانوں میں گونجی۔ اس نے اپنے آپ کو مزید سمیٹ لیا۔ وہ شخص بڑے ٹھاٹ کے ساتھ دائیں طرف موجود گلاس کے کیبن میں چلا گیا اور پھر انٹرویو شروع کرنے کے لئے ریسپشن پر کال کی۔ وہ لڑکی آگے بڑھ کر آئی اور وجیہہ کے ساتھ بیٹھی لڑکی کو اندر کیبن میں بھیجا۔ وہ آدھ گھنٹے تک اپنی باری کا انتظار کرتی رہی۔ پھر وہ وجیہہ کو لینے آئی تو وجیہہ نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کے پیچھے پیچھے چل دی

"کیا میں آسکتی ہوں؟؟"

"جی آیئے۔۔" وہ سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس تھا۔ اپنے کام میں مگن تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اس کے پیچھے پیچھے وہ لڑکی بھی اندر آگئی۔ اور بہانے سے ایک فائل ڈھونڈنے لگی

"جی آپ کا نام؟" اس نے ابھی تک نگاہ اوپر نہیں اٹھائی تھی۔ اس نے اپنا نام بتانے کی بجائے اپنی سی وی آگے ٹیبل پر رکھ دی۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور سی وی کو پڑھنے لگا مگر اس لڑکی کے قدموں کی آواز بار بار مخل ہو رہی تھی۔

"تم یہاں کیا کہہ رہی ہو؟ باہر جاؤ۔۔" اس نے قدرے غصے میں کہا تو وہ سہم گئی

"جی میں فائل ڈھونڈ رہی ہوں۔۔۔"

"بعد میں تلاش کرنا۔۔۔ جاؤ اب یہاں سے۔۔" وہ بنا کچھ کہے وہاں سے چلی گئی۔

"بہت خوب۔۔۔" اس نے ابھی تک وجیہہ پر نگاہ نہیں دوڑائی تھی۔

"ویلڈن وجیہہ۔۔۔" لیکن جیسے ہی اس نے وجیہہ پر نگاہ دوڑائی تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ اس کے نفی میں ہلتی

گردن کے عکس کو شفاف شیشے میں سے دیکھ سکتی

تھی۔ ریسپشن پر موجود لڑکی کی نگاہیں ابھی بھی اندر ہی

مرکوز تھیں

"لیکن ابھی تو آپ نے کہا۔۔۔"

"سوری مگر ہم آپ کو یہ جاب نہیں دے سکتے۔۔۔" وہ ابھی

بھی اپنی بات پر قائم تھا

"لیکن۔۔۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ سننا چاہتی ہیں تو سنیں۔۔" اس نے اپنی

نگاہیں وجیہہ سے ہٹا کر ٹیبل پر مرکوز کر لیں

"آپ نے جس پوسٹ کے لئے اپلائے کیا ہے، وہ ایک جنرل

پوسٹ ہے۔ اور اس پوسٹ پر جو بھی کام کرے گا اس کا

لوگوں کے ساتھ انٹریکشن بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور

میرا انہیں خیال یہ جاب آپ کے لئے مناسب ہے۔ ہمیں

ایک بریو گرل چاہئے، اس جیسی۔۔" اس نے باہر ریسپشن

والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا

"نا کہ سات پردوں میں چھپی ہوئی۔۔ آگے آپ سمجھ گئی

ہونگی کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔۔" وہ بنا کچھ کہے باہر آگئی۔

اور دروزے کے طرف بڑھنے لگی

"آئی ایم سوری۔۔۔ میں آپ کے ساتھ اندر نہ رہ سکی۔۔"

یہ اسی لڑکی کی آواز تھی

"لیکن میں آپ کو ایک بات کہوں گی کہ ایک لڑکی کو اپنی

عزت اپنے ظاہر سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔" وہ یہ کہنے پلٹی

تھی اور پھر بنا کچھ کہے وہاں سے چلی گئی۔ وہ ایک ثانیے کے

لئے اسی جگہ پر کھڑی رہی اور اس کے جاتے وجود کو تراشتی

رہی۔

صرف اس کے عبایا کو یہاں ہی نشانہ نہیں بنایا گیا بلکہ وہ جہاں

بھی گئی یہ الفاظ اس کا پیچھا کرتے رہے مگر اتنا کچھ سننے کے بعد

بھی اس کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ ایک آس اب بھی

باقی تھی۔ جو کہ خدا کی رحمت تھی۔ جب بھی اس کے قدم

ڈگمگانے لگتے تو دادی کے یہ الفاظ اس کی ڈھارس باندھتے۔

"منزل ہمیشہ دو راستوں پر چل کر ملتی ہے۔ ایک راستہ

پھولوں کی سیج سے بنا ہوتا ہے اور دوسرا کانٹوں کی سیج

سے۔ پھولوں کی سیج پر چل کر تو ہر کوئی منزل کو پالیتا

ہے۔ لیکن منزل کی اصل قدر و قیمت وہی جانتا ہے جس نے

کانٹوں پر چل کر چاہ کو حاصل کیا ہو۔۔"

یہی سوچ اس کو آگے بڑھنے کے لئے ہمت فراہم کرتی۔ وہ

آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے وہ کئی دفاتر میں گئی

مگر کہیں سے مثبت جواب نہ ملا۔ ایک جگہ سے تو وہ الفاظ اس

کو سننے میں ملے جو اس نے اپنے خیال میں بھی گمان نہیں کئے

تھے۔

"آپ جیسی لڑکی سوچ بھی کیسے سکتی ہے جاب کرنے کا؟ بلکہ

مجھے تو حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ آج کے دور میں بھی

آپ جیسی کم ظرف لڑکیاں ہیں جو ابھی بھی پرانی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔۔"

"مسٹر! اگر آپ کو یہ جاب نہیں دینی تو نہ دیں لیکن کم سے کم میرے اس حجاب کو برا مت کہیں اور آپ کے علم کے لئے یہ بات عرض کرتی چلوں کہ مذہب آج بھی زندہ ہے اور جب تک یہ مذہب زندہ رہے گا تب تک ہم جیسی لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں گی جو اپنی عزت وناموس کو چند پیسے کے عوض کبھی داؤ پر نہیں لگائیں گی۔۔"

یہ جواب سن کر اس کے ہوش ہی اڑ گئے اور مزید کچھ نہ بول سکا مگر منزل اب بھی دور رہی۔ تقریباً ہر آفس میں وہ جا چکی تھی جو اس کے علم میں تھے۔ سائے بھی اب لمبے ہونے لگ گئے۔ ظہر کی نماز بھی اس نے ایک آفس میں ادا کی۔ اب وہ گھر کی طرف جانے لگی تھی۔ آنکھوں میں قدرے نمی تھی مگر حوصلے اب بھی مردہ نہیں ہوئے تھے۔ واپسی پر اس کی نظر ایک کالج کے گیٹ پر لگے بینر پر پڑی۔ ادھر بھی ایک ٹیچر کی ضرورت تھی۔ اس نے آج کے لئے آخری بار قسمت آزمائی کرنا چاہی۔ وہ مضبوط قدموں کے ساتھ دو سٹیپ چڑھی جو اسے کالج کے اندر لے گئے۔

"السلام علیکم! آپ نے باہر بینر لگایا تھا۔۔" کالج میں داخل ہوئی تو سامنے ایک لڑکی سر پر دوپٹہ لئے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے پڑی ٹیبل کے نیچے انگلش میں ریسیپشن لکھا ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! مجھے افسوس ہے مگر آپ نے دیر کر دی، ابھی کچھ دیر پہلے ہی میڈم نے کسی کو جاب دے دی ہے۔" یہ سنتے ہی وہ بنا کچھ کہے باہر جانے لگی۔ شائد آج کے دن میں اس کے لئے کہیں جاب نہیں لکھی تھی۔ وہ دروازے کی طرف آئی تو پیچھے ایک آواز نے اس کو پلٹنے پر مجبور کر دیا

"رکو۔۔! میرے کمرے میں بھیجو اسے۔۔" وہ پلٹی تو ایک عورت کا عکس نظر آیا جو اپنے کیبن میں جا چکی تھی۔ ریسپشن پر موجود لڑکی نے اسے کمرے کی طرف جانے کو کہا

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟"

"جی۔۔ آیئے۔۔ بیٹھیے۔۔" اسے یہاں ایک عجیب سا سکون ملا

"السلام علیکم! یہ میری سی وی ہے۔۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی سی وی اس خاتون کی طرف بڑھائی

"وعلیکم السلام۔۔" ایک سرسری نگاہ سی وی پر دوڑائی پھر فائل کو واپس کر دیا

"آپ دو دن بعد کالج آسکتی ہیں۔" یہ سن کر اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ دن بھر کی تھکان اس ایک جملے نے دور کر دی۔

"مگر آپ نے تو اچھی طرح میری سی وی دیکھی ہی نہیں۔۔ صرف سرسری طور پر جائزہ لیا ہے۔"

"وہ تو سب فارمیلیٹی ہوتی ہے۔۔" انہوں نے مسکراتے

ہوئے اسکے چہرے کی طرف دیکھا تھا

"لیکن آپ نے تو وہ فارمیلیٹی بھی پوری نہیں کی اور پھر مجھے تو باہر کہا گیا تھا کہ یہ پوسٹ تو پہلے ہی کسی اور کو آفر کر دی گئی ہے۔۔"

"بہت خوب۔۔۔ گہرائی میں جاتی ہو۔۔ نائیس۔۔" انہوں نے اس کی تعریف کی

"شکریہ۔ لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔۔"

"جواب بھی مل جائے گا لیکن اس وقت یہ جاننا ہی کافی ہے کہ آپ کو یہ جاب آفر کر دی گئی ہے، آپ اس طرح کیجیے گا کہ جاتے وقت اپنا نام، موبائل نمبر اور ایڈریس ریسیپشن پر دے دیجئے گا، کل تک آپ کو اپائنمنٹ لیٹر اِشو کر دیا جائے گا۔۔" وہ ٹیبل سے کچھ کاغذات کو اکٹھا کر رہی تھیں۔

"مگر۔۔۔"

"دیکھیے۔۔۔ بعض اوقات انسان کی شخصیت سب کچھ بتا دیتی ہے۔ اور پھر اب تو ویسے بھی آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ عصر ہونے والی ہے اور پھر عصر کے بعد تو سورج ڈھلتے دیر بھی نہیں لگتی۔۔" ان کے چہرے پر ہلکی سی تبسم تھی۔

"اچھا! اب میں چلتی ہوں۔۔ آپ یاد سے اپنا نمبر دے کر جانا۔۔" اس سے پہلے کے وجیہہ کرسی سے اٹھتی، وہ برق رفتاری سے کیبن سے باہر چلی گئیں۔ وجیہہ کے ذہن میں کئی سوال غوطہ کھانے گے۔ وہ گھر تو پہنچ گئی مگر کئی سوال اس کے ذہن میں غوطہ کھا رہے تھے۔

"کہاں تھی تم سارا دن؟" وہ کھوئی کھوئی ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ پرس کو اتار کر صوفے کے سامنے ٹیبل پر رکھا تو علی عظمت نے فوراً سوال داغا

"چلو۔۔ جہاں بھی گئی ہو لیکن اس بات کا تو شکر ادا کر لو پہلے کہ گھر سے تو نکلی۔ ورنہ سارا دن گھر میں ہی رہتی تھی میری بیٹی۔۔ تم بیٹھو۔۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" رضیہ بیگم نے ایک کپ چائے کا علی عظمت کو دیا اور پھر کچن میں چلی گئیں، وجیہہ ادھر ہی صوفے پر دھڑام سے بیٹھی تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک محاذ سے ہو کر آئی ہو۔

"آج تو مرغی بھی اپنے کھڈے سے باہر نکل گئی۔" ہینڈ فری کانوں میں لگائے وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ وجیہہ نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا تو اس نے گردن کو جھٹکے کے ساتھ دوسری طرف کیا۔

"بس تمہاری ہی کمی تھی۔۔۔" علی عظمت نے انمول کے طنز کا جواب بھی طنزیہ دیا۔ لیکن انمول نے کچھ نہ سنا بس سیڑھیاں اتر کو وجیہہ کے ساتھ بیٹھ گیا، اس کا سارا دھیان سمارٹ فون پر گانا سیلکٹ کرنے میں تھا۔

"یہ لو چائے۔۔" ایک کپ وجیہہ کے سامنے رکھا اور دوسرا وجیہہ کے ہاتھ میں تھمایا

"میں جاب ڈھونڈنے گئی تھی۔۔" یہ سن کر سب کو ایک

جھٹکا لگا۔ رضیہ بیگم کو تو ایسا شاک لگا کہ وہ جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ وہ دونوں کپ پہلے ہی سرو کر چکی تھیں، اس لئے گرنے سے بچ گئے۔ ورنہ وہ ضرور بے موت مارے جاتے۔ علی عظمت کے گلے میں بھی چائے کا ایک گھونٹ اٹک گیا۔ انمول نے بھی پتا نہیں کیسے اس کے یہ الفاظ سن لئے۔ اس نے ہینڈ فری نکال کر یقین کرنا چاہا

"کیا؟؟ تم سچ کہہ رہی ہو۔۔" علی عظمت نے دوبارہ استفسار کیا

"جی ابو۔۔ جاب بھی مل گئی اور کل تک اپائنمنٹ لیٹر بھی اِشو ہو جائے گا۔۔" انہیں ابھی بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ انمول بھی منہ کھولے وجیہہ کے چہر کو دیکھتا جارہا تھا۔

"مبارک ہو۔۔" رضیہ بیگم نے خوشی میں اسے گلے لگا لیا۔ لیکن دماغ اب بھی ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وجیہہ جاب کی تلاش میں گھر سے باہر نکلی تھی

"بڑی بات ہے۔۔" انمول نے طنزیہ شانے اچکائے تھے

"بیٹا۔۔ کہاں ملی جاب؟" علی عظمت نے پوچھا

"ایک پرائیویٹ کالج ہے۔۔ براق گروپس آف کالجز کی مین برانچ میں۔۔" دھیمے لہجے میں بتایا تو انمول کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی

"کیا کہا تم نے؟ براق گروپس آف کالجز۔۔؟؟ وہ تو اتنا فینس کالج ہے ادھر؟؟" انمول کو تو جیسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے ایک بار پھر اثبات میں گردن ہلائی

"لیکن بیٹا۔۔۔ تمہاری کوالیفیکیشن تو زیادہ ہے ناں۔۔ ایز کمپیئیر ٹو دِس جاب۔۔۔؟" علی عظمت نے استفسار کیا

"علی عظمت۔۔ اس بات کو چھوڑو۔۔ جاب جہاں بھی ملی ہو۔۔ میرے لئے تو یہی بات خوشی کی ہے کہ یہ جاب کے لئے تیار ہو گئی۔۔ اب گھر سے باہر نکلے گی تو جانے گی کہ باہر کی دنیا کیسی ہے؟ اور شائد باہر جانے سے ہی اس کی یہ کالی چادریں بھی اتر جائیں۔۔" رضیہ بیگم لاڈ کرتے نہیں تھک رہی تھی مگر شائد وہ خود تھک چکی تھی۔ اسی لئے اپنے کمرے میں چلی گئی

☆ ☆ ☆

دھیمے قدموں کے ساتھ ضرغام گھر میں داخل ہوا۔ دروازے کو آہستہ سے بند کیا اور پھر خراماں خراماں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

"لگتا ہے امی سو گئیں۔۔" اس نے سوچا اور ایک سکھ کا سانس لیا۔ کچن میں جا کر اس نے ایک گلاس پانی پیا اور پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس نے لائیٹ آن کی تو شگفتہ بی بی کرسی پر بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی

"مل گیا وقت گھر آنے کا؟ وقت دیکھا ہے تم نے؟" اس کو دیکھتے ہی وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے بھی اپنا منہ بگاڑ لیا۔ اور جو احتیاط وہ پہلے برت رہا تھا۔ شگفتہ کو سامنے دیکھ کر بے باک ہو گیا

"امی۔۔۔ آپ ابھی تک نہیں سوئیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ۔۔۔" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی

"سو گئیں ہو نگی۔۔۔ یہی کہنا چاہتے تھے ناں تم۔۔۔ بیٹا ماں اس وقت تک نہیں سوتی جب تک اس کے بچے گھر لوٹ نہ آئیں۔ اگر ایک ماں کو ساری رات بھی جاگنا پڑے ناں اپنے بیٹے کے انتظار میں تو وہ یہ بھی کر گزرتی ہے۔۔"

"تو آپ کو کون کہتا ہے امی کہ آپ میرا انتظار کریں۔۔۔ آپ سو جایا کریں۔۔" اس نے کندھے سے پکڑ کر ان کا غصہ کم کرنا چاہا

"تو تم جلدی آجایا کرو۔۔ ناں اتنی دیر کیا کرو۔۔" انہوں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے

"دیر؟؟؟؟؟ امی ابھی تو صرف بارہ بجے ہیں۔۔" اس نے ایسے کہا جیسے صرف شام کے چھے بجے ہوں

"بارہ کو تم ابھی کہہ رہے ہو۔ بیٹا یہ شریف لوگوں کے لئے آدھی رات ہوتی ہے۔" انہوں نے لفظ ابھی پر زور دیتے ہوئے کہا

"آدھی رات ہے تو پھر یہی صحیح۔۔ لیکن میرے لئے تو یہ صرف شام ہے۔۔" اس نے بے نیازی سے اپنی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا

"بیٹا! نہ رہا کرو، رات گئے تک یوں دوستوں کے ساتھ۔۔ جلدی لوٹ آیا کرو۔۔" وہ بٹن کھول چکا تھا۔ اس نے شرٹ اتار کر بیڈ پر پھینکی

"بیٹا! رات گئے تک گھر سے باہر رہنا اچھی بات نہیں ہوتی۔" انہوں نے پیار سے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو اسے غصہ آ گیا

"امی پلز۔۔۔ میں تھک چکا ہوں آپ کی نصیحتیں سن سن کر ۔۔ اب نہیں سنی جاتی مجھ سے آپ کی نصیحتیں۔۔" وہ زوردار لات کرسی پر مار کر واش روم میں گھس گیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ بند کیا

"آج تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہیں مگر ایک وقت آئے گا جب تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی۔۔"

"جب وہ وقت آئے گا۔۔ تب کی تب دیکھی جائے گی۔۔" اس نے واش روم کے اندر سے ہی جواب دیا

"سنبھل جاؤ بیٹا۔۔۔ سنبھل جاؤ۔۔" وہ اب نائیٹ سوٹ پہن کر باہر آ چکا تھا۔ وائیٹ کرتا پاجامہ اس کی شخصیت کو بھا رہا تھا۔ پیشانی پر ہلکی ہلکی جنبش کرتے بالوں میں وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔

"اگر آپ کی باتیں پوری ہو گئی ہوں تو کیا میں اب سو سکتا

ہوں۔۔؟"اس نے ہاتھ جوڑ کی منتوں بھرے لہجے میں استفسار کیا تو شگفتہ اس کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر باہر چلی گئیں۔ان کے جانے کے بعد اس نے دروازہ لاک کر دیا۔ اور ایک لمبا سانس لیا۔

☆ ☆ ☆

علی عظمت ڈائننگ ٹیبل پر اخبار پڑھ رہے تھے۔رضیہ بیگم کچن سے ناشتہ لا کر ان کے سامنے رکھ رہی تھی۔انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا اور دوبارہ کچن میں چلی گئیں۔انہوں نے اخبار کی تہہ لگا کر کچن میں دیکھا پھر ادھر ٹی وی لاؤنج کی طرف نگاہ دوڑائی۔پھر تہہ لگا اخبار ٹیبل پر ایک طرف رکھا

"یہ وجیہہ نظر نہیں آرہی؟ کہاں ہے؟"رضیہ بیگم چائے کے کپ ٹیبل پر رکھ رہی تھیں

"وہ تو صبح ہی کالج چلی گئی۔۔"پلیٹ میں قورمہ ڈال کر علی عظمت کی طرف بڑھایا

"اوہ۔۔میں تو بھول ہی گیا تھا۔۔"انہوں نے مسکراتے ہوئے روٹی کا نوالہ بنایا

"اس نے بتایا بھی تھا سب کو۔۔ویسے کافی خوش دیکھائی دے رہی تھی آج وہ۔۔"خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگیں

"خوش کیوں ناں ہو۔۔آخر اس کی ماں بھی تو خوش ہے۔۔" چہرے پر ہلکی سی تبسم تھی

"یہ تو آپ نے سچ کہا کہ میں بہت خوش ہوں۔آخر وہ اکیسویں صدی کی لڑکی ہے۔اسے کچھ تو معلوم ہونا چاہئے آج کے طور طریقے۔۔"

"ٹھیک۔۔۔لیکن یہ آپ کا لاڈلہ بیٹا کہاں ہے؟"انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر استفسار کیا

"وہ تو ابھی تک سو رہا ہے۔۔۔"انہوں نے بے نیازی سے جواب دیا تھا

"نواب ذادے۔۔ابھی تک سو رہے ہیں۔۔"انہوں نے طنز کیا

"ارے!اس میں طنز کرنے کی کیا بات ہے؟آخر رات کو ایک بجے تو سویا تھا۔اب نیند بھی تو پوری کرنی ہے۔"علی عظمت نے جواباً گردن ہلائی۔کچھ دیر خاموشی دونوں کے درمیان رہی

"ویسے ایک کام کریں گے آپ؟"اچانک انہیں کچھ یاد آیا تھا۔

"حکم کریں بیگم۔۔"انہوں نے چائے کا کپ ہاتھ میں تھاما اور ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"آپ جلدی سے وجیہہ کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈ لیں۔"وہ ان کی بات پر شش و پنج کا شکار ہو گئے تھے

"رشتہ؟"استفہامیہ انداز میں اُن کی طرف دیکھا

"جی رشتہ۔۔۔ابھی تو وہ جاب کر رہی ہے۔ لیکن اس کا کچھ پتا نہیں۔۔ آپ تو جانتے ہیں اس کی عادات کو۔۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کہیں وہ جاب ہی نہ چھوڑ دے۔ اس سے پہلے کہ وہ جاب چھوڑے، اس کے رشتے کا بندوبست کریں۔۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔۔۔" وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ایک سوچ میں ڈوب گئے

"تو پھر کب سے تلاش کر رہے ہیں؟" انہوں نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کر ان کی طرف دیکھا تھا

"کیا تلاش کرنا ہے؟" وہ اپنے خیالوں میں اس قدر محو تھے کہ کچھ پل کے لئے سب کچھ بھول گئے تھے

"ارے۔۔وجیہہ کے لئے رشتہ" انہوں نے جھلاتے ہوئے کہا تھا

"اوہ۔۔۔لیکن بیگم صاحبہ یہ کام ہم مردوں کا نہیں بلکہ آپ عورتوں کا ہے۔۔"

"آپ تو بس کام سے جی ہی چرانا۔۔۔" انہوں نے جھلاتے ہوئے برتنوں کو سمیٹنا شروع کیا

"اسے کام چوری نہیں سمجھداری کہتے ہیں۔" انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا

"دیکھ لی آپ کی سمجھ داری۔۔۔اب تو مجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔۔" وہ پاؤں پٹختی ہوئی کچن میں چلی گئیں

اِک آرزوِ ناتمام

!!!اِک آرزوِناتمام۔۔۔۔۔۔۔۔

تیرا ساتھ پانے کی

تیرا حسن چھونے کی مگر

اس کے لیے میں

تیرے پاس رہنا چاہتا ہوں

تجھے محسوس کرنا چاہتا ہوں

تیری آرزوؤں کے دیپ جلنے سے پہلے

تیری آنکھوں میں

جلنا چاہتا ہوں

تیرے پھول سے ہونٹ جو ابھی

سرگوشیاں کرنا نہیں سیکھے

ان پہ قابض ہونا چاہتا ہوں

تیرے گلاب چہرے کو دیکھنے کے لیے

گھنٹوں؛ ناکافی ہیں

تجھے دیکھتے دیکھتے

اک عمر ہونا چاہتا ہوں

تیرے ہونٹ تیری آنکھیں، تیرا بدن

اور یہ خوبصورت چہرہ غزل ہوں میری

سعدی اسے مدتوں گنگنانا چاہتا ہوں

(زاہد سعدی) قصور

☆ ☆ ☆

کافی شاپ میں عنایہ بیٹھی ضرغام کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی نظر بار بار کافی شاپ کے دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں ۔وہاں ایک خاموشی تھی۔ جو بار بار اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ٹائٹ جینز پر ٹائیٹ شرٹ میں کھلی زلفیں دوسرے مردوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی تبسم بھی اس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ ٹیبل پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے کچھ کھرچ رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں باریک سی واچ میں گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔

''میڈم! کچھ چاہئے آپ کو۔۔''بلیو یونیفورم میں ایک ویٹر نے اس کے پاس آکر پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور دوبارہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا

''ہیلو۔۔۔! عنایہ ڈارلنگ۔۔''کسی نے اپنے ٹھنڈے رخسار کو اس کے رخسار سے مس کیا تھا۔ وہ بری طرح چونک گئی تھی

''تت تم؟''اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے دیکھا تھا، وہ ہنستا چہرہ لئے اس کے سامنے آبیٹھا۔ ہاف سلیو شرٹ میں وہ بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔

''جسٹ شیٹ اپ۔۔۔ ٹائم دیکھا ہے تم نے؟ میں پچھلے ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''اس نے رسٹ واچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنوعی غصے میں کہا تھا۔ وہ اس کی بات پر مسکرا کر رہ گیا۔ جیسے اسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی ایک جادو تھا۔ جس نے عنایہ کو خاموش کروا دیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ جو رومانوی انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھاما اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے ڈالا

''مائے ڈارلنگ۔۔۔ اتنا غصہ صحت کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔۔۔ چِل کرو۔''وہ اپنا ہاتھ جھٹکے سے اپنی طرف کرنا چاہتی تھی مگر اس کی پر کشش آنکھوں نے اسے اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ لہراتی زلفیں۔ پنک کلر کی ٹائٹ شرٹ سے عیاں ہوتے اس کے جسم کے خدوخال ضرغام کو اپنی آنکھیں ہٹانے ہی نہیں دے رہے تھے

''اب اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟''اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے آنکھوں کے سامنے آتی بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑیستے ہوئے استفسار کیا

''تمہیں دیکھ رہا ہوں۔۔ ڈارلنگ۔۔''اس کے الفاظ میں انتہا کی مٹھاس تھی

''اب بس کرو۔۔۔''اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگی

''واہ بھئی۔۔۔ تمہارے سامنے اتنا خوبصورت نوجوان بیٹھا ہے اور تم ادھر ادھر دیکھ رہی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔۔'' اس نے اپنے ہاتھوں کو ٹیبل پر ایک انداز سے رکھے ہوئے تھے۔ چہرے پر مصنوعی غصہ عیاں تھا

''میں ویٹر کو ڈھونڈ رہی ہوں۔۔۔ اب کچھ کھانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' اس نے وضاحت پیش کی

''تو ایسا بولنا تھا ناں۔۔'' وہ اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائے بیٹھا اس کی لہراتی زلفوں کو دیکھتا رہا۔ وہ واقعی ایک حسین لڑکی تھی۔ چاند سا چمکتا چہرہ۔ جھیل سی آنکھیں۔ شرابی ہونٹ۔ مسکراتے ہوئے چہرے کے دونوں جانب پڑنے والے ڈمپل۔

''اب کھاؤ بھی۔۔'' وہ اس کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ ویٹر کب ان کے سامنے بریڈ جیم اور جوس رکھ کر چلا گیا اسے بھنک تک نہیں ہوئی

''اوہ۔۔اچھا۔۔'' وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بریڈ کھلانے لگا۔ خود تو وہ گھر سے ناشتہ کر کے آیا تھا لیکن عنایہ کا دل رکھنے کے لئے اسے کچھ نہ کچھ کھانا ضرور پڑا

''ویسے تمہیں معلوم ہے۔ تمہاری ریکارڈنگ سب کو پسند آئی۔ اور تمہارے لئے ایک نیوز بھی ہے میرے پاس۔۔''

جوس کا ایک گھونٹ بھر کر اس نے کہا تھا

''نیوز۔۔؟ تم کیا نیوز چینل پر کام کرنے لگ گئی جو بریکنگ نیوز سنانے لگی ہو۔۔'' اس نے ایک چٹکلہ چھوڑا

''ویری فنی۔۔۔'' اس نے منہ بگاڑ کر کہا

''اچھا اب سناؤ بھی۔۔'' جوس کا گلاس ٹیبل پر رکھا اور پھر اس کی طرف دیکھا

''جس شو کے بارے میں تمہیں سیلکٹ کیا گیا تھا، اس کا نام تبدیل کر دیا گیا ہے۔''

''کیا؟؟'' اس کے چہرے پر ناگواری نے جنم لیا

''اتنا حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، صرف نام ہی چینج ہوا ہے ہوسٹ چینج نہیں ہوا۔ اس کو ہوسٹ تم ہی کرو گے۔۔'' یہ سن کر اسے کچھ حوصلہ ملا

''اچھا۔۔'' اس نے اپنے آپ کو سنبھالا

''ویسے اس شو کا نیا نام پوچھو گے نہیں؟''

''ہاں۔۔بتاؤ۔۔'' اس نے بے نیازی سے پوچھا تھا۔ دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں

''لازوال۔۔'' اس نے مسکرا کر بتایا

''وٹ۔۔لازوال۔۔'' اس کے خزاں رسیدہ چہرے پر بہار آگئی۔ وہ ہمیشہ سے اپنے شو کا یہی نام رکھنا چاہتا تھا لیکن پروڈیسر نے یہ نام رکھنے سے انکار کر دیا اور ''ہماری باتیں'' سیلکٹ کیا۔ اسے یہ نام بالکل پسند نہ آیا لیکن یہ فرسٹ چانس تھا۔ اس لئے وہ زیادہ احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ بس اس نے عنایہ سے سفارش کرنے کو کہا۔ لیکن ایک ڈر تھا جو اس کے

ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ پروڈیوسر نے اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے اپنی من مانی کی تو وہ اسے شو سے نکال دیں گے۔ اس لئے وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ عنایہ کے نام بدلنے کی بات سن کر اسے ایک جھٹکا لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے انہوں نے نام کے ساتھ ساتھ کہیں ہوسٹ بھی تو تبدیل کرنے کا نہیں سوچ لیا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

"یہ نام انہوں نے تمہاری ریکارڈنگ سن کر کیا تھا۔ اور تم جانتے ہو وہ ریکارڈنگ آج ٹیلی کاسٹ ہو رہی ہے۔"

"واؤ۔۔۔ اس کا مطلب کہ آج تمہارا شو دیکھنا پڑے گا۔۔" اس نے پرجوش انداز میں کہا تھا۔ عنایہ پرائیویٹ نیوز چینل میں ایک ٹاک شو کی ہوسٹ تھی۔ وہ پچھلے تین سال سے وہ ٹاک شو رن کر رہی تھی۔ پبلک میں بھی اس کے شو کو کافی سراہا جا رہا تھا۔ اسے لئے وہ شو بنا کسی بریک کے چلتا رہا، ضرغام کو بھی اس نے ہی انٹرڈیوس کروایا۔ اور اپنے ہی شو میں اس کے ساتھ ایک ریکارڈنگ کی مگر نیو ہونے کے باعث پروڈیوسر نے پہلے صرف خود دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور بعد میں آن ائیر۔ اتنے میں اس نے ایک دوسرے انٹرٹیمنمنٹ چینل پر ضرغام کے لئے ایک میوزک شو کی بات کی۔ اپنی شہرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کئی دوسرے پروڈیوسرز سے بھی سفارش کروا کے ضرغام کو اس شو کا ہوسٹ بنا دیا۔ لیکن بعد میں پروڈیوسر اور ضرغام کا اکثر نام

کے سلسلے میں جھگڑا رہتا۔ اس شو کے پروڈیوسر شہزاد صاحب تھے۔ انہیں ہمیشہ ہی ایک ڈر رہتا تھا کہ کہیں ضرغام نیا ہونے کے باعث ان کے شو کو فلاپ نہ کر دے لیکن جب عنایہ نے انہیں اس کی ریکارڈنگ سنائی تو وہ کافی امپریس ہوئے اور جو ڈر ان کے دل میں کھٹک رہا تھا، اسے نکال باہر پھینکا۔ اور ساتھ ساتھ نام بھی تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا

"ویسے تمہارے لئے ایک اور نیوز ہے۔" اس نے ایک انداز سے کہا تھا

"ایک اور نیوز۔۔۔ مائی گاڈ۔۔" اس نے پیشانی پر آتے بالوں کو بائیں ہاتھ سے پیچھے کیا تھا

"لازوال اس سنڈے سے سٹارٹ ہو رہا ہے۔۔"

"وٹ۔۔۔ اس سنڈے سے۔۔۔ یعنی صرف دو دن بعد؟" وہ واقعی شاک ہوا تھا۔ شہزاد صاحب نے اسے ایک ماہ کے بعد کا کہا تھا لیکن اچانک یہ بات سن کر اسے شاک لگا۔ وہ خوشی میں صحیح طریقے سے ہنس بھی نہیں پا رہا تھا۔

"عنایہ۔۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں۔۔۔" وہ خوشی میں ادھر ادھر دیکھ کر لفظ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا

"بس بس۔۔۔ اپنے آپ کو کنٹرول کرو۔۔" وہ اس کی خوشی کو سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھا تو ایک احساس اس کے جسم میں سرایت کر گیا۔ اور ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

چاند کی مدھم روشنی اس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے کھڑکی کا پردہ جھوم رہا تھا۔ کمرے میں تمام لائٹیں آف تھیں۔ صرف چاند کی روشنی ہی وہاں ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔ اس خاموشی میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر قدموں کی آواز نے کمرے کی خاموشی کو ختم کر دیا۔

اندھیرے میں اس کا چہرہ مبہم تھا۔ اس نے دو قدم ڈریسنگ کی طرف بڑھائے اور پھر ایک بٹن دبایا تو پورا کمرہ روشن ہو گیا۔ اس کا چہرہ واضح ہو گیا۔ وہ انمول تھا۔ وارڈروب سے نائیٹ سوٹ نکالا اور پھر واش روم میں جا کر چینج کیا۔ کمرے میں واپس آنے پر اس نے اپنے موبائل کو بجتا ہوا پایا۔ موبائل بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے دو قدم بڑھا کر موبائل اٹھایا۔

"عندلیب۔۔۔ کا اس وقت فون؟" وہ کافی حیران تھا۔ ابھی بھی وہ اس کے پاس سے ہی آیا تھا

"ہاں عندلیب۔۔۔ اس وقت فون کیا خیریت تو ہے۔۔" ایک پل کے لئے خاموشی کمرے میں راج کرتی رہی۔ وہ چلتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔ سفید پردہ اس کے چہرے کو چھونے لگا۔ ہواؤں نے بھی اس کے چہرے کو بوسہ دیا

"لیکن۔۔ اتنی جلدی تمہیں کیا ہو گیا۔۔ کل صبح سکون سے بات کریں گے۔۔" ماتھے پر ایک دو شکن ابھر آئے تھے

"دیکھو۔۔ ابھی وقت نہیں ہے یہ بات کرنے کا۔۔ جب وقت آئے گا میں خود ان کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔۔ تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔۔" وہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے ابھار بتا رہے تھے کہ فون کرنے والے کو اس کی باتوں کا یقین نہیں ہے۔

"تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟ اپنے انمول پر۔۔" اس کے چہرے پر ایک طمانیت تھی۔ وہ یک ٹک لان میں کھلتے گلابوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو رات کے اندھیرے میں بھی اپنی رعنائیاں بکھیر رہے تھے۔

"میری بات سنو۔۔۔ سنو تو۔۔۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ سننے کو تیار نہیں تھی

"میری فرسٹ اینڈ لاسٹ چوائس صرف اور صرف تم ہو۔۔ اور تمہارے علاوہ میری زندگی میں نہ تو پہلے کوئی تھا اور نہ ہی بعد میں کوئی آئے گا۔ تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ کوئی تمہیں مجھ سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ کوئی کا مطلب ہے کوئی نہیں۔۔ حالات بھی نہیں۔۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی تبسم ابھری تھی۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے سامنے والے کو یقین آ گیا ہو۔ پھول بھی ہوا کے جھونکے سے لہرانے لگے۔ جیسے انہیں بھی اس کے دل کی بات سن گئی ہو اور جھوم کر اس کی خوشی میں شریک ہو رہے ہوں

''بہت جلد۔۔۔اوکے۔۔اچھا اب فون بند کرتا کل بات کریں گے۔آئی لو یو ٹو مائے سویٹ ہارٹ۔۔۔''اس نے موبائل کو کِس کیا تو ایک مسکراہٹ تھی جو اسکے چہرے سے چھلک رہی تھی۔وہ کمرے میں اکیلا ہوتے ہوئے بھی اکیلا نہیں تھا، کوئی ہمزاد کی طرح اس کے دل کے پاس تھا۔وہ محسوس کر سکتا تھا۔اس نے اپنا چہرہ چاند کی طرف کیا تو اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر چاند بھی شرما گیا اور بادلوں کے پیچھے جا چھپا۔اس نے ہلکی سی گردن کو جنبش دی اور بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

''اچھا پھر۔۔میں بعد میں بات کرتا ہوں۔۔''یہ کہہ کہ انہوں نے فون کو کریڈل پر رکھا۔

''کس سے بات کر رہے تھے؟''رضیہ بیگم نے بیڈ روم میں داخل ہوتے پوچھا تھا اور آکر ان کے پس بیٹھ گئی

''اپنی گرل فرینڈ سے۔۔''انہوں نے ایک پھلجڑی چھوڑی

''شرم کرو کچھ۔۔۔دو جوان بچوں کے باپ ہو تم۔۔۔''وہ ان کا مذاق سمجھ گئی تھیں

''شرم کی کیا بات ہے رضیہ بیگم۔۔دل تو ہمارا ابھی ہے۔۔''ان کے کانوں میں سرگوشی کی

''اب پیچھے ہٹیں۔۔۔بچوں نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔۔''انہوں اپنے ہاتھوں سے پیچھے دھکیلا

''کیا کہیں گے۔۔کچھ بھی تو نہیں۔۔۔اور ویسے بھی اس وقت کون ہوتا ہے گھر میں۔۔''

''بہت شریر ہو گئے ہیں آپ۔۔''وہ شرماتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی اور صوفے پر جا بیٹھیں

''آپ کے ساتھ رہ رہ کر۔۔''انہوں نے سارا الزام رضیہ بیگم پر ڈال دیا

''کیا مطلب ہے آپ کا کہ میں شریر ہوں۔۔؟''انہوں نے خفگی سے پوچھا

''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔۔''مسکراہٹ ان کے چہرے پر واضح تھی۔

''چلو۔۔چھوڑیں ان باتوں کو۔۔آپ یہ بتائیں کہ آپ نے ساجد کے بارے میں کی سوچا؟''انہوں نے انہاک سے علی عظمت کے چہرے کو دیکھا

''میں نے کیا سوچنا ہے۔تم وجیہہ سے بات کرو۔آخر زندگی اس نے گزارنی ہے تو بہتر یہی ہو گا کہ فیصلہ بھی وہ کرے۔۔''انہیں اچانک کچھ یاد آیا، وہ فوراً اٹھے اور وارڈ روب کی طرف بڑھنے لگے

''کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہو لیکن وہ یہ فیصلہ کیسے کر سکے گی؟ آپ تو جانتے ہو اس کی نیچر کو جو ہم فیصلہ کریں گے دیکھ لینا وہی اس کا بھی فیصلہ ہو گا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔۔''انہوں نے بے نیازی سے جواب

دیا۔ وہ وارڈروب میں مسلسل کوئی چیز ڈھنڈ رہے تھے

"تو پھر میں بس اب جلدی سے وجیہہ سے بات کرتی ہوں اور پھر جلدی سے منگنی کی تیاری شروع کر دیتی ہوں۔۔ ٹھیک ہے ناں۔۔" انہوں نے خود ہی پلان بنالیا

"ہاں۔۔" وہ ابھی بھی فائل ڈھونڈ رہے تھے

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟ مجھے بتایئے۔۔ میں ڈھونڈ دیتی ہوں۔۔"

"ریڈ کلر کی ایک فائل ڈھونڈ رہا ہوں۔۔ یاد نہیں آ رہا کہاں رکھی تھی"

آپ کی یادداشت لگتا کچھ زیادہ ہی کمزور ہو گئی ہے۔ بھول گئے آپ کل آپ نے ہی تو آفس بھیجی تھی۔۔" یہ سن کر وہ ہنس پڑے

"اوہ۔۔۔ میں تو واقعی بھول گیا تھا۔۔۔ لگتا ہے بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں۔۔" سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے

☆ ☆ ☆

وجیہہ پرنسپل آفس کے باہر کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے اسے اپنے کیبن میں بلایا تھا۔ ابھی اسے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا یہاں پڑھاتے ہوئے، اور آج تک کوئی غلطی کا موقع نہیں دیا۔ مگر ایک ڈر تھا جو دل میں کھٹک رہا تھا

"تم ابھی تک یہاں کھڑی ہو۔۔۔ میڈم کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔۔!!" ایک لڑکی پرنسپل آفس سے باہر نکلی اور اس سے مخاطب ہوئی

"جی میں۔۔ جا رہی ہوں۔۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے چلی گئی۔

"میڈم آپ نے بلایا۔۔" دروازہ کھولتے ہی اس نے پوچھا

"جی آیئے۔۔ بیٹھیے وجیہہ۔" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا

"السلام علیکم۔۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سلام کیا

"وعلیکم السلام۔۔ میں نے آپ کو اس لئے بلایا تھا کہ آپ سے کچھ پوچھ سکوں۔۔" انہوں نے اپنا کام چھوڑ کر اس پر دھیان دیا

"جی پوچھیے میڈم۔۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا

"آپ کو ایک ہفتہ ہو گیا ہے یہاں پڑھاتے ہوئے۔۔ آپ کو کیسا لگا ہمارا کالج؟ کوئی مسئلہ وغیرہ تو نہیں ہوتا۔۔"

"نہیں میڈم۔۔ مسئلے والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ بلکہ میں تو بہت خوش ہوں۔ میں تو یہی سوچتی تھی کہ باہر کے ماحول میں میں کبھی ایڈجسٹ ہو بھی پاؤں گی یا نہیں۔ لیکن یہاں کے ماحول میں مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہاں آ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے گھر میں آ گئی ہوں۔ بالکل گھر جیسا ماحول فراہم کرتی ہیں آپ اپنے سٹاف کو۔" اس کا لہجہ عاجزانہ تھا

"وجیہہ ایسا ماحول فراہم کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ ہمارا فرض

ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام ورکرز اپنا کام پوری ایمان دار اور دیانتداری سے کریں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم انہیں وہ ماحول بھی فراہم کریں" انہوں نے وضاحت کی تھی

"جی بے شک۔۔" اس نے سر ہلا دیا۔ باتیں چلتی رہی۔ وہ ان کے ساتھ دوستانہ ماحول قائم کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ وہ آدھ گھنٹے تک ان سے باتیں کرتی رہی۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے وجیہہ سے یہ بات دریافت کر لی کہ اس کا ابھی تک کوئی رشتہ نہیں ہوا اور کیوں نہیں ہوا یہ بھی ان کو بتا دیا

"وجیہہ میں اگر آپ سے کچھ مانگوں تو کیا آپ دیں گی؟" یہ کہتے ہوئے ان کے الفاظ پہلے سے الگ تھے۔ وہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے جھجک محسوس کر رہی تھیں

"جی۔۔ کیوں نہیں۔۔ آپ اتنی اچھی ہیں کہ آپ کو تو ناں کرنے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"بات وہ نہیں ہے۔۔ جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ میری بات سن کر شائد آپ کو برا لگے۔ اسی لئے میں آپ سے قبل از وقت ہی معافی مانگتی ہوں۔" وہ اپنی کرسی کھڑی ہوئیں

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ آپ مانگ کر تو دیکھیں اگر میرے بس میں ہوا تو میں ضرور دوں گی۔" لیکن ایک ڈر تھا جو اس کے چہرے سے چھلکنے لگا تھا

"بات یہ ہے کہ میں تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔۔" انہوں نے دیوار کی جانب اپنا چہرہ کئے یہ بات کہی تھی۔ یہ سن کر وہ برجستہ کھڑی ہو گئی۔ اور یک ٹک ان کی پشت کو دیکھنے لگی۔ آج پہلی بار اس نے دیکھا تھا کہ ان کے بال سکارف سے نیچے کمر تک ہیں۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" اس نے بنا ہچکچائے جملہ مکمل کیا

"دیکھو وجیہہ۔۔۔ میں نے تم سے پہلے ہی معافی مانگی تھی۔۔ لیکن یقین مانو جب سے تمہیں دیکھا ہے تب سے تمہیں بہو بنانے کی آرزو اس دل میں جنم لے رہی تھی۔ لیکن میں تم سے زور زبردستی کر کے ہاں نہیں کروانا چاہتی۔ میرے لئے تمہاری اجازت معنی رکھتی ہے۔ لیکن اگر تم ناں بھی کر دو تو مجھے برا نہیں لگے لگا۔ تم اسی طرح یہاں پڑھاتی رہو گی۔۔" وہ یہ کہنے پلٹی تھیں۔ وجیہہ ان کے چہرے کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے آج ان کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر بھی ایمان کا نور تھا۔

"میں نے تم سے پہلے بات اس لئے کی کیونکہ تمہارے گھر والوں سے زیادہ تمہاری ہاں زیادہ اہمیت رکھتی ہے اگر تم ہاں کرو گی تب ہی میں تمہارے گھر والوں سے بات کروں گی۔۔" انہوں نے ایک پل توقف کے بعد کہا

"ٹھیک ہے۔۔ لیکن مجھے کچھ وقت چاہئے۔۔"

"تمہیں جتنا وقت چاہئے۔۔ تم لے لو۔۔۔ یہ تمہارا حق ہے

مگر میری باتوں کو دل سے سوچنا۔" وہ بنا کچھ کہے وہاں سے چلی گئی اور وہ دوبارا اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"زندگی کی کیا ہے؟ زندگی ایک نام ہے، ایک احساس ہے، ایک جنون ہے، ایک خواہش ہے، کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں زندگی ملتی ہے۔ زندگی کی ہر چاہ ملتی ہے، خوشیاں ملتی ہیں، خوشیوں بھری زندگی ملتی ہے لیکن میرے دوستوں یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں مل جاتا، اس کے لئے ایک لگن چاہئے، خود اعتمادی چاہئے۔ ایسی خود اعتمادی جس کے ذریعے وہ طوفانوں کا رخ موڑ سکے۔ اپنی طرف بڑھنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کر سکے۔۔۔۔ یہی آج کا ہمارا ٹوپک ہے۔ آپ ہمیں لائیو ٹیکسٹ کر سکتے ہیں۔ ہمارے فیس بک پیج پر لائک کر سکتے ہیں۔ اپنا پیغام ہمیں بھیج سکتے ہیں۔۔" ایک سانگ کی ویڈیو پلے کر دی گئی۔ اس نے کیمرے سے ایک طرف ہو کر پانی کا ایک گھونٹ پیا

"واہ۔۔ کافی کونفیڈنٹ سے بول رہے ہو تم؟" شہزاد اس کے پاس آیا

"تھینکس۔۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔

"یہ لو موبائل۔۔۔ ابھی سے میسجز آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ ریڈ کرتے رہو اور شو میں شامل بھی کرتے رہنا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ سٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے گرے کلر کی پینٹ پر سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ گریبان کا پہلا بٹن کھلا تھا۔ آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ایک مسکراہٹ کے ساتھ وہ دوبارہ کیمرے کے سامنے آموجود ہوا

"جی دوستو! لازوال دنیا میں دوبارہ خوش آمدید۔۔ آپ کے میسج آنا شروع ہو گئے ہیں اور میرے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کون سا میسج پہلے پڑھو۔ سب میسج میں ہمارے پروگرام کو اتنا سراہا جارہا ہے جتنی شائد ہم نے امید بھی نہیں کی تھی۔ تو سب سے پہلے ہم ریما کا میسج اپنے پروگرام میں شامل کرتے ہیں۔ ریما لکھتی ہیں

"زندگی دھوپ میں سائے کی مانند ہے۔ جو ہمیشہ سچائی سے دور بھاگتی ہے۔" اس نے اپنا چہرہ کیمرے کی طرف کیا

"یہ کیا ریما آپ تو بہت اداس لگ رہی ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ انسان کو سچائی سے بعض اوقات شدید نفرت ہوتی ہے لیکن نفرت کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ اصل انسان وہی ہے جو سچائی کا جواں مردی سے مقابلہ کرے۔ اس کا سامنا کرے اور پھر اس کو پچھاڑ دے۔ اگر وہ سچائی آپ کے حق میں ہے تو اس کو تو خوش دلی سے قبول کرنا چاہئے لیکن اگر وہ آپ کے مخالف ہے تو اس کو دوسروں کا نصیب بنا دینا چاہئے اور صرف اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مجھے حیرت

ہوتی ہے ان انسانوں پر جو دوسروں کا بھلا سوچتے ہیں اور اپنی ذات کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن دوستو! آج کی دنیا ایسی نہیں ہے۔ جو بھلا کرنے والوں کا ساتھ دے۔ آج کی دنیا نیکی کرنے والوں کو ہی سب سے پہلے دریا میں کی بے رحم موجوں کے سہارے چھوڑ دیتی ہے۔ سب سے پہلے اس کی زندگی کو ہی جہنم بناتی ہے۔ اس لئے دوسروں کی چاہت کو فوقیت اگر دینی ہی ہے تو اپنی ذات کے بعد دیں کیونکہ یہ زندگی آپ کی ہے۔ آپ کے جسم کا آپ پر حق ہے۔ آخر کیوں؟ آپ اپنی خوشیاں دوسروں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں؟ اور خود محرومیوں کے بادلوں میں ابر کرم تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ یہ دنیا مطلبی ہے اور مطلبی لوگ ہی اس دنیا سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر آپ نے انسانیت کا سارا بوجھ اپنے سر لینا ہی ہے تو سب سے پہلے اپنی ذات کے ساتھ انصاف کریں۔ اپنی ذات کو اس کا حق دیں۔ جس خوشی کی وہ ڈیمانڈ کرتا ہے، اسے وہ عطا کریں۔" ایک پل کے لئے خاموشی نے اسے آ گھیرا۔ وہ سکرپٹ کو مکمل طور پر پس پشت ڈال کر اپنے بنائے ڈائیلاگ بولتا جا رہا تھا۔ پہلے پہل تو شہزاد کو غصہ آیا لیکن الفاظ کا تانا بانا اتنا دلنشین تھا کہ وہ خاموش رہا اور اسے کچھ نہ کیا۔ شو کا ٹائم ایک گھنٹہ تھا۔ اور یہ ایک گھنٹہ اسے صرف ایک منٹ لگا۔ پلک جھپکتے ہی شو کا ٹائم ختم ہو گیا۔

"اچھا دوستو اب اجازت چاہتا ہوں۔ زندگی کی سانسوں نے ساتھ دیا، تو اگلے اتوار پھر سے اسی جگہ، اسی وقت، اسی چینل پر ملاقات ہو گی، اسی لازوال دنیا میں، ایک نئے لازوال ٹوپک کے ساتھ۔۔"

شو ختم ہوتے ہی سب نے تالیاں بجا کر اس کو داد دی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شائد اس داد کو دیکھ کر ہواؤں کی سیر کرنے لگ جاتا لیکن اس کے چہرے پر بس ہلکی سی تبسم تھی۔ کیونکہ اس کی منزل تو بہت آگے تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈھلتی دھوپ میں سائے دراز ہوتے جا رہے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کی آوازیں کانوں میں عجیب سارس گھول رہی تھیں۔ انمول عندلیب کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالا چلتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر انمول کے کندھوں پر رکھا ہوا تھا۔ دیکھنے والے انہیں دیکھتے تو دعا دیئے بغیر نہ رہتے۔ دونوں انتہا کے حسین و جمیل تھے۔ دونوں کے چہرے چاند سے زیادہ روشن اور گلاب سے زیادہ سرخ تھے۔ خوبصورتی کی تو جیسے انتہا ہو رہی تھی۔ چلتے ہوئے وہ اس کے گریبان پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ کھچاؤ کے باعث اس کی شرٹ عندلیب کی طرف کھینچی جا رہی تھی۔ گریبان کا پہلا بٹن بھی کھل چکا تھا۔ وہ انمول کے باڈی سپرے کو محسوس کر سکتی تھی۔

"میں بس یہی چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ مجھے یونہی اپنی بانہوں میں سمیٹے رکھو۔ اپنی بانہوں کی خوشبو کو میری سانسوں کے

ذریعے میرے جسم کا حصہ بناتے رہو۔۔" دلفریب اور نشیلی آوازاس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔۔" اس نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تو بالوں کی لٹ اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔

انمول نے اپنے داہنے ہاتھ کی چاروں انگلیوں کو اس کے چہرے پر پھیرتے ہوئے بالوں کی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑیس دیا۔ اس کے ہاتھوں کی حدت کو وہ محسوس کر سکتی تھی۔

"تو پھر بات کیوں نہیں کر لیتے تم اپنے پیرنٹس سے؟" یہ سنتے ہی انمول نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا

"عندلیب میری جان۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔"

"انمول تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ پاپا روزانہ تمہارے بارے میں پوچھتے ہیں، تم سے ایک بار ملنا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو لڑکا میں نے پسند کیا ہے؟ وہ ان کی بیٹی کے لائق ہے بھی یا نہیں۔۔ پلز انمول میری خاطر ایک بار ان سے مل لو۔۔" وہ اس کے ہاتھوں کو تھام کر منتوں بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی

"ٹھیک ہے، عندلیب۔۔ میں تمہارے کہنے پر ان سے مل لیتا ہوں مگر تم جانتی ہو اس کے بعد کیا ہو گا؟" وہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا تھا

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے استفسار کیا

"مطب صاف ہے کہ آج وہ ملنے کی ضد کر رہے ہیں، کل وہ میرے گھر والوں سے ملنے کی ضد کریں گے اور پھر ہماری شادی کی۔۔"

"تو پھر۔۔ اس میں غلط ہی کیا ہے۔۔"

"غلط کچھ نہیں۔۔۔ بس شادی۔۔" اس نے شادی کو دھیمے لہجے میں کہا تھا

"کیا مطلب؟ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟" وہ اس کی بات پر خاصی حیران تھی۔

"یہ تم سے کس نے کہا؟ میں صرف شادی صرف اور صرف تم سے ہی کروں گا۔۔ سنا تم نے۔۔" اس کے چہرے کر اپنے ہاتھوں میں لیا

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم میرے پاپا سے مل رہے ہو کل ہی۔ سنا تم نے۔۔" اپنا چہرہ دوسری رخ کر کے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے

"عندلیب میری جان! سمجھنے کی کوشش کرو۔۔ ابھی صحیح وقت نہیں ہے یہ۔۔۔" اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا

"ابھی صحیح وقت نہیں ہے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" اس نے قدرے جھنجلاتے ہوئے کہا تھا

"دیکھو۔۔۔ مجھ سے بڑی میری بہن ہے۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہو گی تب تک امی ابو میری شادی کے لئے کبھی

نہیں تیار ہونگے۔" اس نے وجہ بتائی

"اگر اُس کی ساری عمر شادی نہ ہوئی تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی کبھی شادی نہیں کر سکیں گے؟"

"خدا نہ کرے ایسا ہو۔۔"

"اگر ایسا ہو گیا تو؟؟" اس کا انداز استفہامیہ تھا

"میں ایسا کبھی ہونے نہیں دونگا۔۔۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اگلے ایک ماہ کے اندر اندر اُس کی شادی ہو کر رہے گی۔۔" کچھ سوچتے ہوئے انمول نے کہا تھا

"مجھے تمہاری بہن کی شادی سے کوئی غرض نہیں۔۔ مجھے غرض ہے تو صرف اپنی شادی سے"

"ایک بار بس اُس کی شادی ہو جائے پھر ہماری شادی میں سیکنڈز بھی نہیں لگیں گے۔۔" اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو سموتے ہوئے کہا تھا

"دیکھتی ہوں۔۔ تم اپنا وعدہ پورا کر پاتے ہو یا نہیں،۔۔۔"

اُس کا لہجہ دھیمہ ہو گیا تھا۔ انمول نے اس کے چہرے کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے دونوں بازو اس کے پشت پر حمائل کئے

"اب اِس وجیہہ کا تو کچھ کرنا پڑے گا۔۔۔" اُس نے دل میں سوچا تھا

☆ ☆ ☆

کینڈل لائٹ ڈنر کے بعد وہ اپنے گھر جا رہے تھے۔ عنایہ ضرغام کے ساتھ ہی اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ یک ٹک بس ضرغام کو دیکھتی ہی جا رہی تھی۔ اپنی داہنی کہنی کو وہ سیٹ کے ساتھ ٹکائے اس کا چہرہ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی چودھویں کے چاند کو دیکھتا ہے۔ ہلکا ہلکا میوزک بھی ماحول کو دلفریب بنا رہا تھا۔ عنایہ کی طرف کا شیشہ نیچے تھا۔ جہاں سے رات کی ہوا کار میں داخل ہو کر اس کو زلفوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" ضرغام نے ڈرائیو کرتے ہوئے عنایہ پر نظر دوڑائی تو اس کی نشیلی نظروں کو اپنے چہرے پر مرکوز پایا

"دیکھ رہی ہوں کہ تمہارے حسن میں نکھار آتا جا رہا ہے۔"

اس کا انداز سنجیدہ تھا مگر ضرغام اپنی ہنسی پر قابو نہ پا سکا

"اب اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے۔۔؟" اسے ایسا لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

"کچھ نہیں۔۔۔" اس نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا تھا

"اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔۔" عنایہ نے اپنا داہنا ہاتھ ضرغام کے کان کی طرف بڑھایا اور اس کے بالوں کو انگلی میں لپیٹنے گی۔ اس کے لمس کی حدت وہ کان پر محسوس کر سکتا تھا

"ہاں۔۔ پوچھو۔۔۔ اس میں برا ماننے والی کیا بات ہے؟" وہ راستے پر نظریں جمائے کار ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ رات کی خاموشی ہر جگہ اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے تھی مگر اس خاموشی میں واحد اس کار کی گونج تھی جو سڑک

کے کنارے درختوں کے پتوں کی نیند میں مخل ہو رہی تھی۔ جہاں سے ان کی کار گزرتی گئی، بے خبری کی نیند سوئے پتوں میں ایک سرسراہٹ پیدا کرتی گئی

"تم اپنی ہر رات کو میرے نام نہیں کر سکتے۔۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ بھڑکیلے انداز میں اپنے دائیں ہاتھ کی انڈیکس فنگر کو اس کے چہرے پر پھیرتے ہوئے پیشانی سے ہونٹوں تک لے گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اپنی فنگر کو اس کے ہونٹوں پر قیام کرنے کا موقع دیا اور پھر ہونٹوں سے اس کی گردن تک کا فاصلہ نہایت سست رفتاری سے طے کیا۔ عنایہ کے اس فعل نے ضرغام کی سانسوں میں ایک جنبش پیدا کر دی۔ اُس کی انگلی اِس کی گردن سے گریبان تک آگئی۔ گریبان کے پہلے دو بٹن کھلے تھے۔ جہاں سے اس کا دودھیا سینہ لشکارے مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کے وہ اپنی انگلی کو گریبان کے راستے سینے پر لاتی۔ ضرغام نے یک دم بریک لگائی۔ برجستہ بریک لگانے پر وہ چونکی تھی

"کیا ہوا بے بی؟ یوں بریک کیوں لگائی؟" وہ اپنی انگلی ضرغام کے جسم سے پیچھے کر چکی تھی

"تمہارا سٹاپ۔۔۔ تمہارا گھر آگیا۔۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا

"اوہ۔۔ آئی سی۔۔" اس نے باہر کی جانب دیکھا تو کار عنایہ کے گھر کے عین سامنے تھی۔ وہ ضرغام میں اتنی مگن تھی

خدا کرے تم یوں ہنستے رہو
غم نہ کبھی تمہارے پاس آئے
از شازیہ کریم

کوئی تو ہو جو ٹوٹے بکھرے خواب سنبھالے میرے
ابھی بھی ہیں جینے کے انداز نرالے میرے
وہ جو میری ذات کا حصہ کہتا تھا خود
اسکو کہوں آ کے سنبھالے خوب میرے
از قلم شازیہ کریم

مانگا جو ساتھ تیرا تو ٹھکرا دیا تو نے
آنکھوں میں اب تیرے نمی ہے تو مجھے کیا
از قلم شازیہ کریم

اگر آپ داستانِ دل کے ریگولر رائیٹر بننا چاہتے ہیں تو جلدی سے اپنی بارہ تحرایر ہمیں بھیجیں اور بن جائیں ہمارے ڈائجسٹ کے ریگولر رائیٹر۔

ہمارا ایڈریس ہے:

ندیم عباس ڈھکو، چک نمبر 5/79 Lڈاکخانہ. L 5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

راستے کی مسافت کا اسے علم ہی نہیں ہوا

''تم بھی چلو میرے ساتھ۔۔۔''کار سے اتر کر اس نے جھک کر کہا تھا

''سوری ڈارلنگ۔۔۔ آج نہیں۔۔ پھر کبھی۔۔'' ایک مصنوعی ہنسی کو وہ چہرے پر لانے کی کوشش کر رہا تھا

''پھر کبھی؟ ہمیشہ تم یہی کہتے ہو۔۔۔ کب آئے گی تمہاری یہ پھر کبھی؟'' وہ اپنی دونوں بازو کار کی کھڑکی پر ٹکائے جھکی ہوئی تھی۔ بنا دوپٹے اور کھلے گریبان سے اس کا ریشمی بلاؤز زرا واضح ہو رہا تھا۔ ضرغام نے اپنی آنکھیں پھیر کر سٹیئرنگ کی طرف کر لیں۔ وہ اگر چہ دنیا کی رنگینیوں میں بہت حد تک کھو چکا تھا۔ ان رعنائیوں کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھتا تھا مگر پھر بھی ایک طاقت تھی جو اسے اپنی حدوں کو پار کرنے سے روکے ہوئے تھی۔ ایک حصار تھ جو اسے جکڑے ہوئے تھا۔ گناہوں کے دلدل میں دھنسے ہونے کے باوجود گناہوں کی سیاہی کو اس سے دور کئے ہوئے تھا۔ ایک باڑ تھی جو اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ عنایہ کو اس کے قریب آنے سے روک رہی تھی۔ وہ باڑ، وہ حصار، وہ طاقت دعا تھی۔ جو اس کی ماں اپنی ہر نماز کے بعد مانگتی تھی، وہی دعا اِس کو گناہوں کے سمندر میں بھی گناہوں سے بچا رہی تھی۔ بظاہر شگفتہ بی بی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی دعائیں قبولیت کے آسمان کو نہیں پہنچ رہیں مگر حقیقت تو کچھ اور ہی تھی۔ ان کی دعائیں نہ صرف قبولیت کا شرف پا رہی تھیں بلکہ ضرغام کی حفاظت بھی کر رہی تھیں۔ بھلا خدا کیسے اپنے بندے کی دعا کو رد کر سکتا تھا جب اُس نے خود مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اور پھر اپنے نیک بندوں کی دعاؤں کو خاص قبولیت کا درجہ دیتا ہے۔ اور پھر بھلا شگفتہ بی بی کی دعائیں کیسے نہ پوری ہوتیں جب کہ ان کی دعاؤں کا محور ہی ضرغام تھا۔ ان کی دعاؤں کا خاصہ ہی ان کا اپنا بیٹا تھا۔ عنایہ ضرغام کو اپنی طرف کھینچنے کی پوری کوشش میں تھی۔ کئی بار تنہائی میں اس نے ضرغام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا مگر وہ بچا رہا۔ ماں کی دعاؤں نے اسے اپنے چہرے پر سیاہی ملنے سے روکے رکھا تھا۔ وگرنہ جس مقام پر وہ تھا وہاں صرف گناہ تھا۔ صرف سیاہی تھی۔ لیکن وہ اس سیاہی میں بھی روشنائی تھا۔ دعاؤں کا اثر اس کے چہرے پر واضح تھا۔ ہر بار جب بھی عنایہ اسے گناہ کی دعوت دیتی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ ایک انجان سی طاقت اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی۔ اس کی سانسیں ماند پڑنا شروع ہو جاتیں۔ آنکھیں موندنے لگتی تھیں اور وہ خراب طبیعت کا بہانہ کر کے بچ نکلتا۔ جب دعاؤں کے ذریعے مدد مانگی جائے تو ہر گناہ سے نکلنے کی سبیل خدا نکال دیتا ہے اور پھر ماں کی دعا تو ویسے ہی عرشوں سے باتیں کرتی ہے۔ پھر بھلا شگفتہ بی بی کی دعائیں اسے گناہ سے کیوں نہ روکتیں۔۔

''تم ہمیشہ یہی کہتے ہو۔۔۔ پھر کبھی۔۔ آج میں تمہاری ایک

نہیں سننے والی۔۔۔ تم آج رات میرے ساتھ گزار رہے ہو بس۔۔۔ سن لیا تم نے۔۔" شیطان بھی کہاں اتنی جلدی پیچھے ہٹتا ہے۔ انسان کو بھڑ کانے کے لئے پورا زور لگا دیتا ہے۔ انسان کو انسانیت سے اتنا نیچے گرا دیتا ہے کہ اٹھنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ شاید وہ بھی اپنے پستی کا سفر طے کر رہی تھی

"میں نے کہا ناں۔۔ میری طبیعت نہیں ٹھیک۔۔۔" اس کی نظریں ابھی سٹئیرنگ پر تھیں

"نہیں۔۔۔ تم چل رہے ہو تم بس چل رہے۔۔۔" اس نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازہ کھول کر اسے باہر نکالا۔ شیطان پوری طرح اس کے دماغ کو جکڑ چکا تھا۔ وہ "نہیں"، "نہیں" کہتا رہا مگر اُس نے ایک نہ سنی۔ اسے اپنے گھر کے دروازے تک لے ہی آئی۔ دروازہ کھولا تو صرف اندھیرے نے استقبال کیا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ صرف تنہائی تھی۔ اس طرح گناہ کو مزید تقویت ملی۔ جہاں مرد اور عوت اکیلے ہوں تیسرا شیطان ہوتا ہے اور واقعی شیطان اُن کے درمیان میں تھا جو دونوں پر باری باری وار کر رہا تھا۔ جب وہ ضرغام کے پاس جاتا تو دعاؤں کا حصار پاتا۔ رحمت خداوندی پاتا جو ماں کی دعاؤں کی وجہ سے تھی۔ ناکام لوٹ آتا لیکن جب عنایہ کے پاس جاتا تو صرف نفس کو پاتا جو پہلے ہی اسے پھسلا رہا تھا۔ یہاں اس کے ہتھکنڈے بخوبی چلتے۔ عنایہ نے دیوار کے ساتھ لگے سوئچز کو آن کیا تو پورا گھر جگ مگ روشن ہو گیا مگر یہ روشنی اُس کے اندر کو روشن کرنے میں ناکام تھی۔ جن کے اندر سیاہی ہو، باہر چاہے کتنی ہی روشنی کر لی جائے سیاہی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مگر یہی روشنی ضرغام کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ وہ آنے والے خطرے کی بو محسوس کر رہا تھا۔

"چلو میرے ساتھ۔۔" وہ اپنے دونوں بازوؤں سے اس کے دائیں بازو کو پکڑے ہوئے تھی۔

"عنایہ پلیز۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ میرا دل خراب ہو رہا ہے۔۔" اسے چکر آنے لگے تھے مگر عنایہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی

"ناٹک بند کرو۔۔ سمجھے۔ اب چلو میرے ساتھ۔۔۔ اوپر ہے میرا کمرہ۔۔۔" وہ اسے زبردستی سیڑھیوں کی طرف لے گئی

"نہیں عنایہ۔۔۔" اس کا سر بری طرح چکرانے لگا۔ دعائیں اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ اسے گناہوں میں دھنسنے سے بچا رہی تھیں۔

"خاموش۔۔ ایک دم خاموش۔۔۔" برائی ہر طرف سے زوروں پر تھی۔ شیطان دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سٹیپ چڑھنے لگا۔ بظاہر برائی کا پلڑا بھاری تھا۔ ہر شے برائی کے حق میں تھی۔ مگر جنہیں خدا بچانا چاہے انہیں کوئی بھلا کوئی کیسے گناہ کی طرف مائل کر سکتا

ہے۔ آخری سٹیپ پر پہنچ کر ضرغام نے اپنا ہاتھ زور سے کھینچا۔ اور یک دم رک گیا۔ اُس کے سر میں کوئی زوروں سے ہتھوڑوں سے وار کر رہا تھا۔ یہ وار دراصل برائی سے روکنے کے لئے تھا

''کیا ہوا۔۔؟'' استفہامیہ انداز میں عنایہ نے ضرغام کی طرف دیکھا جو اپنے سر کو ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھا

''میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔۔'' اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا تھا

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔ چلو میرے ساتھ۔۔۔'' برائی کوئی بہانہ قبول کیسے کر سکتی تھی مگر دعائیں اسے روکے ہوئے تھی۔ اس کے سر پر ایک ایسی ضرب لگی جو وہ برداشت نہ کر سکا۔ عنایہ نے اسے اپنی طرف کرنے کی کوشش کی تو اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا مگر وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور اس کا پاؤں پھسل گیا۔ پاؤں کے پھسلنے سے اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا کہ نیت کے پھسلنے سے ہو سکتا تھا۔ وہ جتنی سیڑھیاں پاؤں سے چڑھ کر گیا تھا۔ لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔ یہ شاید ایک معمولی سا جھٹکا تھا جو خدا کی طرف سے تھا کہ سنبھلنے کا وقت ہے ابھی بھی سنبھل جاؤ۔

''ضرغام۔۔'' وہ دوڑتی ہوئی نیچے آئی اور جو کچھ کرنا چاہتی تھی اسے بھول گئی اور اپنے کمرے میں لے جانے کی بجائے اسے ہسپتال لے گئی۔ ماتھے سے خون ریستا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر کے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی مگر اب وہ نیم بے ہوشی میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ عنایہ کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ اسے اپنے کئے پر شرمندگی تھی مگر وہ ابھی معافی نہیں مانگ سکتی تھی۔ وہ اتنے ہوش میں نہ تھا کہ اس کی بات سن سکتا۔ ضرغام کو اس کے گھر چھوڑ کر وہ اپنے گھر واپس پلٹی۔ آج بھی شگفتہ بی بی کی دعاؤں نے ضرغام کو سیاہی کو اپنے چہرے پر ملنے سے بچا لیا

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے وجیہہ کے کانوں میں وہی الفاظ سرگوشی کر رہے تھے۔

''کیا کروں؟'' اُس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے سرسری نگاہ گھڑی پر دوڑائی تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کالی چادر اوڑھے آسمان جگ مگ موتی نما ستاروں سے چمک رہا تھا۔ لان میں موجود گلاب کے پھول بھی اونگھ رہے تھے۔ پتوں کی دلفریب سرسراہٹ بھی اب آرام کرنا چاہتی مگر ہواؤں کا رقص بار بار انہیں جھومنے پر مجبور کر دیتا۔

''یہ کیا ۱۲ بھی بج گئے۔۔'' اُس نے خود سے ہی سوال کیا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو دباتے ہوئے وہ بیڈ پر آ لیٹی مگر بے چینی نے اِس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی مگر سکون میسر نہ آیا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے اس کی نظر دائیں طرف کی

الماری پر پڑی۔ جس کے عین اوپر اس کا دل تھا۔ اس کے بے چین دل کا علاج تھا

"بے شک اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون میسر آتا ہے" (سورہ الرعد)

کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔ وہ اس سرگوشی کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ جلدی سے اٹھی اور واش روم میں جا کر وضو کیا اور الماری سے قرآن مجید اٹھایا اور اپنے سینے سے لگالیا۔ قرآن مجید کے اٹھانے کی دیر تھی۔ بے چینی پشیمان ہو کر دور ہٹنے لگی۔ سکون کی چادر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اپنے بستر پر آگئی اور تلاوت کرنا شروع کر دی۔ وہ تلاوت میں اس قدر محو تھی کے رات کے پہر کیسے بدلتے گئے اسے علم تک نہ ہوا۔ رات کی پرفسوں فضا کھڑکی کے راستے اس کے کمرے میں تلاوت سننے داخل ہونے لگی۔

"اللہ اکبر اللہ اکبر۔۔" شیریں الفاظ جب اس کے کانوں میں گئے تو اس کی نظر دوبارہ گھڑی کی طرف گئی صبح کے تین بج چکے تھے۔ تہجد کی اذان دی جا رہی تھی۔ اس نے قرآن مجید کو چومتے ہوئے بند کیا اور جائے نماز اٹھا کر خدا کے حضور سر بسجود ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

رضیہ بیگم کچن سے فراغت پانے کے بعد ٹی وی لاؤنج میں آئیں تو انمول کو صوفے پر کچھ سوچتے ہوئے پایا۔ وہ سر کو پشت سے ٹکائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا

"کیا ہوا بیٹا؟ کیا سوچ رہے ہو؟ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"کچھ نہیں۔۔۔ بس ویسے ہی۔۔۔" سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ بالوں کو ہاتھوں سے سیٹ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا مگر سیڑھی پر فرسٹ سٹیپ رکھتے ہی اسے کسی سوچ نے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے اپنا ارادہ ملتوی کیا اور واپس پلٹ آیا

"امی آپ نے وجیہہ کے بارے میں کیا سوچا" اب بھی اس نے وجیہہ کے ساتھ آپی لگانا مناسب نہیں سمجھا

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" انہوں نے استفہامیہ انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا

"مطلب یہ کہ ساجد اور وجیہہ کے رشتے کے بارے میں۔۔۔ اور ویسے بھی اتنی عمر تو ہو گئی ہے اُس کی۔۔ ابھی شادی نہ ہوئی تو ساری عمر کہیں گھر ہی بیٹھی نہ رہ جائے۔۔" وہ اپنی رائے دے رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کی رائے کو سراہا جا رہا تھا

"کی تو ہے وجیہہ سے لیکن اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔۔" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ایک تو یہ لڑکی بھی ناں۔۔۔ امی اُس کے جواب کا کیا انتظار

کرنا اور ویسے بھی آج تک اس نے کبھی آپ کی بات کا انکار کیا بھی ہے جو آج کرے گی؟۔۔۔بس آپ جلدی سے یہ رشتہ پکا کرنے کی سوچیں۔۔"اس نے شاطرانہ انداز میں اپنا داؤ چلا تھا جو شاید ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

"لیکن اگر کچھ صبر کر لیتے تو ٹھیک تھا۔۔"کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا

"امی۔۔۔اب سوچنے کی کیا بات ہے؟آپ جلدی سے بات کریں تاکہ جلد از جلد یہ بوجھ سر سے اترے اور ہم بھی سکون کا سانس لے سکیں۔"اس نے اونچی آواز میں کہا تھا تبھی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے وجیہہ نے اس کی بات سن لی۔انمول کے لفظ"بوجھ"نے اسے بہت ہرٹ کیا مگر اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا

"بے فکر رہو۔۔۔اب یہ بوجھ تمہارے سر پر زیادہ دن تک قائم نہیں رہے گا۔۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ یہ بوجھ جتنی جلدی ہو سکے اترے اور ایک نحوست تو ہمارے گھر سے کم ہو۔۔"اس کے انداز میں انتہا کی بے رخی تھی۔جو وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی

"تم دونوں بس کرو۔۔۔انمول تم تو کچھ دیر کے لئے خاموش رہو۔۔۔اور تم وجیہہ کیا تم واقعی ساجد سے شادی کے لئے تیار ہو؟"انہوں نے انمول کو جھڑک کر وجیہہ کی طرف توجہ کی

"میں نے ایسا تو نہیں کہا کہ میں ساجد سے شادی کروں گی۔۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا اگر ساجد سے نہیں کرو گی تو اور کس سے کرو گی؟"وہ وجیہہ کی بات پر خاصی حیران تھیں مگر وجیہہ نے خاموشی میں ہی افادیت جانی

"بولو۔۔۔میں نے کچھ پوچھا ہے۔۔"انہوں نے اس کے شانوں کو جھٹکا دیا۔مگر وہ خاموش رہی۔

"امی کو شگفتہ میڈم کی بات بتا دوں کہ انہوں نے۔۔۔"وہ ابھی یہی سوچ رہی کہ انمول کا طنز ایسا چلا کہ وہ سوچوں کی دنیا سے باہر آ گئی

"یہ کیا بولے گی۔۔۔کیا معلوم جس کالج میں جاتی ہو۔۔، وہیں پر کسی سے۔۔۔"گردن جھٹکتے ہوئے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی

"انمول۔۔۔"اپنے کردار پر لگے اس بہتان کو وہ برداشت نہ کر سکی

"میرے کردار پر یوں بے بنیاد بہتان باندھنا بند کرو۔۔"اس نے سخت لہجے میں کہا تھا

"کیوں سچ کڑوا لگا کیا؟"اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی

"اب بس کرو تم دونوں۔۔۔انمول تم اپنے کمرے میں

جاؤ۔۔" مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اسی جگہ بر اجمان وجیہہ کو گھورتا رہا

"تمہیں سنا نہیں۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔" اس بار قدرے سخت لہجے میں رضیہ بیگم نے کہا تھا

"مجھ پر چلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔ اگر چلانا ہی ہے تو اپنی اس بیٹی پر چلایئے۔۔۔ گھر میں تو شریف زادی ہونے کا

غزل

آنسو کو پلکوں پر سجانا ہمیں بھی آتا ہے
دل ناداں کو منانا ہمیں بھی آتا ہے
تیرے دل میں اٹھتا ہے جو اک درد
اس درد میں پگھلنا ہمیں بھی آتا ہے
آنسو تیرے اتنے نایاب بھی نہیں
راز کو سینے میں چھپانا ہمیں بھی آتا ہے
دیر تک تجھے چھوڑنے کا سوچتے رہے
وفاؤں میں جیتنا ہمیں بھی آتا ہے
تیری باتیں بھی عجب باتیں ٹھریں
پھول کلی بھکیرنا ہمیں بھی آتا ہے
تو نے یوں ہی میرے لیے تکلیف کی
عنبرین کانٹے سمیٹنا ہمیں بھی آتا ہے

عنبرین اختر. لاہور

مگر اس بار وہ برداشت نہ کر پائی اور مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو اس نے وجیہہ کا ہاتھ پکڑ لیا

"اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھنا سیکھو۔۔۔ ورنہ ہاتھ اٹھانا مجھے بھی آتا ہے۔۔" عقابی نظروں سے گھورتے ہوئے انمول نے وجیہہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ بس دیکھتی رہ گئی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا

"امی۔۔ دیکھا آپ نے۔۔ کیسے بدتمیزی کر رہا تھا۔۔" مگر اس بار بھی اس کی شنوائی نہ ہوئی

"کیا غلط کہا اُس نے۔۔۔ صحیح تو کہا ہے۔۔۔ شادی کرو اور جان سے اترو۔۔۔" رضیہ بیگم نے انمول کا سارا غصہ وجیہہ پر اتارا تھا۔

"لیکن امی۔۔۔" حسرت بھری نگاہ رضیہ بیگم کے چہرے پر ڈالی

"اب چپ۔۔۔ ایک لفظ بھی کہا ناں۔۔ مجھ سے برا کچھ نہیں ہو گا۔۔۔" یہ کہہ کر وہ بھی چل دیں۔ وہ دونوں کی باتوں کو سن کر رہ گئی۔ کوئی اس کا حال دل پوچھنے والا نہیں تھا۔

"کاش۔۔ دادی۔۔ آپ اس وقت زندہ ہوتیں۔۔۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

لا الہ الا اللہ

اذان مکمل ہوئی تو شگفتہ بی بی نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور پھر

اسی جائے نماز پر نماز مغرب ادا کی۔ گھر میں وقت وہ صرف اکیلی تھیں۔ ضرغام لازوال کے سیٹ سے ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ جب سے لازوال کا سفر اس نے شروع کیا اس کا گھر میں رہنا اور بھی کم ہو گیا۔ پہلے تو صرف دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا مگر اب کبھی کسی پارٹی میں تو کبھی کسی سیمینار میں پایا جاتا۔ شگفتہ بی بی سمجھا سمجھا کر تھک گئیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ انہوں نے اب سلام پھیرا تو دروازے کے کھلنے کی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ انہوں نے دوسرا سلام پھیرا تو کسی کے قدموں کے ساتھ سیٹی کی بھی آواز خاموش کمرے میں گونجنے لگی۔ یہ ضرغام ہی تھا۔ گرے جینز پر لائیٹ پنک شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ کمرے میں آتے ہی وہ دھڑام سے صوفے پر جا بیٹھا۔ اُس کی نظریں سامنے لگے آئینے پر تھیں جسے دیکھ کر وہ اب اپنا ہئیر سٹائل ٹھیک کر رہا تھا۔ شگفتہ بی بی نے ایک نظر ضرغام کے حلیہ پر دوڑائی پھر اپنی دعا میں مشغول ہو گئیں۔۔

''اتنی دعائیں مانگنے کا کیا فائدہ۔۔۔؟ سب کچھ تو ہے آپ کے پاس۔۔'' وہ نادان تھا۔ یہ سمجھ نہ سکا کہ اُس دن جو وہ عنایہ کے شیطانی ارادوں سے صحیح سلامت نکلا تھا۔ وہ انہی دعاؤں کا ہی اثر تھا۔ لیکن نادان لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ وہ بھی انہی نادانوں میں سے ایک تھا۔ جنہیں وقت نے اپنے لپیٹے میں لیا ہوا تھا۔

''کتنی بار کہا ہے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے سلام کیا کرو۔۔ گھر میں امن رہتا ہے مگر نہیں تمہارے سر پر تو جونک تک نہیں رینگتی۔۔'' دعا مکمل کرنے کے بعد جائے نماز اٹھاتے ہوئے وہ گویا ہوئی تھیں

''آپ تو اپنی دعا میں مگن تھیں تو سلام کسے کرتا؟؟ ان دیواروں کو۔۔'' روکھے پن سے اس نے طنز کیا تھا

''دیواروں کو نہ سہی کم سے کم فرشتوں کو ہی کر دیتے۔ اور ویسے بھی آنے والے کا فرض بنتا ہے کہ آتے ہی سب کو سلام کرے مگر تم۔۔۔'' جائے نماز کو انہوں نے صوفے کی پچھلی سائیڈ پر رکھے ہوئے ایک چھوٹے سے میز پر رکھا جہاں اور بھی جائے نماز رکھے ہوئے تھے

''اچھا بھی۔۔۔'' مصنوعی ندامت میں اس نے مداخلت کی تھی

''آئندہ کروں گا اب خوش۔۔۔'' چہرے پر ایک مسکراہٹ لانے کی کوشش کی

''یہ بتائیے کھانے میں کیا بنایا ہے؟ بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔'' گہری سانس لیتے ہوئے وہ جھکا اور شوز اتار کر جرابیں اتارنے لگا

''تمہاری پسند کی بریانی بنائی ہے اور ساتھ چپل کباب بھی۔۔۔ تم اٹھو ہاتھ منہ دھو لو۔۔۔ میں اتنے سب چیزیں ڈائنگ ٹیبل پر رکھ دیتی ہوں۔'' انہوں اس کی جرابیں

اٹھائیں اور وارڈروب میں بغیر دھلے کپڑوں کے ساتھ رکھ دیں

''جو حکم۔۔۔'' وہ بڑا ہی فرماں بردار بیٹوں کی طرح بی ہیو کر رہا تھا۔ اٹھتے ہی واش روم میں گیا اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد ڈائنگ ٹیبل پر آ بیٹھا۔ شگفتہ بی بی نے پہلے سے ہی کھانے کی تمام چیزیں ٹیبل پر سجا دی تھی۔ بڑی سی پلیٹ میں بریانی اس کی چیئر کے سامنے رکھی تھی۔ ساتھ ہی سالڈ اور رائیتہ بھی پیش پیش تھا۔ کوک کی بوتل بھی ٹیبل کی رونق میں اضافہ کر رہی تھی۔ بس چپل کباب کی کمی تھی جو شگفتہ بی بی پلیٹ میں رکھے کچن سے لا رہی تھیں۔

''واؤ۔۔۔ اتنا اچھا کھانا۔۔'' اس نے آستینیں کہنیوں تک چڑھائیں اور ہاتھ بڑھا کر ایک کباب اپنی پلیٹ میں رکھا اور رائیتہ کے ساتھ بریانی کا مزہ لینے لگا

''ایسے ہی رہا کرو۔۔۔ اچھے لگتے ہو۔۔'' وہ ضرغام کو یوں کھاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ وہ بالکل معصوم لگ رہا تھا۔ ایک معصوم سا چہرہ، جسے دنیا کا کچھ پتا نہ ہو، صرف اپنی ہی دنیا میں مگن۔

''آپ یونہی اچھے کھانے بناتی رہا کرو۔۔ میں ایسا ہی رہوں گا۔۔'' اس نے ایک ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ شگفتہ بی بی نے فوراً گلاس میں کوک ڈال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے جب دیکھا کہ شگفتہ بی بی کا موڈ کافی اچھا ہے تو اصل بات کی طرف آیا جس وجہ سے وہ اچھا بننے کا ناٹک کر رہا تھا

''امی۔۔ آپ سے کچھ پیسے چاہئے تھے۔۔'' اس نے تقریباً سرگوشی ہی کی تھی

''ابھی پرسوں ہی تو دیئے تھے تیس ہزار،،، کہاں گئے وہ؟۔۔'' وہ جان چکی تھیں کہ وہ آج اتنا میٹھا کیوں ہو رہا تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی جب بھی کوئی کام ہوتا تو شہد سے زیادہ شیریں ہو جاتا اور پھر زہر سے زیادہ کڑوا

''وہ۔۔۔ وہ تو پرسوں ہی ختم ہو گئے تھے۔۔۔ پلیز۔۔۔ ستر ہزار کا چیک بنا کر دے دیں، کل میں خود ہی کیش کروالوں گا۔۔۔''

''کیا کہا؟؟ ستر ہزار؟ تمہارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے۔۔۔!! جانتے بھی ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟'' لفظ ستر ہزار سن کر ان کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ اگر بات اپنے اوپر خرچ کرنے کی ہوتی تو شاید وہ منع نہ کرتی مگر یہ تو رقم دوسروں پر لٹانا جانتا تھا۔ عیاشی میں پیسوں کو ایسے بہاتا جیسے کوئی پانی بہاتا ہو۔

''تمہارے لئے پیسے کیا درخت کے پتے ہیں کہ جب دل چاہا جتنے چاہا توڑ لئے؟'' انہوں نے تلخ لہجے میں کہا تھا

''امی۔۔ اب اس میں اتنا غصہ ہونے والی کیا بات ہے؟ صرف ستر ہزار ہی تو مانگے ہیں۔۔'' اس نے بے نیازی سے کہا

''تمہارے لئے یہ ستر ہزار صرف ہیں؟؟؟'' ان کا انداز

استفامیہ تھا

"جی ہاں۔۔" فی الفور جواب دیا

"ضرغام۔۔۔اتنی عیاشی اچھی نہیں ہوتی۔۔۔" یہ کہہ کر وہ کچھ پل کے لئے خاموش رہیں

"اور تمہیں روز روز پیسے مانگتے شرم نہیں آتی؟" انہوں نے سوال داغا تھا۔

"شرم آتی ہے تب ہی تو کہتا ہوں کہ سب کچھ میرے نام کر دیں۔۔۔ نہیں مانگوں گا روز روز۔۔" اس نے جیسے مسئلے کا حل بتایا تھا

"ہاں تا کہ تم دو دن میں کنگال ہو کر بیٹھ جاؤ۔۔" ایک بار پھر خاموشی نے ڈیرہ جمایا

"ضرغام۔۔۔انسان کو کفایت شعاری ہر عمل کرنا چاہئے۔۔۔یوں پیسوں کو۔۔۔" ضرغام نے مداخلت کی

"اگر پیسے نہیں دینے ناں۔۔تو نہ دیں کم سے کم یہ نصیحتیں تو بند کریں۔۔" وہ غصے میں ایک زوردار ہاتھ ٹیبل کو مارتا ہوا کھڑا ہوا تھا

"کہاں جا رہے ہو تم؟؟" انہوں نے کھانے کی طرف اشارہ کیا تھا

"جہنم میں۔۔۔سارہ مزہ کرکرا کر دیا کھانے کا۔۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا

"اے خدا۔۔!! تُو ہی ہدایت دے۔۔۔" حسرت بھری نگاہوں سے اس کے جاتے وجود کو دیکھتے ہوئے اپنے رب سے دعا مانگی اور پھر اس کا بچا ہوا کھانا سمیٹنے لگیں۔ کھانا سمیٹے ہوئے ان کے ذہن میں وجیہہ کا خیال آیا

"اے خدا! وجیہہ ہاں کر دے۔۔۔شاید وجیہہ جیسی بیوی آنے پر یہ کچھ سدھر جائے۔۔"

☆ ☆ ☆

علی عظمت اپنے کمرے میں جانے لگے تو رضیہ بیگم نے انہیں آواز دے کر روکا

"سنیئے۔۔" وہ پلٹے

"جی۔۔۔فرمایئے۔۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا

"پہلے ادھر بیٹھیں۔۔۔ آرام سے۔۔" وہ چلتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں اور کچھ سوچتے ہوئے علی عظمت بھی وہاں آ گئے اور آ کر صوفے پر بیٹھ گئے

"اب فرمائیں۔۔۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا تھا

"میں نے وجیہہ سے بات کی تھی ساجد کے سلسلے میں۔۔" انہوں نے تمہید باندھی

"گڈ۔۔یہ تو اچھی بات ہے تو پھر کیا جواب دیا وجیہہ نے۔۔۔" آگے کی طرف جھک کر پوچھا

"جواب کیا دینا تھا۔۔۔بات کو گول مٹول کر گئی" انہوں نے گہری سانس لیتے ہی پشت صوفے کے ٹیک سے لگا لی

"تو پھر۔۔۔"

''تو پھر کیا۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ ساجد کو ہاں ناں کر دیں۔۔ ویسے بھی وجیہہ نے آج تک ہماری بات تو ٹالی نہیں جو یہ ٹالے گی۔۔'' انہوں نے تقریباً رازدارانہ بات کہی تھی

''لیکن۔۔ یہ بات کچھ اور ہے۔۔''

''مگر۔۔۔۔ جب وہ کچھ جواب ہی نہیں دے گی تو ہم کیسے سمجھیں گے کہ اس کے دل میں کیا چل رہا ہے۔۔''!!

''بات تو ٹھیک ہے۔۔ مگر۔۔'' سیڑھیوں سے اترتے قدموں کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ دونوں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا تو ادھر وجیہہ تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر ان کے پاس آئی

''السلام علیکم۔۔'' دونوں کو سلام کیا

''وعلیکم السلام۔۔'' صرف علی عظمت نے ہی جواب دیا۔

''اچھا ہوا آپ دونوں یہیں مل گئے۔۔ مجھے آپ دونوں سے بات کرنی تھی۔۔'' وہ صوفے کی ٹیک پر ہاتھ جمائے کھڑی ہو گئی

''ہاں۔۔ آؤ بیٹھو۔۔۔'' علی عظمت نے صوفے پر بیٹھنے کو کہا

''نہیں ابو۔۔ میں نے صرف آپ سے بات کرنی ہے اور بس۔۔۔ واپس کمرے میں جا کر مجھے نوٹس بھی بنانے ہیں''

''تو پھر کرو۔۔۔'' روکھے پن میں رضیہ بیگم نے کہا تھا

''بات یہ تھی کہ میں شادی کے لئے تیار ہوں۔۔۔'' اس نے اپنی نظریں سامنے دیوار پر جمائے کہا تھا

''کیا کہا؟'' رضیہ بیگم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا

''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' علی عظمت نے تصدیق چاہی

''جی ابو۔۔۔۔ میں شادی کے لئے تیار ہوں۔۔'' اس نے ایک بار پھر وہی جملہ دہرایا

''سچ میری بیٹی۔۔'' رضیہ بیگم نے اٹھ کر اس کے چہرے کو بوسہ دیا

''لیکن میں ساجد سے شادی نہیں کروں گی۔۔۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''کیا؟؟'' یہ سن کر رضیہ بیگم کو دھچکا لگا۔ دونوں ہاتھ خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔ وہ استفہامیہ انداز میں اس کے چہرے کو تکنے لگیں

''اگر ساجد سے نہیں کرنی شادی تو پھر کس سے کرنی ہے؟'' علی عظمت نے کھڑے ہوتے ہوئے سوال کیا

''ضرغام عباسی سے۔۔۔'' اس نے بڑے مان سے کہا تھا

''ضرغام؟؟'' رضیہ بیگم نے استفہامیہ انداز میں کہا تھا

''جی۔۔ ضرغام۔۔۔ اگلے ہفتے آ رہا ہے میرے رشتے کے لئے۔۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے کی طرف پلٹ گئی

''لیکن یہ ہے کون۔۔'' علی عظمت نے پوچھا تھا

''جس کالج میں میں پڑھاتی ہوں، وہاں کی پرنسپل شگفتہ بی بی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کا بیٹا۔۔۔" وہ ایک ثانیے کے لئے رکی اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ رضیہ بیگم نے حیرت سے علی عظمت کی طرف دیکھا تو انہوں نے کندھے اچکا دیئے۔۔۔

☆ ☆ ☆

باقی انشاءاللہ آئندہ ماہ

داستانِ دل میں تحریر بھیجنے کا طریقہ

آپ اپنے لکھے گئے افسانے، ناولٹ اور ناولز ہمیں ڈاک کے ذریعے بھیج سکتے ہیں یا پھر وٹس ایپ کر سکتے ہیں یا پھر ہمیں موبائل پر میسج کر سکتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ آپ کی تحریر اردو میں لکھی گئی ہو۔ ہمارا ایڈریس ہے

L 79/5: ندیم عباس ڈھکو، چک نمبر
تحصیل و ضلع ساہیوال L 78/5 ڈاکخانہ.

ہمارا نمبر ہے: 03225494228

abbasnadeem283@gmail.com

علی، احمد اور داستانِ دل

علی: یار احمد، تو نے ستمبر کا داستانِ دل پڑھا؟

احمد: ہاں یار! میں نے تو پڑھا، دل خوش ہو گیا میرا تو

علی: ٹھیک کہا تُو نے۔۔۔ ایک ساتھ اتنی تحاریر اور وہ بھی پاکستان کے مایہ ناز مصنف کے قلم سے

احمد: تجھے کیا اچھا لگا؟

علی: مجھے تو ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک لگی، نزہت جبیں کا ناولٹ، پھر محمد شعیب کا قسط وار ناول اور پھر ہماری جان شامِ تنہائی۔۔۔ اب میں تجھے کیا کیا بتاؤں۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ اگلی بار میں بھی کچھ لکھ کر بھیج دوں۔

احمد: کیا وہ تیرے جیسے اناڑی کی تحریر لگائیں گے بھی؟

علی: جی ہاں! اُن کا کہنا ہے کہ وہ نہ صرف نئے رائیٹرز کو سپورٹ کرتے ہیں بلکہ ان کی تحاریر میں موجود خامیاں دور کر کے قابلِ اشاعت بناتے ہیں

احمد: واؤ۔۔۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ پھر تو میں بھی بھیجوں گا۔

ہار

عفت بھٹی

وہ گرو کے گھٹنے پہ سر رکھے سسک رہا تھا۔ میں ہار گیا گرو میں ہار گیا یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ گرو نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اسے اٹھا کر گلے لگا لیا۔ دل کا بوجھ آنسوؤں کے رستے بہا تو دل ہلکا ہوا گرو نے اسے پانی کا گلاس تھمایا لو پی لو۔ اس نے پانی پی کر گلاس تپائی پہ رکھا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ دیکھ شبو میں نے تیری ہر ضد مانی جو تو نے کہا مانا مگر سچ تو یہ کہ تو نہیں ہارا تو نے اپنی پوری کوشش کی بس رب نے جہاں ہمارا رزق لکھا ہے ناوہیں ملنا ہے پتری تو دل چھوٹا نہ کر۔ گرو نے شبو عرف جمیل کا کندھا تھپکا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شبو چٹائی پہ لیٹ گیا بازو لپیٹ کر سر کے نیچے رکھے اور کمرے کی چھت کو گھورنے لگا اس کی آنکھوں کے آگے پانی کی چادر تن گئی اور خیالوں کی کتاب کھلتی چلی گئی۔ اسلم دعائیں کر رہا تھا اے اللہ اس بار تو مجھے بیٹے سے نواز دے تین رحمتیں اوپر تلے ہو گئیں اب نعمت کا منہ دکھا دے مالک۔۔ اتنے میں اسلم کی ماں باہر آئی اس کے ساتھ دائی فاطمہ کھسر پھسر کر رہی تھی ۔اسلم نے بے تابی سے ماں کی طرف دیکھا ماں نے نظریں چرائیں اور فاطمہ کے ہاتھ پہ بہت سے روپے رکھے۔ اسلم نے اچھنبے سے ماں کو دیکھا اس کی سمجھ میں صورتحال نہیں آرہی تھی۔ فاطمہ کے جاتے ہی وہ ماں کی طرف بڑھا ماں کیا ہوا سب ٹھیک ہے نا؟ کیا ہوا ہے بیٹا ہوا نا اس کی بے تابی عروج پہ تھی یا اسے اپنی دعاؤں پہ یقین تھا۔ اسلم وہ۔۔ ماں نے ہکلاتے ہوئے اسے اصل صورتحال سے آگاہ کیا۔ اسلم کا رنگ زرد پڑ گیا وہ تیزیٰ سے کمرے کی طرف بڑھا چارپائی پہ لیٹی رضیہ نے غالبا اس کے تیور بھانپ لیے تھے اس نے ساتھ لیٹے کپڑے میں لپٹے بچے کو سینے سے لگا لیا نہیں اسلم یہ بے گناہ ہے ہماری اولاد ہے اس میں اس کا کیا قصور میں تجھے یہ

ظلم کرنے نہیں دوں گی۔ اللہ سے ڈر۔ اسلم جھکے کندھوں اور آنسو بھری آنکھیں لے کر باہر نکل گیا۔ بات فاطمہ کے منہ سے کسی کو نہ بتانا کی یقین دہانی کے باوجود باہر نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔ کسی نے خاموشی اختیار کی تو کسی نے دانتوں میں انگلیاں دابیں اور کسی نے ٹھٹھا مخول بنالیا اسلم کے گھر خواجہ سرا نے جنم لیا ہے۔ جب یہ خبر گرو تک پہنچی تو وہ اسلم کے گھر آ پہنچا۔ اس کا دعوا تھا یہ بچہ ہمارا ہے آج بھی اور کل بھی کیونکہ اسے خاندانی معاشرہ قبول نہیں کرے گا۔ قصہ مختصر چند دن کا جمیل ماں کی گرم آغوش سے نکل کر گرو کی گود میں آ گیا ماں نے روتے ہوئے اس کی پیشانی چومی اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو کپکپاتے لبوں اور برستی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا ماں کے لیے تو بس وہ اس کی اولاد تھا بلا جنس کی تخصیص کے۔ مگر یہاں وہ بے بس تھی۔

جمیل پانچ برس کا ہو گیا وہ ایک خاموش طبع بچہ تھا اسے گھر سے باہر نہیں بھیجا جاتا تھا وہ گرو کے ساتھ ساتھ رہتا۔ اب وہ اپنے ماحول کو بنظرِ غور دیکھتا کچی چار دیواری میں بنے تین کچے کمرے تھے ایک میں چھینو، ریما اور بجلی رہتی تھی جبکہ دوسرے میں چاچا تاجو اور رشید استھے جو اس پارٹی کے میوزیشن تھے جبکہ تیسرے میں گرو اور جمیل ہوتے تھے یہ کمرا نسبتا بڑا اور قدرے بہتر حالت میں تھا۔ نیچے موٹی چٹائی بچھی تھی اور اس پہ گدیلے نما گول تکیے تھے گن کے غلاف میلے ہو کر اپنی اصل رنگت کھو چکے تھے ایک طرف کھونٹی پہ گرو کے کپڑے ٹنگے تھے ایک بڑا سا ٹین کا بکس جس میں گرو ودہائیوں میں ملے کپڑے اور رقم رکھ کر تالا لگا دیا کرتا تھا۔

گرو میں نے سکول جانا ہے جمیل نے ایک دن گرو سے فرمائش کی۔ وہ روزانہ گلی میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑا وردیوں میں ملبوس آپس میں چہلیں کرتے بچوں کو سکول جاتے دیکھا کرتا تھا آج وہ خواہش لفظ بن کر منہ سے نکلی گرو نے حیرانی سے جمیل کو دیکھا نہ پتر ہمارا سکول سے کیا لینا دینا تو چاچے تاجو سے سر تال سیکھا کر۔ مگر جمیل نے ایسی ضد پکڑی کہ چارپائی سے لگ گیا کھانا پینا چھوڑ دیا سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ گرو کو اس سے پیار ہی بڑا تھا اور اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا اس نے اسے ایک دور سکول میں داخل کروا دیا چاچا تاجو اسے لاتا لے جاتا اس کی شناخت مخفی رکھی گئی جمیل بہت ذہین ثابت ہوا اور ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ اب وہ آٹھویں میں پہنچ چکا تھا۔ گرو نے دبی زبان میں اسے منع کرنا چاہا مگر اس نے آگے پڑھنے کی ضد کی مگر اب اس کی متوالی چال اور آواز اس کا بھید کھولنے لگی تھی۔ اس میں زنانہ خصوصیات واضح ہونے لگیں تب اس نے ایک فیصلہ کیا اور گرو کی منت ترلے کرنے شروع کر دیئے۔ گرو کو مانتے ہی بنی اب جمیل نے میٹرک پرائیویٹ پاس کر لیا وہ بھی اعلی نمبروں سے اب اس میں علم کی پیاس اور بڑھتی جا رہی تھی

مگر اب اس کے لیے بہت مشکل مرحلے تھے مگر وہ ڈٹا رہا اور بی۔اے فرسٹ ڈویژن سے پاس کر لیا اب اس کے دماغ میں مقابلے کے امتحان کی دھن سمائی گرو نے اسے بہت سمجھایا مگر اس کی ضد تھی کہ کچھ سوچتی ہی نہ تھی اس نے اپنی شناخت کو شبنم اور برقعے کی آڑ میں چھپالیا مگر کب تک امتحان کے دوران ایک امیر باپ کا بیٹا نقل کرتے پکڑا گیا اسے پرچہ لے کر باہر نکالدیا گیا وہ دھمکیاں دیتا چلا گیا چند منٹ کے بعد وہ غنڈوں سمیت آگیا اسلحہ کی نمائش اور مار پیٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا طلبا و طالبات چیختے چلاتے بھاگے اس افراتفری کے دوران شبنم کا برقعہ کہاں سے کہاں چلا گیا کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی اور پولیس نے اپنی ایفشنسی دکھائی اور مجرم کے بجائے باقی طلباء گرفتار کر لئے ان میں شبنم بھی تھی اس کا راز کھل چکا تھا۔ وہ اب مذاق کا نشانہ بن رہا تھا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد وہ گرو کے پاس آگیا تھا وہ بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔

ماہی آوے گا میں پھلاں نال دھرتی سجاواں گی انوں دل والے رنگلے پلنگ تے بٹھاواں گی جھلاں دی پکھیاں شبو فل میکپ میں ٹھک رہی تھی اور حاضرین اس پہ روپے وار رہے تھے جبکہ گرو کی آنکھوں میں خوشی اور غمی دونوں کے آنسو تھے۔ ہار کا دکھ اور لوٹنے کی خوشی۔

ختم شُد

یوں تو بہت خوبصورت ہو تم...
سب سے خوبصورت،
سب رنگ ہی تم پر اچھے لگتے ہیں،
مگر جاناں یہ جو سفید رنگ ہے ناں...
سب رنگوں سے انمول رنگ،
یہ تم پہ بہت کھلتا ہے.
اسے اوڑھ کر تم،
محاورتاً نہیں حقیقتاً پری لگتی ہو.
ایسا لگتا ہے تمہارے وجود کو پا کر،
اس سفید رنگ کی پاکیزگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے.
یہ رنگ اور بھی معتبر ہو گیا ہے.
(از قلم نادیہ خان بلوچ کوٹ ادو)

خوابوں کی تعبیر مل جاتی ہے
تعبیر میں اگر تم مل جاتے
محمد احمد ایمی
بکراری سی ہے اب مجھ۔۔۔۔ تمہارے
خیال جو آنے لگے ہیں
محمد احمد ایمی

ابھی امید باقی ہے

فاطمہ عبد الخالق

مسلمانان ہند آخر کیوں کر الگ مملکت کے قیام پر مصر تھے؟ اس کے پس منظر کیا اغراض و مقاصد پوشیدہ تھے؟ آخر کیونکر ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کی گئی؟ مقصد صرف اور صرف اسلام کی آبیاری کرنا تھا تاکہ مسلمان اپنی مذہبی و فکری آزادی میں زندگیاں بسر کر سکیں اور آنے والی نسلیں تازندگی اسلام کا جھنڈا بلند رکھیں۔ ہمارے آباؤاجداد کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نسل نو کو ہندوانہ رنگ پروان چڑھائے اور وہ ان رنگارنگی میں دو رنگے بن جائیں۔ مگر آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں وہ اسلاف کے اندیشوں کو سچ کا پیراہن پہنانے کے مترادف ہے
گزرے وقتوں کی بات ہے کہ ہم صرف مسلمان اور مومن ہوا کرتے تھے اور آپس میں بھائی بھائی تھے مگر پھر خود غرضی کے بادل چھا گئے۔ بے حسی کی کالی گھٹائیں چاروں طرف پھیلنے لگیں اور غرور و تکبر کی آندھی چلی جو ہمارا بہت کچھ ساتھ لے گئی مگر جاتے جاتے ذات پات اور رنگ و نسل کی گرد چھوڑ گئی۔ ہمارا فرض تو یہ تھا اس گرد کو صاف کر کے اپنے آپ کو پاک کرتے مگر ہم نے اپنی اوقات بھول کر دوسروں کو نیچ ذات کہنا شروع کر دیا۔ دل آزاری کرنا ہمارا مقصد اول بن گیا اور ہم کالے دلوں کو ظاہر کی خوشبو سے چھپانے لگے۔ جب کوئی اچھائی کا پرچم لہراتا اسے دبا دیا جاتا اور اس ایک گرد نے بہت سی دیگر بیماریوں کو جنم دیا جس سے بیمار معاشرہ وجود میں آیا۔ کچھ لوگوں نے اس بیماری کو دور کرنے کے لیے معالج قران کریم کو دیکھا کیا سنتے ہیں وہ کہتا ہے کہ اللہ کے ہاں تو تم صرف تقوٰی سے پہچانے جاؤ گے۔ لوگوں نے معالج کی ہدایت پر عمل شروع کیا ہی تھا کہ آندھی پھر سے چلی آئی۔ اک نئی گندگی پھیلانے اس بار اس نے پہلے سے بڑی ضرب لگائی اور لوگوں کے
دلوں میں اس بات کا فتور پیدا کر دیا کہ وہ سب سے زیادہ متقی ہیں۔ باقی سب گئے گزرے ہیں اس سے اسلام دشمنوں نے بھی فائدہ اٹھانا اپنا حق سمجھا اور آ گئے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر منافقت کی چھاؤں میں بیٹھ کو گمراہی کو مسلمانوں میں پھیلنے کی دعوت دینے۔ گمراہی اپنے پنکھ پھیلائے آئی اور ابھی ایک بیماری سے تندرستی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ فرقوں کی بیماری نے روح کی پاکیزگی کو چاٹنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً مسلمان

ہی مسلمان کو کافر کہنے لگا گمراہی نے خوشی خوشی راج دھانی قائم کرنا شروع کی اور اچھائی کے لبادے اوڑھ کر گمراہی کے رستوں پر لے جانے لگی۔ پھر زمین کے جس ٹکڑے کو محبتوں کا جہاں بننا تھا وہاں نفرتوں کی بارش ہوئی، بے حسی کے کانٹے اگنے لگے ابھی ہم اس بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہے تھے کے آندھی پھر سے چلی آئی۔ اب کی بار اس نے سیاسی گرد اچھالی تھی اور اس گرد نے ایک ایسا جہاں بنا دیا جہاں ہر شخص دوسرے شخص پر انگلی اٹھانے لگا۔ گالم گلوچ نے بھی پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا۔ تہمتوں کا بازار سجنے لگا اسلام دشمنوں نے فائدہ اٹھایا اور حکمرانوں کے گھٹیا خاکے بنائے تاکہ لوگوں میں غیض و غضب کی چنگاری لگائے جو ایسی آگ پیدا کر سکے کہ سب کچھ جلا کر راکھ کر دے فسادات کا جہان آباد ہونے لگا۔

اور یہ جہاں دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے اے میری پیاری قوم کے پیارے لوگو خدارا اس جہاں کی اصلیت جانو اور آؤ مل کر اس آندھی کا مقابلہ کریں اس سے پہلے کہ یہ آندھی طوفان کی شکل اختیار کرے اسکا خاتمہ کریں اور محبتوں کا ایک ایسا جہاں آباد کریں جہاں احساس کی حکمرانی ہو مروت کے بادل چھائیں آئیں مل کر قدم بڑھائیں اور گمراہی کی جڑیں کاٹ پھینکیں تاکہ سچائی اور اچھائی کا غلبہ ہو اور وہ وقت دور نہیں جب ہم غلبہ حاصل کریں گے کیونکہ اللہ تبارک و تعالی کا فرمان ہے کہ میری رحمت سے ناامید نہ ہو۔

☆ختم شُد☆

آزادی

ہمارے نوجوانوں نے

ہمارے لیے اپنا آپ قربان کیا

اور ہم لوگ

ہم لوگوں نے

ان کی قربانیوں کو یوں ہی برباد کر رہے ہیں

ہمیں چاہی ہے کہ

ہم مل کر خود اپنا وطن اپنے پاکستان کو اچھا اور صاف

بنائیں

اور خود کو آزاد کرائے

ہمیں مک کر دہشت گردوں کا مل کر سامنا کرنا چاہی ہے

ہم سب ایک ہی ہے

نا کوئی

سندھی، ناپنجابی ہے، نا بلوچستان اور نا ہی کوئی سرحد کا ہے

ہم سب صرف پاکستانی ہیں

آزادی ہمارا حق ہے

ہمیں بھی اپنا آپ قربان کرنا چاہیے ہے

جنہوں نے ہمیں آزاد کیا ہے

ہمیں بھی ان کی راہ پر گامزن ہونا چاہیے ہے

آمنہ غفور

اس نے گیلے بالوں کو کنگھے سے سلجھایا اور چوٹی بنا کر پشت پہ ڈالی۔ یکایک اس کی نظر سامنے ماتھے سے ہوتی ہوئی کنپٹی کے پاس چمکتے ہوئے چاندی کے دو تاروں پہ پڑی، ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ ان کی طرف ہو گئی اور ماتھے پہ سلوٹیں آ گئیں، اس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا اس کے چہرے پہ ایک تناؤ سا پیدا ہوا ابھی وہ آئینے میں نظر آنے والے وقت کے داؤ پیچ سے نبرد آزما تھی کہ ایک کرخت سی آواز نے اسے چونکا دیا

۔اب کتنی دیر اور لگے گی مہارانی کو تیار ہونے میں، غضب خدا کا جوان جہان لڑکیاں بھلا اتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی بھلی لگتیں کیا؟ بیلا نے ناگواری کے احساس کے ساتھ آواز لگائی آ رہی ہوں اماں۔

لو بھلا ابھی تیرے باوا آتے ہوں گے، جا جلدی سے دال بگھار لے اور روٹی ڈال لے میں میں ذرا سعیدہ کا پتہ کر آؤں کل سے بخار میں پڑی ہے، اماں نے چادر اوڑھتے ہوئے دروازے کی سمت قدم بڑھائے۔ اس نے دال کو بگھار لگا کر ۔آنگن میں چارپائیاں بچھائیں، کسی کے قدموں کی آہٹ نے اسے چوکنا کر دیا اس نے دوپٹے کو سر پہ جمایا اور دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت پہ پہنچ کر اس نے برابر والی دیوار میں سے دو اینٹیں نکالیں اور متجسس نگاہیں دوسری طرف جما دیں۔ عاشر نے کمرے کا تالا کھولا اپنا سامان اندر رکھ کر ایک کرسی لے کے چھت کے صحن پہ براجمان ہو گیا سامنے میز پہ ٹانگیں رکھے ایک کتاب کے مطالعے میں غرق ہو گیا، مگر عجیب سی بے چینی اس کی توجہ میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی اسے لگا اسے کوئی دیکھ رہا ہے اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اونچی دیواروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ مگر کچھ تھا مگر کہاں؟ اچانک اسے ہلکے سے چھینک کی آواز آئی جیسے کسی نے منہ دبا کے روک لی ہو وہ چونکا اور کھڑا ہو گیا اسی لمحے دروازہ بجنے اور دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ کوئی ساتھ والے گھر کی سیڑھیاں پھلانگ کے اتر رہا تھا یکایک دھڑام کی آواز آئی اور ہائے میں مری کی ہلکی سی آواز۔ دروازے کی

دھڑ دھڑاہٹ بڑھ گئی وہ متجسس ہو کر دیوار کے قریب آ گیا دیوار کافی اونچی تھی ایڑیاں اونچی کر کے اس ایک دھانی لباس میں ملبوس لڑکی لنگڑاتے ہوئے دروازے تک جاتی دکھائی دی اس کی طرف اس کی پشت تھی وہ محض لمبے ناگن کی طرح لہراتے بالوں کی جھلک ہی دیکھ پایا، ایک خاتون اندر داخل ہوئیں وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اس کی نظر دیوار سے نکلی دو اینٹوں پہ پڑی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی دیکھنے کا معمہ حل ہو چکا تھا۔

اس کے ہاتھ تو کام میں مصروف تھے مگر اس اس کا ذہن کہیں اور سفر کر رہا تھا۔ اماں نے بغور اس کا جائزہ لیا کپڑوں کا ڈھیر سامنے رکھے ایک ہی قمیض پہ مسلسل صابن رگڑے جا رہی تھی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیے خود ہی مسکرائے جا رہی تھی۔ اماں اس کی حالت دیکھ کر کھنکاریں، مگر بیلا کی کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا گویا وہ موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھی۔ اری کمبخت قمیص کو پھاڑے گی کیا آدھی صابن کی ٹکیا رگڑ ڈالی اس پہ، ایک دھاڑ کے ساتھ ایک جوتا بھی آ کر اس کی پسلی میں لگا۔ آں ہاں وہ اپنی خواب کی حالت سے جاگی اور ہڑبڑا کر قمیص پانی کے ٹب میں ڈال دیا۔ اور باقی کپڑے تیزی سے دھونے لگی۔ بیلا کے ابا سو گئے کیا؟ اماں نے ساتھ والی چارپائی پہ لیٹے احمد علی کو پکارا۔ نہیں کیا بات ہے؟ احمد علی نے کروٹ بدلی اور فاطمہ بیگم کی طرف منہ کر لیا۔ بیلا کی عمر

میری دعا ہے کہ سدا
تو مسکراتا رہے
خدا تجھے وہ سکون مسکان عطا کرے
تیری مسکان سے تیری روح بھی شرشار رہے
تو اک پل بھی کبھی اداس نہ ہو
تیری روح میں شامل کوئی ملال نہ ہو
تیری مسکان میں شامل کوئی اداسی کی لہر نہ ہو
تیرا ہر دن سورج کی کرنوں کی طرح روشن رہے
تیرے نصیب کا ستارہ ہمیشہ جگمگاتا رہے
خدا تیری نصیب اتنا بلند اتنا روشن لکھے
بس تو صدا مسکراتا رہے
کوئی دکھ نہ کبھی تیرے پاس آئے
تیرے نصیب میں کوئی زوال نہ ہون
تو آسمان پر تاروں کی طرح جگمگاتا رہے
ہمیشہ کامیابیاں تیرے قدم چومے
ہر ایک دل کی دھڑکن پر تو راج کرے
خدا ہر خواہش تیری پوری کرے
جب بھی تو رب سے کوئی دعا کرے
میرے رب تجھ کو وہ عطا کرے
کوئی بھی دعا تیری کبھی رد نہ ہو
تیری زیست میں شامل کوئی دکھ نہ ہو
تو شاد رہے آباد رہے تیری رہگزر پھولوں سے سجی رہے
اللھم امین

از قلم شازیہ کریم

نکلی جارہی اس سال پورے چھبیس کی ہو جائے گی۔ کہیں رشتے کی بات چلاؤ۔ اماں نے سر گوشی میں کہا۔ جب کہ ایک طرف سوتی بن کے لیٹی بیلا کے کانوں میں گویا تمام حسیات سمٹ آئیں۔ ہمم میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا کل رفیق آیا تھا میرے دفتر اس نے اپنے تایا کے بیٹے کا ہاتھ مانگا ہے۔ احمد علی نے سیدھے ہو کر اٹھتے ہوئے کہا، اچھا کیسا ہے لڑکا اور کیا کرتا ہے ؟گھر میں کون کون ہیں؟ کتنا کماتا ہے؟ اماں کو گویا ایک ڈھارس ملی اور اسنے بے چینی سے پوچھا۔ اری بھلی مانس دم تو لے۔ وہ انکم ٹیکس کے محکمے میں چپڑ اسی ہے اپنا گھر ہے دو بہنیں بیاہی ہوئی ہیں ایک بھائی ابھی کالج میں پڑھ رہا ہے ماں ہے باپ پچھلے برس گذر گیا دس مرلے کا مکان اور اپنی موٹر سائیکل ہے، پر۔۔۔۔۔۔۔۔ پر کیا؟ بیلا کے ابا سب ٹھیک ہے تم ہاں کر دو لڑکا دیکھا ہے تم نے؟ اماں نے ایسی تیزی سے کہا کہ جیسے رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اب احمد علی کی پر انہیں کھل رہی تھی۔ احمد علی نے ایک نظر سوئی بیلا پہ ڈالی اور مطمئن ہو کر آہستگی سے بولے پر رنڈوا ہے کماتا خوب ہے پہلی بیوی تین سال قبل فوت ہو گئی ایک بچی ہے چار سال کی ۔ہادوہاجو ہے اماں کے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ پر بیلا کے ابا بیلا بھی کم عمر نہیں رہ گئی اتنے سالوں میں جو رشتے آئے کبھی جہیز اور کبھی کم صورتی کی نظر ہو گئے جوان بچی ہے کل کلاں کو خدا نہ کرے۔۔۔ باقی بات وہ دبا گئیں دوپہر کا منظر آنکھوں میں آبسا۔ اچھا پھر کہتا ہوں کل رفیق سے لے آئے ان لوگوں کو۔ احمد علی نے گہری سانس بھری۔ بیلا نے گویا سانس روک کے ماں باپ کی گفتگو سنی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے عاشر کا خوبصورت سراپا جسے وہ دو دن سے خوابوں میں ساتھ لیے تھی چھناکے سے چکنا چور ہو گیا،۔ انسانی زندگی بھی بہت عجیب شئے ہے ہمیشہ نئے روابط اور رشتوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ آدم وحوا کے مابین یہ برسوں سے ہوتا آیا ہے۔ قدرت نے دونوں کی فطرت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش پیدا کی ہے کہ نظروں کا تصادم تو دور کی بات موجودگی ہی کچھ ایسے احساس پیدا کر دیتی ہے کہ متوجہ ہونا لازم ہو جاتا ہے، بیلا اماں ابا کی گفتگو سن چکی تھی۔ ایک لحاظ سے اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ پی کے گھر سدھارنے والی ہے۔ مگر برا ہو اس دل و دماغ کا جس پہ دس دن سے عاشر سوار تھا ۔ دوہاجو اور ایک بچی کا سن کے ویسے ہی اس پہ ناگواری چھا گئی ۔ اس کے کورے جذبے اس کی طرح کورے جذبوں کے متلاشی تھے مگر ماں باپ کے سامنے دستِ سوال اور خود سری اس کی فطرت میں نہ تھی اسے اپنے ماں باپ سے بھی محبت تھی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے کی کشمکش نے اسے ادھ موا کر دیا۔ بہت سوچنے کے بود اس نے عاشر سے بات کرنے کا سوچا، اپنے دل کو مطمئن کرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔ بیلا بیٹا آج اچھے سے صفائی کرنا شام کو کچھ

مہمان آنے ہیں۔ اماں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور سن وہ اپنا گلابی سوٹ بھی بکسے سے نکال کے استری کر لے۔ سمجھ گئی نا میری بات ۔۔جی اماں بیلا نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ خوش رہ ماں کے لہجے میں پیار اور خوشی کے آنسو سمٹ آئے۔ بیلا نے سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔ کیا وہ ان کی خوشی کو دکھ میں بدل پائے گی۔؟ نہیں دماغ نے دہائی دی میں اپنی ماں کو دکھی نہیں کر سکتی، مگر عاشر تمھاری محبت دل نے واویلا مچایا؟ اس نے ایک نظر پھر ماں کے چمکتے ہوئے چہرے پہ ڈالی پل بھر میں فیصلہ ہو گیا ماں کی محبت جیت گئی اور دل ہار گیا۔ اس نے سب کچھ تیار کر کے رکھا۔ بریانی دم پہ رکھ کے باتھ روم گھس گئی۔ پانی کی تیز پھوار میں اس نے اپنے جذبات اور آنسو بہا ڈالے وہ ہر گز اپنی نئی زندگی کسی پچھتاوے سے شروع نہ کرے گی، دل کا بوجھ اترا تو شگفتگی در آئی اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا ۔ماں کی ہدایت پہ سادہ سا ہار سنگھار بھی اسے خاص بنا گیا ۔صورت شکل تو خدا کی دین ہے اس کا شمار بہت خوبصورت نہ سہی مگر اتنا گئے گذروں میں بھی نہ ہوتا تھا البتہ اس کے گھنے دراز بال بہت خوب صورت تھے۔ اماں نے اسے دیکھا تو بلائیں لیں ابا نے سر پہ ہاتھ رکھا۔ شاید یہی موقع ہوتا ہے جب جنم دینے والے اپنے جگر گوشے کو دعا کے ساتھ خود سے جدا کرتے ہیں اس امید پہ کہ ان کی بیٹی جیسے ان کی

آنکھوں کا تارا اور دل کی ٹھنڈک ہے ویسے ہی پرائے گھر جا کر خوش رہے گی۔ مگر کاتبِ تقدیر کا قلم کیا لکھ چکا وہ اس سے بے خبر رہتے۔ رفیق میاں کے ساتھ ہی سب مہماں بیٹھک میں بیٹھے تھے، سعادت علی اس کی والدہ اور چار سالہ غازیہ ۔کچھ دیر بعد اماں اسے بلانے آئیں وہ جھجکتی ہوئی اندر آئی ہولے سے سلام کر کے اماں کے پاس بیٹھنے لگی تو اس کی ہونے والی ساس نے بہت محبت سے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا انہیں یہ سادہ سی لڑکی بہت بھائی۔ سعادت علی نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کا جھکی ہوئی آنکھیں۔ لمبے سیاہ کمر سے نیچے تک لہراتے بالوں نے گویا اسے سحر میں جکڑ لیا اس نے کبھی کسی کے اتنے لمبے بال نہ دیکھے تھے اس کی نظروں میں ستائش تھی۔ پاپا یہ تون ہیں ؟غازیہ نے اسے دیکھتے ہوئے توتلی زنان میں پوچھا۔ اس نے ایک نظر اس بچی پہ ڈالی بہت معصوم بچی تھی خوبصورت سفید فراک میں سفید پونیاں ہلاتھ ہوئے باپ کی گود میں بیٹھی اپنا ننھا سا ہاتھ باپ کے گال پہ رکھے پوچھ رہی تھی سعادت علی گڑبڑا گیا۔ میری جاں یہ تمھاری مما ہیں۔ بڑی بی نے بہت لاڈ سے بیلا کے سر پہ ہاتھ رکھ کے جواب دیا۔ اماں ابا نے گھبرا کر بیلا کا دیکھا مگر وہاں کوئی تاثر نہ پا کر مطمئن ہو کر ایک دوجے کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی۔ گویا ایک مرحلہ حل ہو گیا۔ بات پکی ہو گئی ایک ماہ بعد شادی ٹھہرادی

گئی۔ وقت کم تھا اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے ساتھ وہ ابا کے بھی چھلائے دے رہی تھی۔ آہے آئے آپ دفتر سے چھٹی کیوں نہیں لے لیتے، سامان سے لدی پسینے میں شرابور ہانپتی کانپتی آ کے وہ چارپائی پہ ڈھیر ہو گئیں احمد علی جو ابھی آفس سے آئے تھے ان کی فرمائش پہ ہنس دیئے اچھا بھئی کل دیتا ہوں درخواست۔ اماں اسے پیٹی میں پڑی رضائیوں کو دھوپ لگوانے کا کہہ کے سعیدہ خالہ کے ساتھ بازار کو چل دیں۔ تُس نے سب رضائیاں ایک ایک کر کے چھت پہ جا رکھیں اور ستانے کے لئے بیٹھ گئی۔ اس کی نظر دیوار پہ پڑی جہاں سے اس دن اس نے عاشر کو دیکھنے کے لیے اینٹیں نکالیں تھیں اور اماں کی آمد پہ واپس لگانا بھول گئی آج وہ پندرہ دن کے بعد چھت پہ آئی تھی۔ ناچاہتے ہوئے بھی اس نے دوسری طرف جھانکا مگر سامنے کوئی دکھائی نہ دیا۔ مگر چھت پہ بنے کمرے سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی سامان باندھ رہا ہو۔ اس نے دوبارہ نظر ڈالی تو اس کی آنکھوں کے سامنے دو بھوری آنکھیں آ لگیں ادھر عاشر تھا۔ وہ ایک لمحہ گویا منجمد ہو گیا ایک کی آنکھوں میں تحیر تھا تو دوسرے کی میں شرارت۔ سنو آئی لو یو عاشر کی آواز اس کی آنکھوں سے پھوٹتی سنائی دی وہ ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ پائے بس نگاہوں کے تصادم نے فسوں پھونک کے مسمرائز کر دیا۔

(جاری ہے)

میرا وطن

خدا سرسبز رکھے میرے وطن کو
تو ہمیشہ مہرباں رہے میرے وطن پر
بہاروں کا سماں رہے میرے وطن میں
پریشان ہو ہو نا دشمنوں کی شازشوں سے
کہ خود خالق رحمن ہے اسکی حفاظت میں
تم ہمیشہ کمربستہ رہنا اسکی حفاظت میں
کہ یہ حق ہے تم پر میرے وطن کا
یہ ہے ہمارے بزرگوں کی انتھک محنتوں کا ثمر
اسکی مٹی میں شامل ہے لہو انکا
اقبال کا خواب تھا میرا وطن
قائد نے جس کو پورا کیا
جو ہیں میرے وطن پر بری نظر رکھنے والے
مٹا دیں گے تم کو حق پر چلنے والے
جو ہیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ماننے والے
نشاں ہے ہلا میرے وطن کا
ہے پرچم سفید و سبز میرے وطن کا
جسکی پہچان ہے سلامتی
امن کا گہوارہ ہے میرا وطن
جسکی فضا میں پھیلی ہے یہ دعا
چراغ لالہ سے روشن ہو میرا وطن
آ رہا ہے یوم پاکستان کا دن میرے وطن کی فضا میں پھر سے
صدائے نغمہ یہ گونج رہا ہے
خدا سرسبز رکھے میرے وطن کو
زبان برگ نے گل کیا ہر اک نے یہ دعا کی ہے

از قلم شازیہ کریم

میرا گھر

ربیعہ امجد

آج کا دن بہت خاص تھا اج اس کی بچپن کی خواہش پوری ہو گئی تھی کتنی دعائیں مانگیں تھیں اس نے اور آج وہ ساری دعائیں قبولیت کا شرف حاصل کر چکیں تھیں خوشی اس کے انگ انگ سے روشن کرنوں کی طرح پھوٹ رہی تھی اس کا دل کر رہا تھا زور زور سے ہنسے اور چلا چلا کہ سب کو بتایے کہ دیکھو آج مجھے گھر مل گیا میرا گھر جس میں ہر طرف صرف میری حکمرانی ہو گی ہر چیز میری پسند کی ہو گی جہاں میں اپنی مرضی سے سو سکوں گی اٹھ سکوں گی کوئی مجھے منع نہیں کرے گا کہ یہ کام مت کرو یہ کام مت کرو کیونکہ وہ میرا گھر ہو گا صرف۔

☆ ☆ ☆

شمع چلو ہم اپنا گھر بناتے ہیں، جس میں ہم اپنی مرضی کی سٹنگ کریں گے اور اپنی مرضی سے کمرے بھی سجاہیں گے اور ہم کسی کو اپنے کمرے میں داخل بھی نہی ہونے دیں گے اور نا ہی کسی دوسرے کو اپنی چیزوں کو ہاتھ لگانے دیں گے جیسے میری بھابھی کرتی ہیں وہ بھی مجھے اپنے کمرے میں نہی جانے دیتی کہ میں ان کی چیزوں کو خراب نا کر دوں، اس نے ریت کو اکٹھا کرتے ہویے کہا تو شمع نے بھی سر ہلا۔ وہ دونوں ریت سے گھر بنانے لگیں مگر وہ بار بار گر کر زمین بوس ہو جاتا۔ اب ہم کیسے گھر بنایں گی اور کہاں رہیں گی، وہ تقریباً روہانسی ہو رہی تھی۔ ہم اپنے اصلی گھر جا کہ رہیں گے، شمع نے ہاتھ صاف کرتے ہویے کہا تو وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی، اصلی گھر، یہ کونسا گھر۔ میری امی کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو اصلی گھر شادی کے بعد ملتا وہ ان کا اپنا گھر ہوتا اور وہاں وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں ان کو کویی منع بھی نہی کرتا، شمع نے بتایا تو اس کی انکھوں میں جگنو چمکنے لگے چہرے پر خوشی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ سچ، وہ خوشی سے۔ ہاں سچ، شمع نے کہا تو دونوں کھکھلا کر ہنس پڑیں

☆ ☆ ☆

آج اس کی شادی تھی وہ بہت خوش تھی کہ وہ اپنے گھر جا رہی ہے ماں باپ سے بچھڑنے کہ غم پر بھی اپنے گھر کو پانے کی خوشی حاوی ہو گئی تھی۔ اس نے شادی کے ایک ہفتے بعد ہی ایک دن سارے گھر کی سٹنگ تبدیل کر دی ہر چیز اپنی پسند سے رکھی وہ آج بہت خوش تھی بچپن کے خواب کو تعبیر مل گئی۔ اس کی نند گھر ائی تو اتنی تبدیلی دیکھ کر حیران رہ گئی اور پھر غصے سے اس کے کمرے میں گئی، بھابھی اپ نے گھر میں چیزوں کو ادھر ادھر رکھا کس سے پوچھ کہ کیا آپ نے یہ سب، وہ شعلے برساتی نظروں سے دیکھتے ہوئی پوچھ رہی تھی میں نے کیا، اس نے چور لہجے میں کہا کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا، اپ کی اتنی ہمت کہ اپ نے میرے گھر میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں کی ہیں، ایسے جو نچلے اپنے گھر میں کرنے تھے یہ میرا گھر ہے اور یہاں میری مرضی چلے گی سمجھی اپ، وہ اپنی بات کہہ کہ جیسے ائی تھی ویسے ہی اندھی طوفان کی طوح چلی گیی، وہ کمرے کے بیچ کھڑی حیران پریشان پر سب دیکھتی رہی۔ اگلے دن سب کچھ بلکل پہلے جیسا ہو گیا ہر چیز اپنے پہلے ٹھکانے پہ واپس چلی۔ شمع تو کہتی تھی کہ یہ گھر میرا ہو گا مگر یہ تو کرن (نند) کا ہے تو پھر میرا کہاں ہے تو کیا میرا کوئی گھر نہیں، وہ زمین پہ بیٹھتی چلی گیی اور انسو گالوں پر کسی بہتی ندی کی طرح رواں دواں ہو

☆ ☆ ☆

تکلیف

سنو جاناں وقت رخصت
کہتا تھا تم نے
میرا انتظار کرنا
میں لوٹ آؤں گا
تمہارے ان لفظوں کو
سنبھالا تھا میں نے
متاع جان کی طرح
کیا تھا بہت انتظار
لوٹ کے نہ آئے تم
سبھی قسمیں
سبھی وعدے
جو بھول بیٹھے تم
تو سنو جاناں
اب لوٹ آنے کا تکلیف نہ کرنا
کہ جو مل کہ دیکھے تھے
خواب
وہ بیچ ڈالے ہیں
میں نے
عمر بھر کی سسکیوں کے عوض

شاعرہ حلیمہ وحید (کلر سیداں)

ماں میں پردیسی جھوٹا ہوں

شہزاد سلطان کیف

دن بھر کی تھکن کام کا بوجھ گھر کی ذمہ داریاں حالات کی سنگینیاں سب سر پر لے کر شام کو گھر آتا ہوں تو تھکے ہارے جسم کے ساتھ تکیے سے ٹیک لگائے سوچوں میں گم ہو جاتا ہوں. تب پیاری ماں آپکی اور اپنے پیاروں کی بہت یاد آتی ہے پھر کیا ہے اپنوں سے دل بہلانے کو دل کرتا ہے فون نکال کے ایک گھر کال ملالی جاتی ہے. کال کیا ملی دل کی دھڑکن بھی تیز ہو گئی دل و دماغ سے ایک ہی آواز نکلی اللہ خیر کرے ہر دم خیر کرے اپنوں کی خیر کرے. خیر کی خبر آئے. ہیروں سے بھی قیمتی پھولوں سے بھی تازہ رب نے جس کے قدموں میں جنت رکھی ہے سائنسی تحقیق نے جس کی آواز میں ٹینشن کی شفا رکھی ہے وہ آواز ہے میری پیاری ماں ہم سب کی پیاری ماں. کال اٹینڈ ہوئی تو پیاری ماں نے آگے سے کہا اسلام و علیکم! میں پردیسی نے کہا وعلیکم اسلام. مجھ پہ دنیا کی رحمتیں برس گئیں جنت سے مجھ پہ سلامتی اتر آئی. بسمہ اللہ کر اں میرا بیٹا کیسا ہے. جی ماں جی میں ٹھیک ہوں بیٹا صحت کیسی ہے ماں جی میں بلکل ٹھیک ہوں بیٹا تو کام میں تھک جاتا ہو گا. نہیں ماں جی کام کی تھکاوٹ کیسی سب ٹھیک ہے ماں جی آپ فکر مت کرنا. بیٹا کوئی ہلکا پھلکا کام کر لینا مشکل کام مت کرنا جی ماں جی. ہاں یاد آیا پچھلے دنوں بیمار ہوے تھے اب کیسے ہو. ماں جی میں بلکل ٹھیک ہوں کہانا آپ فکر مت کرنا بیٹا تیرے منی اور منا بھی ٹھیک ہیں دونوں بہت باتونی ہیں پاپا پاپا کرتے ہیں تجھے روز بلاتے ہیں باقی گھر والے بھی ٹھیک ہیں بیٹا دل گھبر ایا ہے تو چھوڑ زیادہ پیسوں کو بس ایک مہینہ ہی چھٹی آجا. نہیں ماں جی اب دل نہیں گھبر اتا آوں گا جلد آوں گا ماں جی آپکو پتہ ہے کچھ ذمہ داریاں ہیں اتر جائیں تو آجاوں گا بیٹا فکر مت کر سب ٹھیک ہو گا اللہ خیر کرے گا ہاں ماں جی اللہ خیر کرے گا میرے جیسے لاکھوں کروڑوں ماوں کے لعل اصولِ رزق کے لیے

آئے ہیں بھلا گھبرانا کیسا. ماں جی آپ کی صحت کیسی ہے بیٹا میں ٹھیک ہوں کبھی کبھی سانس روکنے لگتی ہے بس کبھی جسم تھک جاتا ہے ابھی نظر کمزور پڑ گئی ہے بیٹا میں ٹھیک ہوں معدہ غذا ہضم نہیں کرتا پر ٹھیک ہوں ماں کے لرزتے ہونٹ ناکہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتے ہیں. میرے بیٹے میرے لعل تمہارے ابو بیوی بچے بہن بھائی بھی ٹھیک ہیں میرے بیٹے تمہارے بہت پیسے لگ رہے ہوں گے جا بیٹا اللہ تجھے خوشیاں دے تجھے کامیابیاں دے. اللہ حافظ بیٹا اللہ تیری حفاظت کرے (آمین) جیسے ہی فون بند ہوا مجھ پہ خوشی و غم کے بادل امڈ آئے آنکھوں سے آنسوؤں کی جڑی لگ گئی خوشی ایسی کہ ماں نے میرے لیے دعاوں کے ڈھیر لگا دیے. غم ایسا کہ ماں جی سے فون بند ہونے سے رابطہ ٹوٹ گیا. ماں جی اللہ آپکو سلامت رکھے ماں جی میں جھوٹا ہوں جھوٹا ہوں ہاں میں جھوٹا ہوں ماں جی جو حوصلہ دیا ہے جو بھی بات کی سب جھوٹی ہیں بس سوچتا ہوں آپکا دل نہ دکھے. مائیں اولاد کے معاملے میں نازک ہوتی ہیں ہر بات پہ آپکو حوصلہ دیا ہے. پر ماں جی میں جھوٹا ہوں میری صحت ٹھیک نہیں رہتی تھک جاتا ہوں اکثر بیمار رہتا ہوں ہلکا پھلکا کام بس بہانا ہے یہاں جان نہیں کام پیارا ہے ماں جی اپنوں کی بہت یاد آتی ہے منی منا اکثر یاد آتے ہیں انکی توتلی باتیں انکی شرارتیں گھر کا ہر فرد یاد آتا ہے پردیس مجھے زہر لگتا ہے چھٹی کمپنی اپنی مرضی سے دیتی ہے. صحت ٹھیک کام ہلکا پھلکا دل نہیں گھبراتا ماں جی یہ سب جھوٹ ہے سب جھوٹ ہے پر ماں جی اتنے جھوٹ بولنے سے آپ خوش رہیں آپکا دل نا دکھے تو میں ایسے ہزاروں جھوٹ بولوں گا.. میرا یہ قول.. ماں محبتوں کا وہ موسم ہے جس میں کبھی خزاں نہیں آتی.. اللہ سب کی ماوں کو سلامت رکھے

☆ ☆ ☆

*میرا بہترین دوست کوئی بھی نہیں ہے سب مطلب کے دوست ہوتے ہیں کام کوئی نہیں آتا۔ (ثوبیہ حسین، کہوٹہ)

*کئی دوست ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف دولت کے لیے دوستی کرتے ہیں اپنے آپ کو وہ بہترین دوست کہتے ہیں مگر جب پیسے نہ ملیں وہی دوستی جس پر ناز کیا جاتا ہے صرف پیسے کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ (محمد افتاب شاد، کوٹ ملکہ دو کوٹہ)

*میرا بہترین دوست محمد اعجاز گوندل ہے جو بہت اچھا اور نیک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو بہترین دوست دے آمین (ممریز بشیر گوندل۔ گوجرہ)

*میرا بہترین دوست عمر دراز فیصل آباد والے ہیں جو بہت اچھے دوست ہیں اور ان کی دوستی پر مجھے فخر ہے اللہ سب کو ایسے دوست دے اور میرے دوست کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آمین (عمران بلوچ، جب ڈیم)

ظرف

ثمینہ طاہر بٹ

"معاف کر دو چوہدرانی جی! اللہ کا واسطہ ھے معاف کر دو اس نمانی کو۔ غلطی ھو گئی اس سے۔ پہلی اور آخری بار بخش دو جی اسکو۔ آج کے بعد یہ آپکو حویلی کے آس پاس بھی نظر نہیں آئے گی جی۔ رب کا واسطہ، میری دھی کو ایک بار معافی دے دیو جی!" چوہدرانی جی کا غیض وغضب سے برا حال تھا۔ انکا مزاج تو ویسے ھی ھمیشہ سوا نیزے پر ھی رہتا تھا، مگر اس وقت تو انکا غصہ اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا، اور انکے اس جلال کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بری طرح سے پٹتی رانی کو انکے چنگل سے چھڑا پائے۔ "سمجھا لے اس کو شیداں!! اپنی اوقات مت بھولے۔ میں پوچھتی ھوں ہمت کیسے ھوئی اس خرانخور کی میری پوتی کا مقابلہ کرنے کی؟؟ اونہہ؛؛ ذات دی کوڑھ کرلی تے شہتیراں نوں جپھے؛؛ کمذات کہیں کی۔!" چوہدرانی جی نے اپنے قدموں میں گری، بری طرح روتی بلکتی رانی کے پہلو میں ایک لات رسید کرتے ہوئے تنفر اور کروفر سے کہا تو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی یہ سب تماشہ دیکھتی ارم کا دل کانپ کر رہ گیا۔ سرخ اینٹوں سے بنی اس اونچی حویلی کی شان واقعی بہت اونچی تھی۔ آس پاس کے سات "پنڈوں" میں ایسی شاندار حویلی کسی کی نہیں تھی، اور ہوتی بھی کیسے؟ اس پورے علاقے میں چوہدری حشمت اور انکے آباؤاجداد کا ایک نام، ایک مقام تھا۔ چوہدری حشمت کے دو بیٹے اور ایک ہی بیٹی تھی۔ انہوں نے نئیے دور کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے تینوں بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انکے سب بچے خوب پڑھے لکھے، روشن خیال اور ویل سیٹلڈ تھے۔ چوہدری صاحب جتنے نرم دل اور حلیم طبیعت کے تھے، چوہدرائن اتنی سی اکھڑ مزاج، مغرور اور ضدی طبیعت کی مالک تھیں۔ چوہدری صاحب کے بڑے بیٹے چوہدری رحمت اللہ اور اکلوتی بیٹی یاسمین بلکل اپنے بابا کے

ھم مزاج تھے، انکی طرح ہی نرم دل اور غریبوں کے ھمدرد جبکہ درمیان والے صاحبزادے کچھ کچھ اپنی بے جی کا سا مزاج رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر ارم بھی اپنے دادا، بابا اور پھپھو کی کاپی تھی۔ نرم دل، صلح جو اور سب سے محبت کرنے والی۔ اسکی اور رانی کی دوستی بچپن سے ہی تھی، گو کہ وہ گاؤں دادا، دادی سے ملنے صرف چھٹیوں میں آپاتی تھی، مگر پھر بھی اُسے شروع سے ہی رانی کا ساتھ بہت اچھا لگتا تھا۔ دونوں کا بچپن بہت اچھا گذراتھا، ہنستے، کھیلتے۔ شیداں چوہدریوں کی پرانی خاندانی ملازمہ تھی۔ اسکے والدین بھی اپنے زمانے میں اسی حویلی کے وفادار نمکخوار تھے۔ شیداں کی شادی بھی بڑے چوہدری صاحب نے خود کروائی تھی۔ اکرم انکا بہت پرانا اور وفادار خاندانی ملازم تھا، اور انکی زمینوں کا منشی بھی۔ شیداں اور اکرم بھی اپنی خاندانی روائیت کو برقرار رکھتے ھوئے اس حویلی اور اسکے مکینوں کی دل وجان سے خدمت کی تھی۔ رانی شیداں کی اکلوتی نواسی تھی۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب اسکے والدین اور بہن بھائی ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے ناطہ توڑ گئیے تھے۔ اُس سال بارشیں کچھ معمول سے زیادہ ہی برس گئیں تھیں۔ جانے آسمان نے کس کس کا کون کونسا غم اور دکھ دیکھ لیا تھا کہ دن رات روتا ہی چلا گیا، اور دن رات برستے ان بادلوں نے جہاں اور بہت سے نقصانات کیئے، وہیں شیداں اور اکرم کے دل پر بھی شب خون مارا تھا۔ انکی اکوتی اور بڑی بیٹی کے سر پر بنی کچی، پکی چھت والا کوٹھا اُس چھاجوں برستے مینہہ کی تاب نہ لاتے ہوئے ڈھے گیا۔ اور یوں رانی کے ماں، باپ، بھائی، بہن ایکساتھ ہی ہمیشہ کی نیند جا سوئے۔ اب یہ رانی کی خوشقسمتی تھی یا اسکے نصیبوں کی ستم ظریفی کہ سب سے چھوٹی ہونے اور شدید زخمی ھونے کے باوجود بھی وہ بچ گئی، اور یوں شیداں اسے ہمیشہ کے لئیے اپنے پاس لے آئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

چوہدری حشمت اور انکے بیٹوں نے شہر میں اپنے بزنس سیٹ کر رکھے تھے۔ انکی شوگر مل کے علاوہ بھی کئی بزنس تھے۔ چوہدری رحمت اور چوہدری نعمت اللہ تو مستقل لاھور اور اسلام آباد میں ہی رہتے تھے۔ انکی کاروباری مصروفیات اور سوشل سرکل اس قدر وسیع تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ گاؤں جانے کا وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ بڑے چوہدری صاحب کا اپنا سرکل بھی بہت وسیع تھا، پھر بیٹوں اور دوستوں کی پرزور خواہش اور اصرار پر وہ سیاست میں بھی قدم رکھ چکے تھے، اس لئیے اب انکا بھی زیادہ تر وقت لاھور یا اسلام آباد میں ہی گذرتا تھا۔ انہوں نے کئی بار چوہدرائن کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی، مگر انکا وہاں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ انکے بیٹوں کے کئی کئی کنال پر پھیلے بنگلے اور ملازمین کی فوج ظفر موج کے باوجود بھی انکا وہاں دم گھٹتا تھا۔ وہ ان سوٹیڈ

بوٹیڈ (یونیفارمڈ) ملازموں پر نہ تو پوری طرح حکومت کر پاتی تھیں، اور نہ ہی وہ "میڈز اور بٹلرز، مسٹرز" انکی حکومت کو سمجھ پاتے تھے، اس لیئے وہ چند روز ہی بڑی مشکل سے اس شہری ماحول اور شہری بنگلوں میں گذار پاتیں اور پھر واپس اپنے گاؤں لوٹ جاتیں، اپنی راجدھانی میں۔ جہاں ان کے حکم کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ جہاں وہ "وڈی چوہدرانی جی" ہوتیں اور باقی سارا گاؤں انکا مزارع۔ کمی کمین، شوہدا، کم ذات۔ "بے جی-! آپ نے رانی کو اس بری طرح سے کیوں مارا؟؟ کیا ھو گیا اگر اس نے اپنے دل کی بات، اپنی خواہش کا اظہار میرے ساتھ کر دیا تھا تو، آخر وہ بھی انسان ھے، دل رکھتی ھے سینے میں؛ اور پھر میری بچپن کی سکھی ھے وہ۔ ھم ساتھ کھیلے، ساتھ پلے بڑھے ھیں بے جی۔ اگر میں اس سے اپنے دل کی ھر بات کر سکتی ھوں، اسے اپنے سارے خواب ساری خواہشات، سارے عزائم شیئر کر سکتی ھوں تو ایک دوست ھونے کے ناطے وہ بھی یہ حق رکھتی ھے کہ اپنی آنکھوں میں بسنے والے ھر خواب، ھر خواہش کا مجھ سے ذکر کرے۔ یہ ہی سچی دوستی ھے بے جی اور یہ ھی اس دوستی کی معراج۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں بے جی؟؟" "میں تو سب سمجھتی ھوں پتر؛ مگر تو کچھ نہیں سمجھتی۔ یہ کمی کمین، ان کو ایک فاصلے پر ہی رکھتے ھیں، انکی حیثیت پاؤں میں پہنے جوتے جیسی ہی ھوتی ھے، اور جوتیاں ہمیشہ پیروں میں اچھی لگتی ہیں سر پر نہیں رکھی جاتیں، مگر تمہیں میری بات کبھی سمجھ آئی ہی نہیں۔ تم کیا، تمہارے تو باپ دادا بھی آج تک مجھے نہیں سمجھ سکے۔ ان سے بھی میرا ہمیشہ سے یہ اختلاف رہا ھے۔ انہیں بھی تمہاری طرح ان غریبوں، ہاری مزدوروں کا درد بے چین رکھتا ھے۔ اگر میں نے اپنا رعب اور دبدبہ نہ رکھا ھوتا تو آج ہماری چوہدراہٹ، ھماری بادشاہت کہاں قائم رہنی تھی؟؟ ارے؛ یہ تو اللہ بخشے میرے ماں باپ نے ہمیشہ اپنے گاؤں اور گاؤں والوں پر حکومت کی۔ اور پھر ہمیں بھی یہ حکمرانی کے گر سکھا گئیے جو آج تک ہمارے کام آ رھے ہیں؛ ورنہ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ھے۔ ایک تمہارے دادا ہی کیا کم تھے ان کمی کمینوں کو سر چڑھانے کے لیئے کہ تمہارے بابا اور پھپھو نے بھی انکا ہی رنگ چرا لیا، اور اب رہتی کسر تم پوری کر لینا۔!" ارم کو شروع سے ہی بے جی کا گاؤں والوں اور خاص طور سے اپنے مزاروں کے ساتھ روا رکھا جانے والا روئیہ بیحد کھلتا تھا، تو بے جی کو بھی اسکی (بقول انکے) "چھوٹے لوگوں" خصوصا" رانی سے روز بروز بڑھتی دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اسی لیئے جیسے ہی ارم نے رانی پر انکے کیئے گیئے بیجا تشدد کے خلاف احتجاج بلند کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے بری طرح جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ارم ان کی باتیں سن کر ہمیشہ کی طرح دلبرداشتہ تو ھوئی، مگر انکے ادب کی وجہ سے خاموش ھو گئی۔

☆ ☆ ☆

"نانی!!رب سوھنے نے تو سارے انسان برابر بنائے ھیں، ایک ہی مٹی سے، ایک جیسی ہی روح پھونکی ھے سب کے اندر، پھر یہ چھوٹے بڑے کی تقسیم کس نے کی تھی؟؟رب سوھنا اور اسکا نبی پاک ﷺ تو کہتے ھیں کہ کسی انسان کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے ------تو پھر بے.جی ہمیں اتنا چھوٹا، اتنا کمتر کیوں سمجھتی ھیں؟؟ نانی؛نانا آپ نے اور آپکے پورے خاندان نے ہمیشہ اُنکی خدمت کی ھے، پھر بھی نانی --------پھر بھی بے.جی کی نظر میں ہماری ٹکے کی اوقات نہیں ھے۔ انکا جب دل چاہتا ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیتی ھیں۔ چھوٹی بی بی اگر میرے ساتھ محبت کرتی ھیں یا مجھے اپنی سکھی مانتی ھیں تو اس میں میرا کیا قصور؟؟ میں نے تو ان سے نہیں کہا تھا کہ میرے ساتھ بہناپا گانٹھیں؟؟ میری کیا اوقات کہ میں خود کو اُنکے برابر سمجھوں۔ میں اپنی حیثیت اچھی طرح جانتی ھوں نانی، پھر بھی ----------پھر بھی بے.جی نے ہمیشہ مجھے ذلیل کیا ھے۔ کمتر، کم حیثیت، کمی کمین نہ صرف سمجھا ھے بلکہ ھر دم اسکا احساس بھی دلوایا کہ ھم ان بڑے لوگوں کی جوتیوں میں رہنے کے ہی قابل ھیں، ھماری اوقات ہی یہ ھے کہ روز اُن سے ماریں کھائیں اور پھر بھی اُنہیں ہی جھک جھک کر سلام کریں۔ ایسا کیوں ھے نانی؟؟ آپکے تو بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی اِن حویلی والوں کی خدمت میں کمی آنے نہیں دی، کبھی اپنی وفاداریوں اور خلوص میں ملاوٹ نہیں کی تو پھر آج تک بے.جی مطمئین کیوں نہیں ھو پائیں؟؟ کیوں ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتی ھیں وہ؟؟" رانی کو اپنے جسم پر لگی چوٹوں میں اتنا درد محسوس نہیں ھو رہا تھا جتنا کہ چوہدرانی جی کے مُنہہ سے نکلنے والے الفاظ کے گھاؤ اُسے تڑپا رھے تھے جو اُسکے دل، اُسکی روح پر لگے تھے اور اُسے اِسطرح تڑپتے دیکھ کر اُسکے نانا، نانی، ماموں، مامی بھی خون کی آنسو رو رھے تھے، جنہوں نے اُسے اپنی ہتھیلی کے چھالے کی طرح پالا تھا۔ "

رانی پُتر!! تو مان یا نہ مان، غلطی تو تیری بھی ھے۔ چھوٹی بی بی اگر تجھے مان دیتی ھے، تیرے ساتھ محبت بھرا سلوک ترتی ھیں تو اسکا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ تو اِنکے برابر ھو گئی۔ وہ مالک ہیں ہمارے پُتر اور ھم اُنکے ملازم۔ مالک اور ملازم کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ھے، وہ کبھی بھی نہیں پاٹا جاسکتا۔ دھی رانی؛ تو یہ بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتی۔ چھوٹی بی بی نے تجھے جانے کیسی کتابیں پڑھا دی ھیں، جانے کونسی دنیا دکھا دی ھے تجھے کہ تو برابری اور تقویٰ کی باتیں کرنے لگی ھے۔ پُتر؛ ھم نسلوں سے اسی معاشرے میں رہ رھے، اور اِس معاشرے کے یہی اصول ھیں، یہی رِیت اور یہی رواج -------- یہاں شاہ کا بیٹا شاہ اور غلام کا بیٹا غلام ہی پیدا ہوتا ھے۔ چھوٹی بی بی تو خود بڑی معصوم اور بھولی ھیں،

اُنہیں کیا پتا کہ دنیا کہاں بستی ھے، اور دنیا والے کتنے ظالم ھیں۔" اُسکے نانا نے اسکے سر پر ہاتھ پھیرتے ھوئے جیسے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی، مگر اُسے اُنکی باتیں تازیانے کی طرح ہی لگیں تھیں۔ "ہاں رانی؛ میری جان؛ ابا ٹھیک کہہ رہا ھے۔ ھم غلام ھیں۔ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ---------ہمارا کام صرف مالکوں کی "جی حضوری" کرنا، انکی ہاں میں ہاں ملانا اور اُنکی خدمت ہی کرنا ھے اور بس ----------اس سے زیادہ کی نہ تو ہمیں اجازت ھے اور نہ ہی ضرورت۔ تو جانتی ھے ناں بیٹا کہ ارم بی بی کے والد چوہدری رحمت بھی مجھے اپنا مصاحبِ خاص سمجھتے ھیں، اپنا دوست مانتے ھیں اور بعض اوقات تو اپنے بھائی کا درجہ ہی دے دیتے ھیں، مگر میں تیری طرح کبھی جذباتی نہیں ھوا۔ میں نے اُنکے اور اپنے درمیان موجود فاصلے کو ہمیشہ برقرار رکھا ھے۔ وہ اپنے دل کی ھر بات مجھ سے کر لیتے ھیں، کر سکتے ھیں ــــــــ مگر میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اندھے کنویں کی طرح بنا کر پیش کیا ھے، ایسا اندھا کنواں جس میں راز جا تو سکتے ھیں، باھر نہیں آسکتے۔ اسی لیئے بیٹا چوہدری صاحب مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ھیں۔ تمہاری غلطی یہ ھے بیٹا کہ تم نے ارم بی بی کے قصے کہانیاں سنی تو ضرور مگر اُن پر اعتبار بھی کر لیا اور پھر اُنکو اپنی کہانیاں بھی سنانے بیٹھ گئیں----- اور یہ بات ہی بڑی چوہدرانی جی کو ناگوار گذری۔ !" اُسکے ماموں انعام نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ھوئے اپنے نرم انداز میں اسے بہت کچھ سجھایا تو وہ انکی شکل دیکھنے لگی۔ "ہاں ماموں؛ آپ شائید ٹھیک ہی کہتے ھیں۔ غلطی تو میری ہی ھے، اور اپنی غلطی کی سزا بھی میں نے خوب پا لی ھے۔ شائید بے.جی نے میرے ساتھ ٹھیک ہی کیا۔ میں اِسی سزا کی مستحق تھی۔ !" وہ نانی کی گود میں سر رکھ کر ایک بار پھر رو دی۔

☆ ☆ ☆

ارم نے اگلے کئی دن تک رانی کا شدت سے انتظار کیا، کئی بار ماسی شیداں سے اُسکا پوچھا بھی۔ ماسی کے ہاتھ اُسے حویلی آنے کا پیغام بھی بھجوایا، مگر رانی کو آنا تھا، نہ وہ آئی۔ بے.جی نے اُسکا داخلہ حویلی میں بڑی سختی سے بند کر رکھا تھا، اور رانی میں اُنکی حکم عدولی کرنے کی جرات بہرحال ھرگز نہ تھی۔ ارم کا انتظار، انتظار ہی رھا۔ وہ جو ھر سال چھٹیاں شروع ھوتے ہی گاؤں کی طرف بھاگتی تھی اور پھر آخری چھٹی بھی بے.جی اور رانی کی سنگت میں گذار، بمشکل مُنہہ بسورتی واپس جاتی تھی، اِسبار اِتنی دلبرداشتہ ھوئی کہ اُس نے بہت جلد واپسی کا ارادہ کر لیا۔ ارم کے اِس اعلان نے بے.جی کو اور زیادہ غصہ دلایا تھا مگر وہ فی الحال خود پر ضبط کے پہرے لگائے بیٹھی اُسے جانے کی تیاری کرتا دیکھتی رہی۔ رانی کے لیئے انکے دل مین کدورت اور زیادہ بڑھ گئی لیکن انہوں نے اسے کسی اور وقت کے لیئے اسے سنبھال رکھا اور

ارم کو حسبِ معمول دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، ورنہ دل تو انکا چاہ رہا تھا کہ رانی کو چار چوٹ کی مار لگائیں اور پھر اس فتنے کو ہمیشہ کے لیئے گاؤں بدر ہی کروا دیں، مگر وہ ارم کی وجہ سے مجبور ھو گئی تھیں۔ ایک تو وہ اُن سے خفا ھو کر احتجاجی طور پر وقت سے پہلے چلی گئی تھی اور پھر اُس پر اُس نے اپنے داد اور بابا کو ساری بات بتادی تھی۔ بڑے چوہدری صاحب اور منجھلے چوہدری صاحب (رحمت) نے انہیں فوراً فون کیا تھا اور اب مزید رانی کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ کرنے کی ہدایت کی تھی ورنہ دوسری صورت میں ارم پھر کبھی گاؤں کا رخ نہ کرتی کہ یہی اُسکا فیصلہ تھا۔ بے جی چوہدری صاحبان کی بات تو کیا ہی مانتیں لیکن ارم کی دی گئی دھمکی نے اُنکے ہاتھ باندھ دیئے۔ وہ شروع سے ہی اُنکے زیادہ نزدیک رہی تھی، اور پھر اکلوتی پوتی ھونے کا شرف بھی اُسے حاصل تھا (دونوں بھیائیوں کی دو دو بیٹے تھے) اس لیئے باقی سب پوتوں کی نسبت وہ دادا دادی کی بہت زیادہ لاڈلی تھی اور بے جی ایک رانی کی وجہ سے اپنی پوتی کو نہیں کھونا چاہتی تھیں اس لیئے رانی پر ہی مٹی ڈال دی اور پھر سے اپنی چوہدراھٹ میں مگن ھو گئیں۔

☆ ☆ ☆

پانیوں کا جہنم ھے دہکا ھوا

ہر طرف ھے تعفن سا پھیلا ھوا

بیسہاروں کا اب کوئی بھی گھر نہیں

اک نوالہ بھی اُنکو میسر نہیں

ایک لمحے میں سب کچھ فنا ھو گیا

چار نسلوں کا مال و متاع کھو گیا

پھول پودے، شجر، فصلِ جان کھو گئی

سر پے سایہ کشا تھی جو ماں کھو گئی

آنکھ بھی بُجھ گئی فیصلے دیکھ کر

عِبرتیں رو پڑیں سانحے دیکھ کر

یہ لُٹے قافلے، تنگ ھوتی زمیں

ایسی ویرانیاں ھم نے دیکھی نہ تھیں

یہ کڑا وقت ھے، قوم مایوس ھے

زندگی موت کے گھر میں محبوس ھے

ایسے عالم میں ھم بے حِسی چھوڑ دیں

اِن مُصیبت زدوں کا سہارا بنیں

قطرہ قطرہ ملے گر، سمندر بنے

دل کُشاہ شخص ہی تو قلندر بنے

چھت سروں پر نہیں، سب پریشان ھیں

میرے مالک! یہ کمزور انسان ھیں۔

ہر طرف پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ تاحد نگاہ پھیلے اِس بپھرے پانی نے کس کس سے کیا کیا چھین لیا تھا، اسکا اندازہ دور، اپنے اپنے ٹی وی سیٹس کے سامنے بیٹھے اس حالت زار کا نظارہ کرتے، اس پر افسوس کرتے اور اسٹوڈیوز میں بیٹھ کر اس پر تبصرے کرتے اینکرز اور تجزیئہ نگار کبھی بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ یوں تو ہر سال ہی ساون میں بادل کُھل کر برستے تھے اور پھر اِن ھونے والی لگاتار بارشوں میں جب بھارت کیطرف سے چھوڑا جانے والا پانی بھی شامل ہو جاتا تو ایک طرح سے قیمت صغریٰ برپا ہو جاتی۔ یہ شاید اُن لوگوں کی خوشنصیبی تھی یا پھر اُن پر اللہ کا خاص فضل کہ سیلاب نے عرصہ ھوا اپس کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا۔ اُنکا گاؤں نالہ ڈیک کے دوسری طرف، کافی فاصلے پر تھا۔ پچھلی کئی دہائیوں سے سیلاب اور طوفانوں کا رخ انکی طرف سے مڑ چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ برسات کا موسم بہت بے فکی کے عالم میں گذارنے کے عادی ہو چکے تھے، مگر اِس بار جانے کیا ھوا تھا سب کے اندازے بھربھری ریت کی طرح ڈھیتے ہی چلے گئیے۔ چوہدری حشمت اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں ملک گیر دورے پر تھے اور چوہدری رحمت اپنے بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گئیے ھوئے تھے۔ البتہ چوہدری نعمت آجکل اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے گاؤں آئے ھوئے تھے۔

ان سب کی آمد کی وجہ سے حویلی اور ڈیرے پر خوب رونق لگی ھوئی تھی۔ بے.جی کت حکم کے مطابق تقریباً پورا گاؤں ہی ان مہمانوں کی خدمت میں سرگرم نظر آرہا تھا۔ چوہدری نعمت اور انکے دوست ان انتظامات سے بہت خوش اور مطمئین انداز سے اس سہانے موسم کو خوب انجوائے کر رھے تھے۔ ہر طرف اچھے کی آواز تھی، لیکن "ھونی" کو بھی کبھی کوئی ٹال سکا ھے۔ جو ھونا ہو وہ تو ھو کر ہی رہتا ھے اور اس بار انہیں نشانہ بنایا تھا۔ نالہ ڈیک میں آنے والی طغیانی نے شاہ گدا ایک کر ڈالے تھے۔ اس اچانک آنے والے شدید سیلابی ریلے نے انکے گاؤں سمیت آس پاس کے کئی دیہات صفحہ ہستی سے ہی مٹا ڈالے تھے۔ انکی کھڑی فصلیں وہ ظالم پانی اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ چوہدری نعمت اور اسکے دوست اسوقت ڈیرے پر بیٹھے اگلے شکار کی پلاننگ کر رہے تھے کہ خود سیلاب کا شکار ھو گئیے، مگر اکرم، انعام اور ان جیسے ہی دوسرے ہاریوں نے اپنی جان پر کھیل کر انہیں اور انکے دوستوں کو بچا لیا۔ اکرم کاکا نے اپنے بوڑھے کاندھوں پر چوہدری نعمت کو اٹھا رکھا تھا اور انکے دوستوں کو دوسرے ہاری اُٹھائے محفوظ مقاام کی طرف لے جا رہے تھے۔ اُدھر بے.جی کا بھی بُرا حال تھا۔ وہ اپنی اُونچی حویلی کی چھت پر کھڑی بیبسی کے عالم آسمان سے قہر کی طرح برستے پانی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ پانی، جو کبھی زندگی کی نوید بنتا ھے، تو کبھی

رحمت بن کر برستا ھے؛؛ مگر اسوقت یہی پانی زحمت بنا ھوا تھا۔ آسمان سے تو برس ہی رہا تھا، لگتا تھا زمین بھی اپنے اندر موجود اِس خزانے کو فراخدلی سے اگل رہی تھی اسی لیئے تو یہ لمحہ بہ لمحہ بلند ھوتا، اپنے راستے میں آتی ہر شے نگلتا چلا جارہا تھا۔ کیا مکان، کیا کھلیان، کیا درخت، کیا کھیت سب سر تا پا ڈوبے ھوئے تھے۔ اُنکی آنکھوں کے سامنے گاؤں کے کچے پکے گھر دھڑا دھڑ گر رھے تھے اور وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھیں۔ بس بے بس سی کھڑی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی "راجدھانی" لٹتے دیکھ رہی تھیں۔ "چوہدرانی جی، وڈی چوہدرانی جی! جلدی کریں جی --------وقت بہت تھوڑا ھے جی، پانی بہت تیزی سے بڑھ رہا ھے اور تھوڑی دیر میں تو حویلی کی چھت بھی ڈوب جائے گی۔ آپ چِھیتی چِھیتی (جلدی جلدی) آجائیں ھم آپکو محفوظ مقام پر لے جاتے ھیں۔ چِھیتی کرو چوہدرانی جی اب دیر نی کرو جی!" سیلاب کا پانی حویلی کی چھت تک آن پہنچا تھا، اور وہ اُونچی شان والی حویلی اس وقت ناکوں ناک سیلابی پانی میں ڈوبی ھوئی تھی۔ بے جی دم بخود اپنا قیمتی سازوسامان، اپنے قیمتی برتن، فنیچر، چادریں، کپڑے، زیورات، حتیٰ کہ مال مویشی بھی، جن پر وہ بے تحاشہ غرور کیا کرتی تھیں، وہ سب کا سب پانی میں بہتا لمحہ بہ لمحہ اُنکی دسترس سے دور ھوتا جارھا تھا اور وہ بس ایک ٹک اسے تکے جارہی تھیں۔ اُنکا دل نیچے ہی نیچے بیٹا جارہا تھا۔

اُن کی آنکھوں کے سامنے سے کئی لوگ ٹوٹے درختوں، لکڑی کے تختوں پر چڑھے، بھینسوں سے لپٹے ئے اپنی اور اپنے بچوں کی جان بچاتے گذرتے چلے گئیے تھے۔ وہ لوگ جو اُنکی ایک جھلک دیکھتے ھی اُنہیں جُھک جُھک کر سلامیں کیا کرتے تھے، آج اُنہیں بے یارو مددگار چھوڑ، اُن سے نگاہیں چُراتے کسی محفوظ مقام کی تلاش میں آگے ہی آگے نکلتے چلے جارہے تھے۔ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں گھری کھڑی برستے پانی میں بھیگتی سب دیکھے جارہی تھیں، جب ایک تحتہ بہتا ھوا اُنکی حویلی کی دیوار کے ساتھ آ لگا۔ اُس تحتے پر شیداں، انعام اور رانی کے ساتھ سوار تھی اور اب وہ چوہدرانی جی کی مِنتیں کررہی تھیں؛ اُنکی ہی جان بچانے کے لیئے اُنہیں ہی واسطے دیئے جارہی تھیں اور وہ ان سکی طرف صرف خالی خالی نگاہوں سے تکے جارہی تھیں۔ "مالکن! کیا سوچ رہی ھیں آپ؟؟ چھیتی چھیتی کرو جی پانی تو بڑھتا ھی جارہا ھے۔ آپکو اللہ کا واسطہ ہماری گل (بات) مان لو جی ورنہ ہم وڈے چوہدری ہوراں کو کیا مُنہہ دکھائیں گے جی؟" "نہیں شیداں!! تم لوگ جاؤ محفوظ مقام پر۔ میں اپنا پِنڈ پنی حویلی چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا علاقہ ھے، یہاں میری حکومت ھے اور میں اپنی راجدھانی پر کسی کو حکومت نہیں کرنے دوں گی——چاھے وہ پانی ہی کیوں نہ ھو—— تم جاؤ یہاں سے——میں——میں کہیں نہیں جاؤں

گی ـــــــــــــ کبھی نہیں جاؤں گی۔!" عجیب بہکا بہکا انداز تھا اُنکا تو جیسے صدمے کی شدت سے دماغ ہی الٹ گیا تھا۔ شیداں اُنکی حالت دیکھ کر تڑپ کر رہ گئیں۔ "بے جی! اللہ کا واسطہ بے جی؛ آپکو ارم بی بی کی قسم ھے آپ نانی کی بات مان لیں اور ہمارے ساتھ چلیں بے جی، ہم آپکو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے، خدا کے لیئے بے جی!" رانی نے ایک دم تختے سے کودتے ھوئے چھت پر چھلانگ لگائی اور بے جی کے سامنے گھٹنوں کے بل گرتے ھوئے، اُنکے سامنے ہاتھ جوڑے فریاد کرنے لگی تو وہ جیسے ایک دم حواسوں میں آ گئیں۔ " شیداں! تم بچوں کو اتنے پانی میں لے کر کیوں اِدھر آ گئی ھو؟ تمہارا گھر تو محفوظ ٹیلے کے قریب ترین تھا، پھر تم اپنے بچوں کی جان کے ساتھ کیوں کھیل رہی ھو؟ اور وہ بھی میری خاطر؟؟ میں نے تو کبھی تمھیں یا تمہاری رانی کو اس قابل نہیں سمجھا، پھر بھی تمھیں میری زندگی کی اتنی پرواہ ھے کہ مجھے بچانے کے لیئے تم یہاں تک چلی آئیں؟؟ یہ کیا کیا شیداں تم نے، ارے؛ مر جانے دیا ھوتا ناں اسی پانی میں ڈوب اپنے غرور اور تکبر کے ساتھ ــــــــــ شیداں یہ کیا کیا تم نے، کیوں کیا؟" وہ ایک دم غصے سے چیخ پڑی تھیں اور اُنکے اِس غصے میں بھی اُنکی بے بسی، اُنکی مجبوری جھلک رہی تھی کہ اُنکا رابطہ ہر کسی سے ٹوٹ چکا تھا۔ فون سروسز بھی معطل تھیں اور زمینی، فضائی رابطے بھی سارے جہاں سے کٹ گیئے تھے۔ "

چوہدرانی جی! اِس طرح مت کہیں۔ آپ ہماری مالک ھیں اور ہم آپکے خاندانی ملازم۔ ہمارے پُرکھوں نے بھی کبھی آپکو دغا دینے کی کوشش نہیں کی، ہم تو ازلوں سے آپکے وفادار ھیں چوہدرانی جی۔ آپکو مشکل میں نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ بلکل فکر نہ کریں چھوٹے چوہدری جی اور اُنکے سارے دوستوں کو بند پر پہنچا دیا ھے ہم لوگوں نے۔ اب ہم آپکو لینے آئے ھیں کیونکہ ہم آپکے بغیر ادھورے ھیں۔ چوہدرانی جی آپ اماں اور رانی کی بات مان لیں، ویسے بھی میں چھوٹے چوہدری صاحب سے وعدہ کر کے آیا ھوں کہ اپنی جان پر کھیل کر بھی آپکو اُنکے پاس لے کر جاؤں گا۔ اب آپ مزید وقت ضائع نہ کریں اور ہماری عرضی مان لیں۔ آپکا بڑا اکرم ھو گا جی!" انعام نے بھی منت بھرے انداز میں کہا تو اُنہوں نے ہارے ھوئے نداز میں شیداں اور رانی کے ساتھ تختے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ چھت سروں پر نہیں، سب پریشان ھیں میرے مالک! یہ کمزور انسان ھیں اور آج بے جی کو اندازہ ھو رہا تھا کہ کمزور اور بے بس ھونے کا احساس کیسا جانگسل ھوتا ھے۔ یہ بے بسی، یہ بے کسی کس طرح رگوں کو کاٹتی، کس طرح خون نچوڑتی ھے، اس اونچے ٹیلے پر اس ھولناک سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچ نکلنے والے مفلوک الحال لوگوں کے درمیان بیٹھی بھی وہ اُن جیسی ہی لگ رہی تھیں۔ بےبس، بیکس، مجبور اور مفلوک الحال۔

☆ ☆ ☆

سیلاب کا پانی اُتر چُکا تھا، اور اُسکے ساتھ ہی بے.جی کی آنکھوں پر پڑے کئی پردے بھی۔ یہ پانی جاتے جاتے اپنے ساتھ کئی آنکھوں کے خواب بھی لے گیا تھا۔ کسی کے سر سے چھت اُڑی تو کسی کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی غائب ہو گئی تھی۔ وہ سارا علاقہ عجیب ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی اور بربادی نے جیسے ڈیرے ڈال لیئے تھے۔ پھر جیسے ہی گاؤں سے زمینی رابطے بحال ھوئے، چوہدری صاحبان فوراً بھاگے چلے آئے تھے۔ ارد گرد کے سارے علاقوں کی طرح اُنکے گاؤں میں بھی بڑے پیمانے پر تباہی ھوئی تھی۔ اُنکے کھیت اُجڑ گئیے تھے، کھڑی فصلیں برباد ھو گئیں تھیں۔ گاؤں کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جِسے کُلی یا جُزوی طور پر نقصان نہ پہنچا ھو۔ کچے گھر تو سرے سے ہی غائب ھو گئیے تھے اور پکے گھر بھی اس کنڈیشن میں ہرگز نہیں تھے کہ اُس میں رہا جا سکے۔ یوں تو گاؤں والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنے گھروں کی مرمت شروع کر دی تھی مگر چوہدری حشمت اور چوہدری رحمت کے آتے ہی اِن تعمیراتی کاموں میں بہت تیزی آگئی تھی، اور یہ بلکل پہلی بار ہی ہو رہا تھا کہ "بڑی چوہدرائی صاحبہ" بھی ان کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ گاؤں سے زمینی رابطے بحال ھوتے ہی ارم بھی اپنے بابا اور دادا کے ساتھ آگئی تھی اور اب بار بار اپنی بے جیسے لپٹ لپٹ جاتی، کبھی روتے ھوئے اُنکے ہاتھ چومتی تو کبھی رانی اور ماسی شیداں کا شکریہ ادا کرتی نظر آرہی تھی۔ "بے.جی! مجھے معاف کر دیں بے.جی، میں نے آپکا دل دکایا تھا ناں اسی لیئے اللہ نے مجھے سزا دی، سچ کہہ رہی ھوں، جیسے ہی میں نے اپنے گاؤں میں سیلاب کی خبر سُنی میری تو جان ہی ھوا ھو گئی۔ جتنے دن بھی آپ لوگ اُدہر اُونچے ٹیلے پر محسور رھے، اُدہر شہر میں ہم لوگ بھی سولی پر لٹکے رہے۔ میری حالت تو اس لیئے بھی زیادہ خراب تھی کہ میں لاسٹ ٹائم آپ سے خفا ھو کر گئی تھی ناں اسی لیئے مجھے بہت گلٹ محسوس ھوتا تھا۔ سچ کہہ رہی ھوں بے.جی، اگر خدانخواسطہ آپکو کچھ ھو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر پاتی۔ آپ کو ناراض کرنے کا، آپ سے معافی نہ مانگ سکنے کا دکھ ہی شاید میری جان لے جاتا۔!" وہ سب اُس وقت بے.جی کے کمرے میں ہی بیٹھے تھے کہ ارم نے ایک بار پھر اُنسے لپٹتے ھوئے ڈرے سہمے انداز میں کہا تو اُنہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ حویلی کی رینوویشن کا کام کل ہی ختم ھوا تھا۔ گاؤں کے سارے گھر بے.جی کے حکم چوہدری صاحب نے اپنے ذاتی خرچ پر تعمیر کروائے تھے، اور وہ بھی بہت جلد اور خصوصی توجہ کے ساتھ۔ گاؤں اپنی پہلی حالت پر واپس آچکا تھا، بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت اور خوشحال۔ اور اب اُن لوگوں کی شہر واپسی کی تیاریاں ھو رہی تھیں کہ ارم کو ایک بار

پھر بے جی کی جدائی کا خیال رلا گیا۔ "ارم پتر! میں تجھ سے خفا نہیں ھوں، بلکہ میں تو تم سے بہت خوش ھوں پُتر کہ تو نے میرے سوئے ھوئے احساس کو جھنجھوڑا تو سہی۔ ہاں، اُسے جگانے کے لیئے واقعی قدرت کی طرف سے یہ سیلابی ریلا آ گیا، مگر پہل تو تم نے کی تھی ناں میری بچی۔ اور اب تمہیں میرا ایک کام اور کرنا ھے۔!" بے جی نے ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیئے ہلکا پھلکا انداز اپنایا تھا۔ "جی بے جی! حکم کریں آپ۔!" ارم نے بھی اُنکے انداز میں مسکرا کر کہا۔ "ارم پُتر! تم رانی کو اپنے ساتھ شہر لے جاؤ اور اسکا داخلہ بھی اپنی جامع میں کروا دو۔ اسکو پڑھنے کا بہت شوق ھے ناں اور ماشااللہ یہ لائق بھی بہت ھے تو یہ اسکا حق بنتا ھے۔ رحمت پُتر! تم رانی کی پڑھائی کا سارا خرچہ اُٹھاؤ گے، اور پھر اسکی شادی کا سارا خرچہ بھی اس حویلی کی ذمہ داری۔ ٹھیک ھے پُتر!" "بے جی ———— آپ ————

اور اتنا بڑا چینج ---------------- مگر یہ سب ھوا کیسے بے جی؟؟" اُنکی بات سُنکر ارم تو اچھل ہی پڑی تھی۔ اسکی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ ری ایکٹ کیسے کرے؟ باقی سب بھی حق دق بیٹھے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ بے جی ارم کی بات اور سبکی حالت دیکھ کر ہنس دی تھیں۔ "ہاں پُتر! یہ میں ہی ھوں، اور یہ تبدیلی مجھ میں ایسے ہی نہیں آ گئی۔ تمہیں پتا ھے، اُس دن سیلاب کا پانی "میری اِس اُونچی حویلی کی چھت

اداس کیوں ہو
ضبط سے سرخ آنکھیں
اداس چہرہ
حسین رتوں میں گلاب چہرہ
ہمیں بتاؤ اداس کیوں ہو
دلوں سے
مٹا کر نفرت
بھلا کر شکوے
مٹا کر دوری
گلے لگاؤ
اداس کیوں ہو
بے لفظ محبت کتاب زیست کے
ہر صفحے پر لکھا
رنجشوں کا مٹاؤ
اداس کیوں ہے
منافقت کدورت میں جو ڈھل رہی ہیں
مٹا کر نفرتیں دلوں سے
گلے سے لگاؤ
اداس کیوں ہو
ہماری وفا کا ہمیں مان دو
یا پھر ہمیں سزا سناؤں

(جاری ہے باقی پڑھیں اگلے صفحہ پر)

تک چڑھ آیا تھا اور ممکن تھا کہ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی اس میں ہی بہہ جاتی، لیکن اِس شیداں اور اسکے بچوں نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے اور میرے بیٹے کی جان بچائی۔ یہ ہمیں محفوظ جگہ پر لے گئیے، اور پھر وہاں جو کچھ میں نے دیکھا میرا کلیجہ مُنہہ کو آ گیا۔ وہ سب لوگ جنہیں میں کمذات، کمظرف اور چھوٹا سمجھتی تھی، اُنکی اعلیٰ ظرفی، اُنکے بڑے دل دیکھ دیکھ کر مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگنے لگا۔ تمھیں پتاھے رحمت پُتر؛ دینو کمہار کے دو بچے پانی میں بہہ گئیے، لیکن اُس نے اپنے پڑوسی کے چار بچے ڈوبنے سے بچا لئیے۔ گاموموچیکی بیٹی کا سارا جہیز سیلاب بہا کر لے گیا، مگر وہ اِس پر اللہ کا شکر گذار ھو رہا تھا کے اُس نے ماکھی ماچھن کی بیٹی کے داج (جہیز) والی پیٹی بہنے نہیں دی۔ میں حیران تھی کہ یہ کیسے لوگ ھیں، کون سی مٹی سے بنے ھیں، کس ذات کے انسان ھیں کہ اپنا درد بھلائے، اپنے آنسو چُھپائے دوسروں کا درد بانٹ رھے ھیں۔ ایکدوسرے کو تسلیاں دلاسے دے رھے ھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کے وعدے کر رھے ھیں۔ ایکدوسرے کی مدد کرنے کو ہر لمحہ تیار ھیں، اس شدید مشکلوقت اور اس بری حالت میں بھی اپنے رب کے شکر گزار ھیں ---------- میں سچ کہتی ھوں، اِن سب کے اس کردار، اس اعلیٰ ظرفی نے مجھ سے میرا غرور ہی چھین لیا، لیکن یہ شیداں، رانی اور اِنکے گھر والے

(بقیہ حصہ)

اداس کیوں ہو

اک دل تھا جو لٹ گیا

دل لٹے پر ماتم کیسا

خوشیاں مناؤ

اداس کیوں ہو

فریب کھانا بھی ہمارا اک ہنر ہے

فریب دینا بھی اک ہنر ٹھہرا

پھر مجھے یہ بتاؤ اداس کیوں ہو

محبت ہے دلوں بیتی

وہ کہانی سناؤں

ہمیں بتاؤ اداس کیوں ہو

از قلم شازیہ کریم

علی، احمد اور داستانِ دل

علی: کیا ہوا اسد؟ ایسے کیوں بیٹھا ہے؟

احمد: یار میں نے ایک افسانہ لکھا ہے سمجھ نہیں آ رہا کہاں بھیجوں؟

علی: تو اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔ بھیج دے اپنے ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال میں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے یہاں بھی میری انا کا پرچم سربلند رکھا۔ جیسے ہی امدادی ٹیم کے لوگ وہاں پہنچے، یہ خود کشتیوں اور ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے سے پہلے ہمیں مجبور کرنے لگے ہم ادھر سے نکل جائیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ -- -- -- - -- کیونکہ ۔۔۔۔۔۔۔۔کیونکہ ہمیں اسطرح بے سروسامانی کی حالت میں رھنے کی عادت نہیں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔لیکن پُتر ھمارا ضمیر گوارا نہ کیا۔ نعمت اللہ نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا اور یوں پہلے بچوں اور عورتوں کو وہاں سے نکالا گیا، اور پھر گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم وہاں سے نکلے۔ بس، پھر میں نے سوچ لیا اور پھر تمہارے دادا جی اور بابا سے کہہ دیا کہ پہلے میرے گاؤں کے ہر گھر کی مرمت ھو گی، ہر تباہ ھو جانے والا گھر نئیے سرے سے تیار ھو گا، اُن سب بیٹوں کا جہیز تیار ھو گا جو سیلابی ریلے میں بہہ گیا تھا، اُنکی شادیوں کا انتظام ھو گا اور جنکے مال ڈنگر بہہ گئیے انکو دلوائے جائیں گے اور پھر اسکے بعد ہی اس حویلی کی مرمت اور رنگ و روغن کا کام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!" "اچھا۔۔۔۔۔۔۔!! تو اسی لئیے آپ نے بابا اور چاچو کو شہر جانے سے روکا تھا، ھوں ------ اور اسی لئیے حکومتی امداد آنے سے پہلے ہی ہمارے گاؤں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ گریٹ بے جی!" ارم نے بیساختہ خوش ھوتے ھوئے انکی بات کاٹتے ھوئے جوشیلے انداز سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔ "ہاں بیٹا! جب اللہ نے ہمیں توفیق دے رکھی ھے، ہمیں اس گاؤں کا مالک اور زمیندار بنایا ھے تو پھر اپنے لوگوں کی مدد بھی ہمیں خود ہی کرنی چاھئیے۔ آخر ہم کب تک اپنے ہر چھوٹے بڑے کام کے لئیے حکومت کی طرف دیکھتے رھیں گے؟ میں سچ کہتا ھوں، اگر ہر گاؤں، ہر تحصیل اور ہر اُس جگہ جہاں ایسی تباہی آتی ھے، دس بارہ بھی ہمارے جیسے پاور اور پوزیشن رکھنے والے لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آگے بڑھ کر اپنے لوگوں کی مدد خود کرنے لگیں تو شاید ہمیں کسی دوسرے کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ھو۔ اگر ہم اپنا کام خود وقت پر کرنے لگیں تو دوسروں سے شکایات بھی ختم ھو جائیں گی۔!" بڑے چوہدری صاحب نے بھی بے جی کی باتوں کی تائید کرتے ھوئے کہا تو سب انکے قائل ھو گئیے۔ "آپ ٹھیک کہتے ھیں ابا جی! ہمنے تو شروعات کر دی ھیں، اب اللہ کرے دوسرے لوگ بھی اسکی تقلید کریں اور اللہ ہمیں بھی ہمت دے کہ ہم اس روشنی کو پھیلانے والوں میں سے شمار ھوں!" نعمت اللہ کی بات پر سب نے یکزبان ھو کر "آمین" کہا تھا۔ بے جی مسکرا کر ان سب کو دیکھ رہی تھیں کہ انکو ھو چکا تھا کہ انکی آنے والی نسلوں میں وہ ظرف ضرور پیدا ھو گا جو اس پرخلوص محبت کی روشنی پھیلانے کا سبب بنے گا۔

☆ ☆ ☆

شامِ تنہائی

ندیم عباس ڈھکو

اپنی رائے بھیجئے

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 79/5L-ڈاکخانہ 78/5-

L تحصیل و ضلع ساہیوال

موبائل 0322-5494228

nadeemdhako79@yahoo.com

مکمل ناول

پہاڑی علاقوں میں لہراتے' بل کھاتے پیچ پیچ راستے عورت کے مزاج کی طرح پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ایسی ڈھلانیں ہوتی ہیں' جیسے کوئی حسینہ اونہہ پہاڑی علاقوں میں لہراتے' بل

کھاتے پیچ پیچ راستے عورت کے مزاج کی طرح پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ایسی ڈھلانیں ہوتی ہیں' جیسے کوئی حسینہ اونہہ کہہ کر نظروں سے گرا رہی ہو۔ کبھی یہ راستے ایسی بلندیوں پر لے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم ُالحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

جاتے ہیں، جیسے محبت کی معراج نصیب ہو رہی ہو۔

راج محمد بڑا بد نصیب تھا۔ اسے محبت کی معراج تو کیا۔۔۔ خیرات بھی نصیب نہیں ہو رہی تھی وہ پہاڑی حسینہ اونہہ کہ کر اسے نظروں سے گراتی رہتی تھی۔ مگر وہ بھی چٹانی حوصلے رکھتا تھا۔ گرتا تھا پھر سنبھلتا تھا۔ ایسے وقت کتابوں میں پڑھا ہوا سبق سمجھاتا تھا کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔۔۔۔

اس کے دوست رزاق نے بیزاری سے کہا۔ "یارا! تو یکطرفہ میدان محبت کا شہسوار ہے۔ ایسی آہیں بھرنے والی محبت ساری زندگی ہائے ہائے کرتی رہ جاتی ہے۔"

راج محمد جیسے اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا۔ بڑی لگن سے گرلز اسکول کے مین گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ رزاق نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک برس گزر گیا۔ وہ نویں جماعت سے دسویں میں آگئی ہے۔ پہلے پندرہ کی تھی۔ اب سولہ کی ہو گئی ہو گی۔ وہ اُٹھان پر جا رہی ہے اور تو ڈھلان پر۔۔۔ وہ اوپر ہی اوپر آسمان کا چاند ہو جائے گی اور تو زمین پر چاند دیکھ کر دعائیں مانگتا رہ جائے گا۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا' کیا کروں"

"پہلے اس کے دل میں محبت تو پیدا کر۔ وہ نقاب کے پیچھلے کل بھی تجھے تفرت سے گھورتی تھی۔ آج بھی وہی انداز ہے۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "نفرت سے سہی۔۔۔ وہ مجھے دیکھتی تو ہے نا۔۔۔؟ اس کی نظریں کہتی ہیں' وہ میرے بارے میں سوچتی بھی ہے"۔

"تو نے صرف اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ پتا نہیں' وہ نقاب کے پیچھے کیسی ہے؟ پردے کا دستور ہم مردوں نے ہی بنایا ہے۔ مگر دل کے معاملے میں ایسی پابندیوں سے کوفت ہونے لگتی ہے۔"

"اس کی آنکھیں بتاتی ہیں' وہ حسن کا شاہکار ہے۔ کشمیر کی وادیوں کی طرح ہری بھری ہے۔ یوں بھی پہاڑی حسن تو پوری دنیا میں مشہور ہے۔"

رزاق نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پہاڑوں میں صرف حسن نہیں ہوتا' پتھر بھی ہوتے ہیں۔ کیا تجھے پتا ہے۔ وہ اندر سے پتھر بھی ہو سکتی ہے۔"

راج نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تُو اسے بدنما پتھر سمجھتا ہے؟"

"اگر ہوئی تو۔۔۔۔۔؟ "

وہ کھوئے ہوئے انداز میں ایسے بولا جیسے تصور میں اپنی سُندس کو دیکھ رہا ہو۔ "مجھے اس کی بدصورتی بھی قبول ہے۔ مگر پتا ہے سُندس کے معنی ہیں ریشم۔۔۔ تُو نے دیکھا ہے' پردہ کرنے کے باوجود دونوں ہاتھ باہر رہتے ہیں' اس کے ریشمی وجود کی چغلی کھاتے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے' وہ یقیناً جیتا جاگتا

تاج محل ہو گی۔"

رزاق نے کہا۔"بے شک وہ تاج محل کی طرح پتھریلی ہے۔ ایک ذرا نہیں پگھلتی۔ایسی نک چڑھی لڑکی تو پورے مظفر آباد میں کہیں نہیں ہو گی۔ "

"پانی مسلسل گرتا رہے تو پتھر میں بھی سوراخ کر دیتا ہے۔ ایک برس کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔وہ کسی حد تک تو پگھل چکی ہو گی؟"

وہ بیزاری سے اسکول گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔"مجھ سے کیا پوچ رہا ہے؟اس کے تیور کھلی کتاب کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔مگر تیری آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی رہتی ہے۔آئندہ میں تیرے ساتھ نہیں آیا کروں گا۔"

راج محمد نے کہا۔"ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کا تسلسل ہوتا ہے۔تُو نے وعدہ کیا ہے ہمیشہ میرا ساتھ دیتا رہے گا۔"

چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔اسکول کی عمارت سے گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔راج محمد کے پورے وجود میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔وہ بالوں اور کالر کو درست کرتا ہو بڑی بے چینی سے اسکول گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔نقاب والیاں ٹولیوں کی صورت میں باہر آ رہی تھیں۔مختلف عمر کی بے شمار لڑکیاں عمارت نے نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ان نقاب والیوں کے ہجوم میں اپنی والی کو ڈھونڈا مشکل ہو جاتا تھا۔مگر وہ سُندس کو اس کی منفرد آنکھوں سے اور سرخ بیگ سے پہچان لیتا تھا۔

وہ اسے دیکھ رہا تھا۔وہ بھی حسب معمول کن آنکھیوں سے گھور رہی تھی۔سہیلی کا ہاتھ تھامے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔راج محمد مسکرا کر سلام کرنے کے انداز میں اپنا دایاں ہاتھ پیشانی تک لایا۔پھر بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔رزاق دور جاتی ہوئی سُندس کو دیکھ کر بولا۔"مگر میرے اندر ایک نئ توانائی بھر جاتی ہے"۔

وہ ایک گلی میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔رزاق سر جھٹک کر اٹھتے ہوئے بولا۔"اب چلیں۔۔۔۔؟ہر روز اپنی دکان ملازموں پر چھوڑ کر یہاں بیٹھ جاتا ہے۔پتا نہیں اتنی دیر میں وہ کتنا گھپلا کرتے ہوں گئے؟"

راج محمد جوتوں کا کاروبار کرتا تھا۔اس کے ساتھ اپنی دکان کی طرف جانے لگا۔رزاق نے کہا۔"کتنی بار سمجھایا ہے'محبت میں اظہار ضروری ہوتا ہے۔کسی دن چھٹی کے بعد اس کا پیچھا کر۔جہاں بھی تنہائی ملے اپنے دل کی بات کہ دے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔"مجھے اُلٹے سیدھے مشورے نہ دے۔اس کے گھر والوں نے دیکھ لیا تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔"

"اس کے سر پر نہ باپ کا سایہ ہے'نہ جوان بھائی کا ہاتھ ہے۔ایک بوڑھی ماں اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔وہ دس برس کا بچہ تیرا کیا بگاڑ لے گا؟اس کے گھر میں تو اسلحہ بھی نہیں ہو گا۔"

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔"پھر بھی یار!گلی میں ایک لڑکی سے بات کرنا عجیب سا لگتا ہے۔"

"محبت اور جنگ میں ہر طرح کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔کیا خبر وہ تجھے اس لیے گھورتی ہو کہ محبت کرتا ہے تو اظہار کیوں نہیں کرتا؟حسیناؤں کی فطرت کو سمجھ میری جان!یہ جی دار عاشق پسند کرتی ہیں۔"

راج نے ایک ذرا رک کر اسے دیکھا۔وہ اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا۔"ابھی میرے سامنے قسم کھا کر کل اس کا پیچھا کرے گا اور جس سنسان گلی میں موقع ملے گا'اپنے دل کی بات کہہ دے گا۔اس طرح اس کے دل کا بھید بھی مل جائے گا۔"

وہ بولا۔"تُو کہتا تو ٹھیک ہے۔مگر۔۔۔۔۔۔"

"اگر مگر چھوڑ۔۔۔پچھلے برس سے مکھیاں مار رہا ہے۔ایک بات کہتا ہوں'اب اُس سے حال دل نہ کہا تو تیری میری دوستی ختم۔۔۔"

وہ جلدی سے بولا۔"مجھے تیرا مشورہ قبول ہے۔بس یہ سوچ کر دل ڈوب رہا ہے کہ اس کی طرف سے حوصلہ افزا جواب نہ ملا تو کیا ہوگا؟ "

وہ راج کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرے کو اِدھر اُدھر سے دیکھتے ہوئے بولا۔"اچھا خاصا ہیرو لگتا ہے۔مجھے یقین ہے'وہ انکار نہیں کرئے گی ویسے بھی تیری لگن بتاتی ہے'تو پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہے۔اس پتھر کو موم بنا کر ہی چھوڑے گا۔"

پتا نہیں وہ موم بننے والی تھی یا نہیں؟یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔اس رات راج محمد کو نیند نہیں آئی۔ایک ذرا دیر کے لیے آنکھ لگیت بھی تھی تو وانقاب کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ایسے وقت رزاق کی یہ بات دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگتی تھی۔"کیا خبر وہ تجھے اسی لیے گھورتی ہو کہ محبت کرتا ہے تو اظہار کیوں نہیں کرتا؟"

اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ کل مناسب موقع دیکھ کر سندس سے اظہار محبت ضرور کریئگا۔یہی سوچ سوچ کر وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا مگر کسی پہلو چین نہیں آرہا تھا۔پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ محبت کرنا آسان ہے۔لیکن اظہار محبت کرنا بہت مشکل ہے۔رزاق کی دھمکی بھی مجبور کر رہی تھی کہ سندس سے بات کرنی چاہیے۔مگر کیسے کرنی چاہیے؟یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔وہ طرح طرح کے رومانی اور جذباتی فقرے تراش رہا تھا پھر خود ہی انہیں مسترد کر رہا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بولا۔"ہائے سُندس!تم اپنے بستر پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہو گی۔ نہیں تو

خبر بھی نہیں ہو گی کہ یہاں یہ دیوانہ کیسے تڑپ رہا ہے۔ کیا کروں؟ کیسے اپنے دل کا حال سناؤں؟ تمہیں مخاطب کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔"

وہ لائٹ آن کر کے شاعری کی مختلف کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ حسب حال موزوں الفاظ کا ذخیرہ مل رہا تھا۔ مگر یہ خیال بے چین کر رہا تھا کہ اس کے روبرو پہنچ کر یہ باتیں دماغ میں رہیں گی بھی یا نہیں؟

صبح ہوتے ہوتے یہی بات سمجھ میں آئی کہ سر راہ اظہار محبت نہیں ہو سکتا اور ملاقات کسی صورت ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا وہ حال دل کو ایک صفح پر اتارنے لگا۔

اس روز اسکول کی چھٹی ہوئی تو رزاق اسے سُندس کے پیچھے جانے کا اشارہ کر کے خود ایک دکان پر بیٹھ گیا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور کچی ڈور سے بندھا محبوبہ کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔

اس کی سہیلی نور گل نے سر گھما کر دیکھا پھر سندس کو ٹھوکا دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ تمہارا عاشق نامراد ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔"

وہ چلتے چلتے ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ پریشان ہو کر بولی۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ذرا پلٹ کر دیکھو۔"

اس نے الجھے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔ "مگر وہ ہمارا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟ کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ خواہ مخواہ بدنامی ہو گی۔"

"ہمارا محلہ ابھی دور ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ پیچھا کرتا ہوا گھر تک پہنچے۔ اس کی یہیں خبر لے لی جائے تو مناسب رہے گا۔"

وہ چلتی جا رہی تھیں اور دھیمی آواز میں بولتی جا رہی تھیں۔ سُندس نے پریشان ہو کر کہا۔ "خبر لینے کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہمیں گلی میں رک کر اس سے بات کرنی پڑے گی۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "نہیں۔ گھر لے چلو۔ بیٹھک میں چاہے پانی پلا نا پھر بات کرنا۔"

اس نے گھور کر نور گل کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "اگلی گلی میں سناٹا ہوتا ہے۔ وہیں اسے روکیں گے۔"

راج محمد اور ان کے درمیان تقریباً دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ وہ اس فاصلے کو ختم کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہا تھا اور لڑکیوں کے پیچھے پیچھے چلنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے بے چین ہو کر کے سوچا۔ "کروں؟ کیسے انہیں مخاطب کروں؟ یہ تو چلتی ہی چلی جا رہی ہیں۔"

ایسے ہی وقت وہ دوسری گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس گلی کے کونے پر پہنچا تو ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ وہ خلاف توقع ایک درخت کے پاس ایسے کھڑی ہوئی تھیں جیسے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ ہچکچاتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اس سے ذرا فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

نور گل نے اسے گھورتے ہوئے ذرا کڑک لہجے میں پوچھا۔

"تم ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟"

وہ خط اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ وہ اس پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے غلط نہ سمجھو میں۔۔۔۔ میں تو۔۔۔"

"یعنی لڑکیوں کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا اور ان کا پیچھا کرنا غلط کام نہیں ہے؟ ابھی میرے بھائیوں نے دیکھ لیا تو تمہاری کھال کھنچوا دیں گئے۔"

وہ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی سندس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے بہت مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ "

نور گل نے پوچھا۔ "کیسی مجبوری؟ تم چاہتے کیا ہو؟ روز اسکول کے باہر بیٹھے رہتے ہو۔ آج یہاں تک چلے آئے ہو۔ کیا ہمیں بدنام کرنا چاہتے ہو؟"

سُندس بہ دستور خاموش تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ نور گل نے پوچھا" پھر کیا ہے تمہارے دل میں۔۔۔؟"

وہ محبوبہ کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ کچھ نہیں بولیں گی؟"

سُندس نے سر اٹھا کر اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر کترا کر دوسریطرف دیکھنے لگی۔ سہیلی نے کہا۔ "اسے تو تم چپ ہی رہنے دو۔ یہ بولے گی نہیں۔ کھڑی کھڑی سنائے گی۔"

راج محمد کے دل نے دھڑک کر کہا۔ "چاہیے گالیاں ہی دو۔

عیب میرے ہیں میرا سارا ہنر تیرا ہے
میری نظموں میرے لفظوں میں اثر تیرا ہے
میری ہر راہ تیری میرا سفر تیرا ہے
میرے اندر جو بسا ہے وہ ہنر تیرا ہے
میری جڑیں تیری مٹی سے نمو پاتی ہیں
میرے وجود کا یہ سارا شجر تیرا ہے
تیری روشنی ہے مجھ میں تو میں روشن ہوں
میں ظلمت شب ہوں یہ نور سحر تیرا ہے
تو کہیں جائے یہ ہے پہچان تیری فرح
لاکھ تو دور سہی یہ دیس مگر تیرا ہے

شاعرہ: فرح بھٹو

علی، احمد اور داستانِ دل

احمد: یار میرے ذہن میں غزل آئی ہے، کیسی ہے؟ (وہ اس کو اپنی غزل سناتا ہے)

علی: یار یہ تو بڑی ہی اچھی ہے۔ تُو اس طرح کر داستانِ دل میں بھیج دے

احمد: مگر یار میرے پاس تو اس وقت صرف موبائل ہے، کیسے بھیجوں؟

علی: یار ٹیکسٹ کر کے بھیج دے۔

مگر کچھ تو بولو۔۔۔!ایک بار۔۔۔۔۔بس ایک بار تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔ پھر خط دے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

سُندس نے اس کیطرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔"تم جانتی ہو۔ تمہاری سہیلی جانتی ہے میں اسکول کے باہر کس کا انتظار کرتا ہوں؟ یہ بھی محسوس کرتی ہو گی کہ میں نے آج تک کوئی نازیبا حرکت نہیں کی ہے۔ کبھی تمہیں بدنام کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔"

"مگر آج کر رہے ہو۔"

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔۔۔۔ وہ درخت کا سہارا لے کر دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ راج محمد نے بے چین ہو کر اسے دیکھا۔ لہجے کا دھیماپن اور آواز کی مٹھاس بتا رہی تھی کہ مصری کی ڈلی ہے۔ وہ بہ دستور منہ پھیرا کر کہہ رہی تھی۔ "اور اگر نہیں کر رہے ہو تو ابھی اسی جگہ سے واپس پلٹ جاؤں۔ آئندہ ہمارے پیچھے نہ آنا۔"

پھر وہ نور گل کا بازو پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔"چلو۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔"

وہ آگے بڑھنے لگیں۔ اس نے جلدی سے ان کے پیچھے آتے ہوئے کہا۔"میں جانتا تھا سر راہ نہ تم میری سنو گی'نہ اپنی کہو گی۔ اس لیے میں۔۔۔۔ یہ لکھ کر۔۔۔۔"

نور گل نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا۔ وہ خط والا ہاتھ اسے دکھاتے ہوئے بولا۔"اپنی دوست سے کہو'محبت کرنے والے بدنام نہیں کرتے۔ میں اس کے گھر سے'اس کے خاندان سے حتیٰ کہ اس کے نام سے بھی واقف ہوں۔"

سُندس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ دل کی دھڑکنیں اچانک ہی بے ترتیب ہو گئیں۔ پل بھر کو ایسا لگا'جیسے سر راہ اس کے سر سے چادر نوچ لی گئی ہو۔ ایک غیر شخص کی زبان سے یہ سن کر کانپ گئی تھی کہ وہ اس کے نام سے واقف ہے۔ اس نے پلٹ کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر لرزتی ہوئی آوازیں پوچھا۔"تم۔۔۔۔ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

وہ بولا۔"یہ مت پوچھو۔ یہ دیکھو کہ اتنا سب کچھ جاننے کے باوجود میں نے کبھی تمہیں پریشان نہیں کیا ہے۔ ہمیشہ تمہاری عزت کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔"

وہ خط والا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔"میں تمہیں بدنام کرنے کے لیے تمہارا پیچھا نہیں کر رہا ہوں۔ یہ لے لو۔ میں یہیں سے پلٹ جاؤں گا۔"

وہ اس کاغذ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔"یہ کیا ہے؟"

"جو کہہ نہیں سکتا۔ وہ لکھ کر لایا ہوں۔"

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔"خدا کے لیے۔۔۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں تم سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی۔"

پھر وہ تیزی سے پلٹ کر نور گل کے ساتھ وہاں سے جانے لگی۔ وہ پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "رُکو۔ میری بات سنو۔۔۔"
سندس نے چلتے چلتے بے بسی سے سوچا۔ "کیا مصیبت ہے؟ میں اسے دھتکار بھی نہیں سکتی۔ یہ میرا نام جانتا ہے۔ گھر کا پتا جانتا ہے۔ اگر سخت رویہ اختیار کروں گی تو یہ دشمنی پر اتر آئے گا۔ مجھے بدنام کرے گا۔ آج پیچھا کر رہا ہے۔ کل گھر تک پہنچ جائے گا۔ چاچا، تایا کو خبر ہو گی تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گئے۔"
نور گل نے سرگوشی میں کہا۔ "اس سے پیچھا چھڑانے کا آسان حل یہی ہے۔ وہ کاغذ لے لو۔"
"اس نے الجھ کر پوچھا۔ "کیا وہ پیچھے آرہا ہے؟"
"ہاں۔ پیچھے وہ ہے۔ آگے ہمارا محلہ ہے۔ اس سے فوراً جان چھڑاؤ۔ ورنہ بڑی بدنامی ہو گی۔"
اس کی رفتار دھیمی ہو گی۔ دوسری طرف راف محمد کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ اس نے سہیلی کو اشارہ کیا۔ وہ پلٹ کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "لاؤ۔ وہ کاغذ مجھے دو۔"
وہ بولا۔ "یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ اپنی سہیلی سے کہو وہ خود اس خط کو وصول کرے اور اپنی ماں کی قسم کھا کر کہے اسے ضرور پڑھے گی۔"
سندس تنگ آگئی تھی۔ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ فوراً ہی پلٹ کر وہ خط لیتے ہوئے بولی۔ "ضرور پڑھوں گی۔
اب تم جاؤ۔"
پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سہیلی کے ساتھ اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ پہلے ادھر دیکھتا رہا پھر بڑی محبت سے اپنے ہاتھ کو سہلانے لگا۔ اس درد جانے والی کا ہاتھ خط لیتے وقت اس کے ہاتھ کو چھو کر گیا تھا۔ پورے ایک برس بعد بدن نے بدن پر پہلی بار ہلکی سی دستک دی تھی۔

***

یہ وادیاں یہ پربتوں کی شاہزادیاں
پوچھتی ہیں کب بنے گی تو دلہن۔۔۔۔
ریڈیو سے دھیمی آواز میں گیت کے بول ابھر رہے تھے۔
نور گل نے دبے قدموں کمرے میں آتے ہوئے کہا۔
"ہوں۔۔۔ کل خط پڑھنے سے پہلے تو بڑے مزاج دکھا رہی تھیں۔ پھر آج یہ کس سجن کو دعوت دی جا رہی ہے؟"
سُندس بستر پر آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی۔ سہیلی کی آواز سن کر چونک گئی۔ فوراً ہی بستر سے اترتے ہوئے بولی۔
"ارے تم کب آئیں؟"
وہ چادر اتارتے ہوئے بولی۔ "بس ابھی بھائی جان چھوڑ کر گئے ہیں۔"
سُندس فوراً ہی اس کے ہاتھ سے چادر لے کر تہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہے 'آج تم بھی اسکول نہیں گیٔں؟"
وہ بستر کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کل تم نے منع کر دیا

تھا۔ اس لیے میں نے بھی چھٹی کرلی اور جاتی بھی تو تمہارا وہ مجنوں میرے پیچھے پڑ جاتا۔"

وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے ناگواری سے بولی۔ "اس کی بات نہ کرو۔"

نور گل نے ریڈیو کو دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اچھا جی۔۔۔ اُس کی بات نہ کروں تو یہ گانا کس سجن کے لیے سنا جارہا ہے؟"

"ریڈیو پر اپنی پسند کے نہیں۔۔۔ دوسروں کے فرمایشی نغمے سنے جاتے ہیں۔"

"ویسے یہ جس کی بھی فرمایش ہے 'تمہارے حسب حال ہے۔"

وہ ریڈیو کو آف کرتے ہوئے بولی۔ "میں کس سجن وجن کا انتظار نہیں کر رہی ہوں۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر جانا چاہتی تھی۔ نور گل اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "کیا واقعی وہ تمہیں اچھا نہیں لگتا؟"

"تمہیں پسند ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں پسند کر کے کیا کروں گی؟ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ اچھا خاصا گبرو جوان ہے۔ تم پچھلے سال سے دیکھ رہی ہو۔ بے چارہ تمہارے انتظار میں اسکول کے باہر بیٹھا سوکھتا رہتا ہے۔ قسم سے۔۔۔ اگر میرا

داستانِ دل میں اپنی تحاریر اردو فونٹ میں درج ذیل ای میل ایڈریس پر بھیجیں

nadeemdhako79@yahoo.com

قرطاس پہ قلم سے یوں نشتر لگائیے
جب دل بنالیا ہے تو دھڑکن بنائیے
جل کے میں راکھ ہو بھی چکا ہوں مرے حضور
بہتر یہی ہے آپ مجھے بھول جائیے
آنکھوں سے اپنی اس لئے الجھا ہوں رات بھر
نیندوں کے ساتھ خواب کوئی ہونا چاہیے
بڑھتے ہوئے سکوت کا یوں توڑنیے غرور
کوئی غزل تو میر کی اب گنگنائیے
اس نے کہا! خزاؤں میں کھلتے نہیں گلاب
میں نے کہا! کہ اب ذرا مسکرائیے
طغیانیوں کے شور سے مرعوب کیوں ہوئے
دریا کو گھیر گھار کے صحرا میں لائیے مل تو گئی ہے
آپ کو میراث قیس کی
ارشد اب اپنے دوش پر وحشت اٹھائیے

ارشد محمود ارشد

کوئی ایسا دیوانہ ہوتا تو میں فوراً ہی اس سے محبت کر بیٹھتی۔"

"دیوانوں کا کیا ہے؟ یہ تو جاڑوں میں بھی فالودہ مانگتے ہیں۔"

وہ اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے بولی۔"وہ دیوانہ خوب جانتا ہے۔تم فالودہ نہیں ہو۔گرما دینے والی کشمیری چائے کی بھری پیالی ہو۔۔۔یہ بتاؤ خط کا جواب لکھ دیا؟"

"میں کسی کو جوابدہ نہیں ہوں۔"

نور گل نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔"کچھ تو کہنا ہو گا۔ورنہ وہ روز ہمارا پیچھا کرتا رہے گا۔بدنامی پھیلے گی تو گھر والوں تک بھی پہنچے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔"مصیبت تو یہ ہے کہ وہ بدبخت میرا نام بھی جانتا ہے۔تم ہی اس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی تدبیر بتاؤ۔"

نور گل تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔"اس سے کہہ دو کہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔یہ سنتے ہی وہ پیچھے ہٹ جائے گا۔"

"پاگل ہوئی ہو؟ یہ سن کر تو وہ اور بھڑک اٹھے گا۔ان مردوں کو رقابت کی آگ سب سے زیادہ جلاتی ہے۔وہ انتقاماً مجھے بدنام کرتا پھرے گا۔"

وہ قائل ہو کر بولی۔"تو پھر کہہ دو کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔بہت جلد شادی ہونے والی ہے۔اگر وہ واقعی محبت کرتا ہے تو تمہیں بدنام نہ کرے۔تمہاری زندگی سے چلا جائے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔"تم نے بھی اس کا خط پڑھا ہے۔وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔منگنی کا جھوٹ پکڑا جائے گا۔کوئی اور تدبیر سوچو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔"ویسے وہ تمہارا دیوانہ کم اور جاسوس زیادہ لگتا ہے۔اچھی طرح خبردار رہ کر تمہیں بھی خبردار کر رہا ہے۔"

وہ بولی۔"اس وادی کی ہزاروں لڑکیاں ایسی ہیں"جو محبت کسی سے کرتی ہیں اور بیاہ کر کسی اور کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ہمارے معاشرے میں محبت کا انجام شادی نہیں ہوتا۔پھر بھی دل کے معاملات کسی کی نہیں مانتے۔جہاں جواں دل دھڑکتے ہیں وہاں محبت گنگناتی ضرور ہے۔"

راج محمد کے اندر محبت گنگنا نہیں رہی تھی 'چٹکیاں مار رہی تھی۔اس نے پہلی بار سندس کا سامنا کیا تھا۔اس کے رویے میں جو بے نیازی اور بے اعتنائی تھی،وہ اسے حد درجہ مایوس کر رہی تھی۔دماغ میں ایک ہی سوال انکا ہوا تھا۔"وہ خط کا جواب دے گی یا نہیں؟اور جواب میں پھول کھلیں گے یا کانٹے چبھیں گے؟"

دوسرے دن اسکول کے گیٹ پر نہ کبوتر آیا،نہ کبوتر نامہ۔۔۔ساری لڑکیاں ایک ایک کر کے آگے سے گزر گی ءں۔ایسا لگ رہا تھا 'اسکول کی چھٹی کے ساتھ اس کے پیار کی بھی چھٹی ہو گئی ہے۔

راج محمد کی نظریں بہ دستور اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ دیدار یار کے لیے ترستی ہوئے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ مایوسی پر مُہر لگاتا جا رہا تھا۔ لیکن آس تھی کہ ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ رزاق اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ زیر لب گنگنانے لگا۔ "انتہا ہو گئی انتظار کی۔۔۔ آئی نہ کچھ خبر میرے یار کی۔۔۔۔"

راج محمد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تو میرا مذاق اڑا رہا ہے؟"

"تمہیں۔ میں تو گانا گا رہا ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر تک اسکول کے گیٹ کو دیکھتا رہا پھر بے چین ہو کر بولا۔ "وہ باہر کیوں نہیں آ رہی ہے؟"

رزاق نے بیزاری سے کہا۔ "آدھے گھنٹے سے سمجھا رہا ہوں۔ وہ اسکول نہیں آئی ہے پھر اندر سے بر آمد کیسے ہو گی؟"

"تجھے کیسے پتا۔۔۔؟"

"پورا اسکول خالی ہو گیا۔ وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ آج اس نے چھٹی کی ہے۔"

"مگر کیوں۔۔۔۔؟"

"اس کا جواب تو ہی جانتا ہے۔ سچ بتا تو نے خط لکھا تھا یا کوئی ڈراؤنی کہانی لکھ دی تھی؟ یا محبت سے انکار پر اسے گولی مانے کی دھمکی دی تھی؟"

اس نے ناراضی سے کہا۔ "کیوں فضول باتیں کر رہا ہے۔ ذرا میرے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچ، ہو سکتا ہے وہ میرے اظہار محبت پر شرما گئی ہو۔"

وہ بڑی لگاوٹ سے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ کل وہ اسے چھُو کر گئی تھی۔ اس کا ریشمی لمس جیسے اسے تھپکیاں دے رہا تھا کہ پھول سے جذبات رکھنے والیاں پتھر نہیں مارتیں۔ وہ موم سے بنی ہے۔ آج نہیں تو کل محبت کی آنچ میں پگھلنے لگے گی۔

رزاق نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ پیاسی ہوتی تو پانی پینے ضرور آتی۔ یکطرفہ محبت بھیک مانگنے کی طرح ہوتی ہے۔ میرے یار۔۔۔"!

"مجھے اس کی خیرات بھی قبول ہے۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "کیوں ایک لڑکی کے سامنے خود کو اتنا گرا رہا ہے؟ وہ تجھ سے محبت نہیں کرے گی۔ خدا کا واسطہ۔۔۔ اپنا راستہ بدل لے۔"

"تو اپنی قیاس آرئیاں اپنے پاس ہی رکھ۔ یہ لڑکیاں محبت کے معاملے میں بڑی شرمیلی ہوتی ہیں۔ وہ فی الحال اقرار نہیں کرے گی۔ مگر میں جانتا ہوں، انکار بھی نہیں کرے گی۔"

اس نے بیزاری سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ادھر دیکھ۔۔۔۔! اسکول کا گیٹ بند ہو گیا ہے۔ ہمیں بھی چلنا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے مایوسی سے ادھر دیکھا پھر ایک گہری سانس لیتے

ہوئے کہا۔ "آج اسے نہیں دیکھا تو لگ رہا ہے جیسے میرے ہی دل سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔"

"اور تیری حالت دیکھ کر مجھے یہ سبق مل رہا ہے کہ محبت اچھے خاصے انسان کو نکما بنا دیتی ہے۔ دل لگانے سے بہتر ہے بندہ دل لگی کرتے ہوئے ہشاش بشاش رہا کرے۔"

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "بے وقوف! دل لگایا نہیں جاتا۔۔۔لگ جاتا ہے۔ محبت تو جینا سکھاتی ہے۔ زندگی کو رنگین بتاتی ہے۔"

راج محمد کا دل سندس کی غیر حاضیر میں انکا ہوا تھا۔ اس نے اسکول نہ آکر اسے الجھن میں ڈال دیا تھا اور یہ الجھن اس کی آمد پر ہی سلجھنے والی تھی۔

وہ اپنی دکان میں آکر گم صم بیٹھا رہا۔ نہ دکانداری میں دل لگ رہا تھا۔ نہ گھر داری میں۔۔۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق نے اُسے گھر کا رکھا تھا نہ گھاٹ کا۔۔۔

دوسرے دن اسکول کی چھٹی ہوئی تو وہ بے چینی سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی خوشی سے چہک کر بولا۔ "آج وہ آئی ہے۔" وہ نور گل کے ساتھ عمارت سے باہر آرہی تھی۔ راج محمد کو دیکھ کر دور ہی سے ایسے کترا گئی جیسے اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔ محبوبہ کی ایسی بے رُخی نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے رزاق سے کہا۔ "وہ۔ وہ مجھے کیوں نہیں دیکھ رہی ہے؟"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "وہ تجھے دیکھتی ہی کب ہے؟ ہمیشہ گھورتی ہے۔"

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ اس کے رویے سے میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

وہ نور گل کے ساتھ ان سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تڑپ کر بولا۔ "میں ابھی اس کے پیچھے جاتا ہوں اُس سے بات کرتا ہوں۔ اسے خط کے جواب میں کچھ تو کہنا چاہیے۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے جانے لگا۔ ان کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ وہ دوڑنے کے انداز میں چل رہا تھا۔ اس مخصوص گلی میں پہنچتے ہی اس نے پکارا۔ "سنو۔۔۔"

وہ چلتے چلتے ایک دم سے ٹھٹک گی ء ں۔ راج محمد نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بے رخی کیوجہ جاننے آیا ہوں۔ کیا میں نے خط میں کچھ غلط لکھ دیا تھا؟"

وہ پلٹ کر سخت لہجے میں بولی۔ "شریف لڑکیوں کو پریشان کرنا شاید تمہارا مشغلہ ہے؟"

"میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ بس یہ پوچھنے آیا ہوں کہ۔۔۔"

اس نے ایک ذرا ہچکچا کر نور گل کو دیکھا۔ پھر سندس سے کہا۔ "میرے خط کا جواب کیا ہو گا؟"

"وہ خط جواب کے قابل نہیں تھا۔"

"یعنی تم جواب دینے کے قابل نہیں ہو۔ جواب میں نہ محبت لکھ سکتی تھیں نہ نفرت۔۔۔ ابھی تک الجھن میں ہو۔ اپنی سہیلی سے پوچھ لو۔ تمہاری اس الجھن کے پیچھے محبت چھپی ہوئی ہے۔"

راج محمد نے جیسے اس کے دل کے چور کو پکڑ لیا تھا۔ اس نے جھینپ کر نور گل کو دیکھا۔ وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ سندس نے منہ پھیر کر کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔"

وہ پلٹ کر نور گل کے ساتھ سے جانے لگی۔ وہ پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "شاید تم محبت کو جرم سمجھتی ہو۔ اس لیے ڈراتی ہو؟"

وہ رک کر بولی۔ "محبت وہ حماقت ہے جو نادانیوں سے شروع ہو کر بدنامیوں پر ختم ہوتی ہے۔ اور میں بدنام نہیں ہونا چاہتی ۔ مجھ سے کسی تعلق کی توقع نہ رکھو۔"

اس نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر سہیلی کے ساتھ چلتی ہوئی اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ راج محمد کا دل اس بری طرح ٹوٹا تھا کہ پل بھر کو ایسا لگا۔ جیسے وہ دھڑ کنا بھول گیاہ۔ وہ ایک درخت کا سہارا لیتا ہو زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ گلی محبوبہ کے وجود سے خالی ہو گئی تھی۔ مگر اس کی یہ بات کانوں میں گونج رہی تھی۔ جیسے اسے ٹھوکریں مار ہی تھی۔ "مجھ سے کسی تعلق کی توقع نہ رکھو۔۔۔۔"

اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ سینے میں لرزتا ہوا دل ہولے کہہ رہا تھا۔ "کیا اسی جواب کے لیے ایک برس سے اس کی راہیں تک رہا تھا؟ وہ سنگدل حسینہ تیری چاہت کے قابل نہیں ہے۔ اسے بھول جا۔۔۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر زیر لب بولا۔ "میں سانس لینا بھول سکتا ہوں۔ مگر اسے نہیں بھلا سکتا۔۔۔۔"

"اُس پتھر کو پوجنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"محبت اپنا صلہ نہیں مانگی۔ میں اس کی چاہت نہ بن سکا۔ مگر وہ ہمیشہ میری چاہت رہے گی۔ میں اسے نہیں بھلا سکتا۔۔۔ کبھی نہیں بھلا سکتا۔۔۔۔"

وہ دن کسی طرح گزر گیا۔ رات نہیں گزر رہی تھی۔ سندس اُس کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی۔ پھر بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے صندوق سے ایک چاقو نکال کر اسے کھولا۔ بلب کی روشنی میں اس کی تیز دھار چمک رہی تھی۔ اس کی نوک سندس کو پکار ہی تھی۔ "آؤ دیکھو۔۔۔۔ تمہارا پیار میرا لہو مانگ رہا ہے۔"

اس نے سیدھے ہاتھ سے چاقو کو تھام لیا۔ پھر الٹے ہاتھ کے پہونچے سے کلائی تک اس کا نام لکھنے لگا۔ اسے دیوانگی بھی کہہ سکتے ہیں اور پاگل پن بھی۔۔۔۔ محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ عقل سے خالی کر دیتی ہے۔

اُس کی نوک کھال میں چھبی اور گوشت میں اتر گئی۔ وہ جلی حرف میں ایس (S) لکھنے لگا۔ "ایس۔۔۔۔۔ ہاں۔ تیرا نام دل پر تو نقش ہے پر تجھے نظر نہیں آتا۔ اب دیکھ سکے گی۔"

پھر اُس نے یو (U) لکھا۔ "محبت گواہی چاہتی ہے۔ اے میرے خونِ جگر کھل کر گواہی دینا۔"

پھر این (N) لکھا۔ "گھر کے دروازے سے قبر کے کتبے تک اس کے مکیں کا نام لکھا جاتا ہے۔ میں اپنے وجود کے مکان پر تیرے نام کی تختی لگا رہا ہوں۔"

لہو کی دھار ڈی (D) لکھنے لگی۔ "تو نے ڈیرا جما لیا ہے۔ دل میں دماغ میں جو اس پر اعصاب پر۔۔۔ قیامت کے روز یہ ہاتھ تیرا ہی نام لے کر قبر سے اٹھے گا۔"

وہ ہاتھ تقریباً لہو میں ڈوب گیا تھا۔ اُس نے لہو کو پونچھتے ہوئے لکھنے کی جگہ بنائی۔۔۔ اے (A)۔۔۔ اے سندس۔۔۔!

تیرا ریشمی نام میرے لہو میں بھیگ رہا ہے۔ سنا ہے جو محبت لہو روتی ہے وہ دل پہ اثر کرتی ہے۔"

آخری حرف ایس (S) بھی لہو میں ڈوب کر ابھرنے لگا۔ "انتہا ہو گئی "میرے پیار کی۔۔۔ کیا اس انتہا کی اب بھی ابتدا نہیں کرے گی؟"

کسی کو قتل کرنے کے لیے اتنی چھریاں نہیں چلیتیں، جتنی وہ خود پر چلا چکا تھ۔ ایک ایک حرف سے ابھرنے والا لہو رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے ٹب کے پانی کی ٹھنڈک میں اس ہاتھ کو ڈبو دیا اور وہیں نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن اس نے پوری آستین کی قمیص پہنی تا کہ رزاق زخمی نام اور پیار کی زخمی پہچان کو نہ دیکھ پائے۔ وہ پیار کی پبلسٹی نہیں چاہتا تھا۔ صرف سندس کو سمجھانا چاہتا تھا کہ اس کی بے رُخی اسے کس طرح کچوکے لگا رہی ہے۔

اس دن وہ اسی سنسان گلی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ چھٹی ہوئی تو سندس نے گیٹ سے باہر آتے ہی بے اختیار اُدھر دیکھا، جدھر وہ پچھلے ایک برس سے آسن جمائے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ وہاں نظر نہیں آیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پہلی بار یوں لگا جیسے وہ خالی خالی سی ہو گئی ہے۔ اندر بیٹھنے والا کہیں چلا گیا ہے۔

اس دیوانے نے اسے لاشعوری طور پر اپنا عادی بنا لیا تھا۔ وہ کبھی سمجھ ہی نہ پائی کہ انجانے میں اس کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔ نور گل نے حیرانی سے کہا۔ "وہ کدھر گیا؟ وہ تو ایسا دیوانہ ہے کہ موت ہی اسے یہاں سے اٹھا سکتی ہے۔"

سندس نے چونک کر تڑپ کر اسے دیکھا پھر ڈوبتے ہوئے دل سے آگے بڑھ گئی۔ گل بانو نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تم نے اُس کا دل توڑا ہے۔ بے چارے کو بُری طرح گھائل کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں وہ صدمے سے بیمار پڑ گیا ہو؟"

پہلی بار سندس کے دل نے کہا۔ "وہ بیماریوں سے اور

آندھیوں سے لڑنے والا لگتا تھا۔ پھر کیوں نہیں آیا؟ اگر اُس نے پیچھا چھوڑ دیا ہے تو چلو اچھا ہی ہے۔ بدنامی کے خوف نے نجات تو مل گئی۔"

وہ سنسان گلی میں پہنچتے ہی ٹھٹک گئیں۔ سایہ ہمیشہ پیچھے تو نہیں رہتا آگے بھی آجاتا ہے۔ دونوں سہیلیوں نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ سر جھکا کر اس سے کترا کر جانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ انداز تو یہی تھا کہ راستہ روک رہا ہے۔ وہ غصے سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اُس ہاتھ کی آستین یوں اُلٹ گئی جیسے بازی پلٹ گئی ہو۔

اُس ہاتھ پر اپنا نام پڑھتے ہی حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ نور گل نے شدید حیرانی سے کہا۔ "سندس! یہ تمہارا نام ہے۔"

نام کے ایک ایک حرف پر لہو کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ سندس کو اپنی ایک ایک سانس چاقو کی نوک کی طرح چبھ رہی تھی۔ دل اُس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ ہر سوائی خوفزدہ کر رہی تھی۔ وہ دونوں ہوتھوں سے منہ ڈھانپ کر روتے ہوئے بولی۔ "یا خدا! یہ تو میری بدنامی کا اشتہار ہے۔ یہ تم نے کیا کیا ہے؟ تم جہاں جہاں جاؤ گے، یہ ہاتھ میر نیک نامی پر مٹی ڈالتا رہے گا۔"

راج محمد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے اس پہلو سے

علی، احمد اور داستانِ دل

علی: یار داستانِ دل باقی ڈائجسٹ سے کیسے مختلف ہے؟

احمد: یار داستانِ دل میں تحاریر بھیجنا بہت آسان ہے۔ آپ اپنی تحاریر ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یا پھر وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں اور سب انوکھی بات ہم اپنی شاعری کو ایس ایم ایس کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں

تم اب بھی مجھ میں بستے ہو
میرے سانسوں کی ردھم مجھے بتاتی ہے
گہری شام کی اداسی مجھے بناتی ہے
تم اب بھی مج میں بستے ہو
یوں پہروں بیٹھ کر تمہیں سوچنا
تنہائی میں بھی تمہاری قربت محسوس کرنا
مجھے یہ بتاتا ہے کہ تم اب بھی مجھ میں بستے ہو
خیالوں ہی خیالوں میں تم سے باتیں کرنا
تمہاری بے اعتنائیوں کا شکوہ کرنا
پھر روٹھ کر خود ہی مان جانا
مجھے یہ بتاتا ہے کہ تم اب بھی مجھ میں بستے ہو

از قلم شازیہ

سوچا ہی نہیں تھا کہ جہاں جائے گا وہاں سندس کا نام اس کے وجود سے چپکا رہے گا۔ اُس پردہ نشین کو کب تک اپنی آستین میں چھپا کر رکھے گا؟ سات پردوں کے پیچھے سے بھی راز عیاں ہو جاتے ہیں۔ وہ اُسے کب تک ڈھانپ کر رکھ سکتا تھا؟

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "خدا گواہ ہے میں نے تمہیں بدنام کرنے کے لیے نہیں اپنے پیار کی انتہا جتانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ میری نیک نیتی کو سمجھو۔"

نور گل نے کہا۔ "اس کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟ تم دنیا والوں کو کیا سمجھاؤ گے؟ اُن سے کیا کہو گے کہ کس رشتے سے تم نے اس نام کو لہولہو کیا ہے؟"

"میں اس سے آگے بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ سندس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ لیکن اسے بدنام کرنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتا۔"

"تو پھر یہ ہاتھ دنیا والوں سے کیسے چھپاؤ گے؟ کیا اسے کاٹ کر پھینک دو گے؟"

"ہاں۔ کاٹ کر پھینک دوں گا۔ اسے بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ بس ایک بار۔۔۔۔ صرف ایک بار یہ کہہ دے کہ میں اس کے دل میں دھڑکتا ہوں۔"

نور گل نے کہا۔ "یہ بے شرم نہیں ہے کہ ایسی بات زبان پر لائے۔"

"زبان سے نہ کہے میرے خط کے جواب میں دل کی دھڑکنیں پیش کر دے۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ میرے خط کا جواب دیا جا سکے؟"

نور گل سندس کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔ "یہ مان لو کہ تم نے اُس پر ظلم کیا ہے۔ اب بدنامی سے بچنا چاہتی ہو تو ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ کل خط کو جواب لکھ دو گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "مگر۔۔۔۔ مگر میں کیا لکھوں گی؟ اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ میرا نام اس کے ہاتھ سے مٹ جائے گا؟ یہ نام تو اس کی کھال اور گوشت میں اترا ہوا ہے۔ کیسے مٹے گا؟"

"ٹھہرو۔۔۔۔ میں بات کرتی ہوں۔"

وہ راج محمد کے پاس آ کر بولی۔ "کل تمہیں خط کا جواب ضرور ملے گا۔ مگر تم میری سہیلی بدنامی سے کیسے بچاؤ گے؟"

"میں یہ ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"پاگل پن کی باتیں نہ کرو۔ کوئی لڑکی کسی اپاہج سے محبت نہیں کرتی۔ بس کسی طرح اس نام کو مٹا ڈالو۔"

"میں ابھی جا کر مٹا دوں گا۔ کوئی اس نام کا ایک حرف بھی نہیں پڑھ سکے گا۔"

وہ وہاں سے چلا آیا۔ یہ سوچ کر دل مسرتوں سے بھرا ہوا تھا کہ بڑی تگ و دو کے بعد کل محبوب کا محبت نامہ ملے گا۔ اب

مسئلہ یہ تھا کہ نام کو کیسے مٹایا جائے؟

وہ ہاتھ کاٹ کر پاہج نہیں بننا چاہتا تھا۔ اُس پر وحشت طاری تھی۔ سندس کے پیار میں ایسا اذیت پسند ہو گیا تھا کہ چاقو سے اُس ہاتھ کی پوری کھال اتار سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بازار سے تیزاب کی ایک بوتل لے کر اپنے کمرے میں جا کر بندہ ہو گیا۔

اُس بند کمرے میں وہ دیوانہ، پاگل، مجنوں جانے کیا کر رہا تھا؟ اُس کی ہلکی ہلکی کراہیں اور کبھی کبھی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایسی خاموشی چھا گئی، جیسے زندگی آرام سے سو گئی ہو۔

***

سحری کا وقت ختم ہوتے ہی دور و نزدیک کی مسجدوں سے "اللہ اکبر" کی صدائیں گونجنے لگیں۔

بے شک۔۔۔۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ شمالی علاقہ جات کے دیو ہیکل پہاڑ اور پُر ہیبت چٹانیں اس ذات واحد کی بزرگی کا پتا دیتی تھیں۔

ان فلک بوس چوٹیوں پر بنے خوبصورت آشیانوں سے وہاں کے باسیوں کا استقلال جھلکتا رہتا تھا۔ یہ کوہساروں پر راج کرنے والے جفاکش صدیوں سے ان چٹانوں کو مسخر کرتے چلے آ رہتے ہیں۔ ایسی ہی سر سبز و شاداب وادیوں سے متاثر ہو کر وصی شاہ نے کہا۔۔۔؟

میرے مولا! تیری جنت سے جدا لگتی ہے
میری دھرتی مجھے معصوم دُعا لگتی ہے۔

سندس کا گھر ایک بلند و بالا پہاڑ کے سینے پر طرہ امتیاز کی طرح سجا ہوا تھا۔ تیسرے روزے کا آغاز ہو چلا تھا۔ سُندس کی ماں نے کہا۔ "وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے؟ آج تیسرا روزہ ہو گیا۔ اسی طرح تیس ہو جائیں گے اور پتا بھی نہیں چلے گا۔"

شیر و نے کہا "میں اسکول جاتا ہوں۔ مجھے پتا چلتا ہے۔ لنچ ٹائم میں بہت بھوک لگتی ہے۔ ایک ایک روزہ گن گن کر گزار رہا ہوں۔ "

ماں مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب برداشت نہیں ہوتا تو روزہ کیوں رکھتے ہو؟ چلو۔۔۔۔ اب جلدی سے نماز پڑھو۔ پھر اسکول کی تیاری کرنی ہے۔"

وہ وضو کے لیے چلا گیا۔ اسکول کے ذکر پر سندس پھر پریشان ہونے لگی۔ وہ پھر راستہ روک کر خط کا جواب مانگنے والا تھا۔

اس دیوانے کے عشق نے اور اس کی مجنونانہ حرکت نے پہلی بار اس کے ذہن کو متاثر کیا تھا۔ دل کو جکڑ لیا تھا۔ وہ رات گئے تک کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ خط کا جواب دے کر بدنام نہیں ہوا چاہتی تھی۔ یہ اندیشہ حاوی تھا کہ وہ خط ہاتھ سے بے ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اپنوں اور غیروں میں اسے بے حیا، بے شرم بنا سکتا ہے۔ وہ مفت کی رسوائیاں مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی اور یہ چاہتی رہی کہ اس رات کی صبح نہ ہو۔ نہ صبح ہو، نہ اسے جواب لکھنا پڑے۔ نہ دن نکلے نہ وہ راستہ روکنے آئے۔ اس عاشق کی دیوانگی نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جو اس کا نام اپنی کھال اور گوشت میں اُتار سکتا ہے وہ اسی چاقو کو اپنے سینے میں اُتار سکتا ہے۔ اس کے سامنے پہاڑ کی بلندی سے موت کی پستیوں میں جا سکتا ہے۔

اس نے گھبرا کر دعا مانگی۔ "یا خدا۔۔۔۔! قیامت آجائے پر ایسا وقت نہ آئے کہ مجھے خط لکھنا پڑے اور نہ لکھوں تو وہ دیوانہ جان دیدے۔ ایسا وقت آنے سے پہلے میں مر جاؤں۔ یہ دنیا میرے لیے مر جائے۔"

پورا مظفر آباد نیلگوں فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ سُندس کی مرضی کے خلاف وہ صبح بھی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جنم لے رہی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے ابھرتا ہوا سورج حسب معمول روزانہ کی مصروفیات کے لیے پکار رہا تھا۔ زندگی میں لین دین کا جو دستور ہوتا ہے۔ اس کا وقت شروع ہو چکا تھا۔

اور یہ لین دین کا معاملہ سُندس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اس نے سوالی خط لیا تھا۔ اب اسے جوابی خط دینا تھا۔ شیر و اسکول جا چکا تھا۔ ماں نے پوچھا۔ "تم نہیں جاؤ گی؟"

ماں نے اسکول جانے کی بات کی۔ اسے یوں لگا جیسے پھانسی کے تختے پر جانے کو کہا گیا ہے۔ وہ کمرے میں آکر سوچنے لگی۔ "کیا کروں؟ خدایا۔۔۔۔! میں کیا کروں۔۔۔؟ کہاں جاؤں۔ کیا جتن کروں کہ وہ دیوانہ مجھے بھول جائے؟۔۔۔ ایسی کوئی صورت نہیں ہے۔ بچپن سے سنتی آرہی ہوں کہ قیامت آنے والی ہے۔ ہمارے باپ دادا بھی سنتے سنتے اس دنیا سے گزر گئے۔ بس بہت ہو چکا۔ یا اللہ! اس سے پہلے کہ میں کسی مشکل میں پڑوں، قیامت آہی جائے تو اچھا ہے۔"

کبھی کبھی منہ سے نکلی ہوئی دعا عرش تک پہنچنے سے پہلے ہی فرش کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ اسی لمحے میں ای زوردار جھٹکا سا لگا۔ جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی گر پڑی۔ صرف اس کا ذہن ہی نہیں، در و دیوار بھی جھٹکے کھا رہے تھے۔ وہ اس اچانک اُفتاد پر بُری طرح بدحواس ہو گئی تھی۔ فوراً ہی سنبھل کر اُٹھنا چاہتی تھی کہ ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ چیختی ہوئی اچھل کر ایک بڑے سے صندوق کے پاس آگری۔ منہ سے نکلی ہوئی دعا قبول ہو رہی تھی۔ دیواریں گر رہی تھیں۔ چھت یوں سر پر آرہی تھی، جیسے آسمان ٹوٹ رہا ہو۔ ابھی زندگی تھی۔ ابھی قدرت یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ اپنی عمر سے زیادہ زندگی نہ مونگو اور موت سے پہلے قیامت کو نہ پُکارو۔ اس بڑے صندوق کے سائے میں پہنچنے کے باعث نہ اس پر چھت آئی نہ ہی گرنے والی دیوار نے اسے دبوچا۔ البتہ منتشر ہونے والے پتھروں نے اسے بُری طرح زخمی کر دیا۔ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے ماں کو پُکارا تو عقل نے

سمجھایا کہ ماں بھی ایسی ہی قیامت سے دوچار ہو رہی ہو گی۔
وہ حواس باختہ سی ہو کر اُدھر جانا چاہتی تھی۔ لیکن جھٹکوں کی شدت اور چاروں طرف سے گرنے والے سامان کے باعث فرش پر آگے گھسٹ کر جانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دیو اُس گھر کے در و دیوار کو جھنجوڑ رہا ہے۔ چیزوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی زور دار آوازوں کے ساتھ اُس نے ایک چیخ ماری۔ "ماں جی۔۔۔۔"!
باہر لوگوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ پتا نہیں ماں نے جواب دیا تھا یا نہیں؟ بیٹی کی آواز اُس کے کانوں تک پہنچی تھی یا نہیں؟ اعصاب کو بُری طرح متاثر کرنے والے جھٹکوں نے کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔
دیکھتے ہی دیکھتے وہ خوبصورت آشیانہ اُلٹ پلٹ گیا تھا۔ وہ چارپائی جس پر ماں تھوڑی دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ الٹ کر ماں کے اوپر آ پڑی تھی۔ گھر کی چار دیوار جو تحفظ کی ضامن تھی۔ وہ خوفناک آوازوں کے ساتھ زمین بوس ہو چکی تھی۔
گرد و غبار کے بادل سے چھا گئے تھے۔ غبار کے دھند لکے میں کچھ کچھ ایسے دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے زندگی کے آثار مٹتے جا رہے ہوں۔
فوری طور پر یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ قیامت آ گئی ہے۔ صورِ اسرافیل پھونکا جا رہا ہے۔ سُندس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ قبولیت کی گھڑی میں اس کے منہ سے دعا نکلی

زندگی الجھ گئی ہوں میں
کتنا سنبھالوں خود کو
اب بس بکھر سی گئی ہوں میں
ہنستی ہوں مسکراتی ہوں
ہر اک سے حالِ دل چھپاتی ہوں میں
ہر اک سے خلوص اور محبت سے ملکر
خلوص اور محبت نہ پا کر اشک بہاتی ہوں میں
زندگی کو کچھ پل سوچوں کیا ہے
یہ ویسی تو نہیں جیسے سپنے میں نے سنجوے
زندگی اتنی کٹھن کیوں ہے
منزل دور اور راہیں نہ ہموار ہیں
پریشان سی ہر جانب دیکھتی ہوں میں
کوئی ساتھ نہیں کتنی تنہا اکیلی ہوں میں
زندگی تو اپنوں کے سنگ گزارنا چاہی تھی ہر دم
اپنوں نے ہی زندگی کو کر دیا ہے تنگ
کتنا ضبط کتنا حوصلہ کروں میں
کب تک ہر بات سہتی رہوں میں
ایسا تو نہیں کہ بہت بری ہوں میں
میں کب کہہ رہی ہوں کہ بہت اچھی ہوں میں
کہنے سننے کو تو جانے دو نور
نگاہوں میں ہے حقارت کیا اسی قابل ہوں میں
زندگی مختصر ہے گلے شکوے بھلا کر
مسکرا دو کہ مسکرا رہی ہوں میں

از قلم۔ ریما نور رضوان

تھی وہ پوری ہو رہی ہے۔ زمینی جھٹکوں کی شدت ایسی تھی جیسے ان پہاڑوں کو سیکڑوں فٹ اوپر اٹھا کر نیچے پٹخ دیا گیا ہے۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا؟ وہ اپنے گھر کے ملبے میں اوندھی پڑی رہی۔ پھر اس نے ایک ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں اوپر نیچے چاروں طرف ٹوٹی پھوٹی چیزوں اور پتھروں کے ڈھیر کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ملبے میں زندہ در گور کر دیا گیا ہو۔ وہ کھانستے ہوئے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ آنکھوں میں مٹی کے ذرات چبھ رہے تھے۔ منہ کے اندر بھی مٹی مٹی سی ہو گئی تھی۔

پورا بدن جیسے ٹوٹ پوٹ سا گیا تھا۔ کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جہاں تکلیف کا احساس نہ ہو رہا ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر زخمی سر ایک طرف ڈھلک کر دوبارہ زمین پر ٹک گیا۔

وہ بے دم سی پڑی ہوئی تھی۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں میں بیتی ہوئی قیامت کا لرزہ خیز منظر گھوم رہا تھا۔ ایسی تباہی کے بعد کوئی کیسے بچ سکتا تھا؟ وہ تھوڑی دیر تک یونہی پڑی رہی۔ اپنے ہونے اور نہ ہونے کا اندازہ کرتی رہی۔ ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ زلزلے کا خیال نہیں آیا۔ بس ایک ہی بات ذہن میں تھی کہ قیامت آگئی ہے۔ پھر وہ ایک دم سے چونک کر سیدھی ہوتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔ "ماں جی۔۔۔۔؟"

اس قبر نما جگہ میں اتنی گنجائش تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ آخری وقت ماں کو کس طرف دیکھا تھا؟ اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اسے پکارا۔ "ماں جی۔۔۔!"

پھر خاموش ہو کر جواب کا انتظار کرنے لگی۔ کوئی آہٹ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سناٹا وہ تنہائی اعصاب چٹخا رہی تھی۔ اس نے بھیگی ہوئی آواز میں دوبارہ اسے پکارا۔ "ماں جی۔۔۔! تم کہاں ہو؟"

وہ پھر کان لگا کر سننے لگی۔ حواس باختہ سی ہو کر دائیں بائیں ملبے کے ڈھیر کو تکنے لگی۔ شاید اس پتھر کے نیچے سے۔۔۔۔ نہیں اُس لکڑی کے پیچھے سے۔۔۔۔ اس سلیب کے نیچے سے ۔۔۔۔ماں کی آواز سنائی دے گی۔ مگر بہ دستور خاموشی چھائی رہی۔ وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے بولی۔ "ماں جی۔۔۔! تم کہاں ہو۔۔۔؟"

وہ تو جیسے قبر میں تھی۔ دائیں بائیں اوپر نیچے شکستہ دیواروں کے بڑے بڑے چٹانی ٹکڑے اور مٹی ہی مٹی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ذہن نے چیخ کر کہا۔ "ماں بھی ایسی ہی کسی قبر میں پڑی ہو گی۔"

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسو مٹی سے اٹے ہوئے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ اس دیوانے کو

محبت کا جواب محبت سے دینے سے پہلے قیامت آگئی تھی۔
آہ۔۔۔!دل سے نکلی ہوئی نادان آرزو دعا بن کر شرف قبولیت حاصل کر چکی تھی۔
کہیں سے کوئی سسکاری سی ابھری۔ وہ فوراً ہی کان لگا کر سننے لگی۔ دبی دبی سی کراہوں سے دودھ کی شناخت مل رہی تھی۔ اس نے دائیں طرف جھکتے ہوئے بڑے جذبے سے چلا کر کہا۔ "ماں جی۔۔۔۔!"
وہ جلد جلدی اس طرف کے پتھروں کو ہٹانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہاں ایک شگاف بنتا چلا گیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ ماں بڑی بے کسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ چار پائی کے نیچے تھی۔ اس لوہے کی چارپائی پر دیوار کا ایک حصہ آگرا تھا۔ دیوار سیدھی اس پر نہیں آئی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چار پائی نے گرنے والے پتھروں کو ہٹاتے ہوئے اس شگاف کو کشادہ کر رہی تھی۔ پھر ایک ہاتھ وہاں سے گزار کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے بولی۔ "ماں جی۔۔۔۔!تم ٹھیک تو ہونا۔۔۔۔؟"
اس نے بڑی نقاہت سے سر گھما کر بیٹی کو دیکھا۔ پھر گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے ایک بار پلکیں جھپکائیں۔ اس نے زبان سے نہیں آنکھوں سے جواب دیا تھا۔ بیٹی نے کہا۔ "منہ سے کچھ بولو ماں جی۔۔۔!ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم قبرستان میں ہیں اور ہمارے لیے ساری دنیا مر چکی ہے۔"
ماں نے بڑی تکلیف سے کراہتے ہوئے ایسے دیکھا جیسے مدد طلب کر رہی ہو۔ وہ پہلی بار ماں کی آنکھوں کو رحم کی بھیک مانگتے دیکھ رہی تھی۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "ہم پر یہ قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ کوئی ہماری مدد کو کیوں نہیں آرہا ہے؟ کیا ہماری طرح دوسروں پر بھی ایسی ہی قیامت آئی ہے؟"
وہ گرد و غبار کے باعث کھانسنے لگی۔ ایسے وقت ذہن نے سمجھایا کہ قیامت نہیں آئی ہے زلزلہ آیا ہے۔ سب ہی پر یہ اُفتاد آئی ہوئی ہے۔
وہ ایک طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ماں جی!میں دیکھتی ہوں۔ کسی کو مدد کے لیے بلاتی ہوں۔"
وہ ملبے کے ڈھیر تلے بیرونی دنیا سے کٹ گئی تھی۔ اس ڈھیر کے ایک طرف چھوٹے سے شگاف سے دن کا اجالا چھانک رہا تھا۔ وہ ادھر منہ کر کے مدد کے لیے پُکارنے لگی۔ باہر پھیلی ہوئی افراتفری میں اس کی وہ کمزور سی پکار کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ جانے کتنی سعتیں گزر گئیں؟ اس نے پلٹ کر مایوسی سے کہا۔ "لگتا ہے باہر کوئی نہیں ہے۔"
ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "ماں جی۔۔۔۔!تم ٹھیک تو ہونا۔۔۔۔؟"
اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سُندس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے تڑپ کر آواز دی۔ "ماں جی۔۔۔!ماں جی۔۔۔!"
ماں نے بڑی ہی نقاہت سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اُس پر

جیسے بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھر بند ہو گئی تھیں۔ بیٹی کو کتنے ہی اندیشوں نے گھیر لیا۔ ماں نے آنکھیں بند کر کے اسے اتنی بڑی دنیا کے قبرستان میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اس نے پلٹ کر باہر سے آنے والی روشنی کی طرف دیکھا۔ مصائب کے اندھیروں میں ایک ذراسی روشنی بھی حوصلہ دیتی ہے۔ اسے خود ہی حوصلے سے کچھ کرنا تھا۔ اندیشے کہہ رہے تھے۔ "ماں چپ ہے تو اسے زندگی کی صدائیں سناؤ۔ ورنہ زندگی چپ رہی تو ابھی زلزلے لے سے چھت گئی ہے ماں کا سایہ بھی چلا جائے گا۔"

وہ اس ملبے میں راستہ بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی احساس ہو گیا کہ وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔ زندگی کی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے تو پتھر یلے پہاڑوں میں بھی سُرنگ بنتی چلی جاتی ہے۔

اس کے نازک ہاتھ اس ملبے کو کرید رہے تھے۔ دیر سے سہی۔۔۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ ماں کے ساتھ زندہ سلامت اس قبر سے ضرور نکلے گی۔

***

جنت نظیر مظفر آباد پلک جھپکتے ہی کھنڈر بن گیا تھا۔ زلزلے کے جھٹکے آئے اور تمام مکانوں کو مکینوں سمیت زندہ در گور کرتے چلے گئے۔ جو مکانوں، دکانوں اور بڑی عمارتوں سے باہر تھے۔ وہ در گور تو نہیں ہوئے تھے۔ لیکن بُری طرح حواس باختہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ چند منٹوں میں کشمیر کا حسن اور دنیا کی رونق کیسے نابود ہو گئی ہے؟ وہ سردیوں میں کہسار کی دھند دیکھتے تھے۔ اُس وقت گرد و غبار کی دھند میں اپنی شناخت کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

ساری رونق حُسن اور شادابی ملبے میں دب گئی تھی۔ چند لمحوں بعد گرد و غبار کا طوفان کم ہوا تو تباہی کی نوعیت معلوم ہوتے ہی سب کے ہوش اڑ گئے۔ کوئی گھر سلامت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تمام عمارتیں، سرکاری دفاتر، اسکول کاروباری مراکز ہسپتال، مسجدیں سب ہی زمین بوس ہو گئی تھیں۔

ہر سمت سے آہ بکا اور چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ جو بچ گئے تھے وہ سیمنٹ، بجری اور پتھروں کے ڈھیر میں اپنے پیاروں کو تلاش کرنے لگے۔ کہیں زندگی کے آثار مل رہے تھے، کہیں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

راج محمد اور رزاق اپنی دکان کی طرف جا رہے تھے۔ ایسے وقت قیامت خیز زلزلے نے انہیں راسے میں ہی جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے سڑک پر گر پڑے۔ ہونقوں کی طرح آس پاس کی لرزتی، کانپتی اور پھر زور دار آوازوں کے ساتھ گرتی ہوئی عمارتوں کو دیکھنے لگے۔ چھوٹے بڑے پتھر اور مختلف سامان اُڑ اُڑ کر ایسے اُن کی طرف آ رہے تھے۔

جیسے آسمان سے پتھروں کی بارش ہو رہی ہے۔ پہاڑوں کو کبھی کسی نے ایک ذرا ہلتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ سوکھے پتوں کی طرح لرز رہے تھے۔

یہ سلسلہ چند سیکنڈ تک جاری رہا پھر جیسے لرزتی ہوئی زمین کو قرار آ گیا۔ ایک قیامت آکر گزر گئی۔ اپنی دہشت سے دلوں کو دہلا گئی اور دماغوں کو ماؤف کر گئی۔ وہ جس سڑک پر پڑے ہوئے تھے اس کے بیچوں بیچ نہ جانے کتنی فٹ گہری دراڑ دور تک پڑتی چلی گئی تھی؟

وہ تھوڑی دیر تک سہمے ہوئے سے پڑے رہے۔ بُری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے اور سمجھ میں آیا کہ زلزلہ آکر گزر گیا ہے تو وہ اپنے اوپر سے چھوٹے بڑے پتھروں کو ہٹاتے ہوئے اٹھ بیٹھے پھر یوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے جیسے روزِ محشر مُردوں کی طرح اپنی اپنی قبر سے نکل آئے ہوں۔ سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں دور تک کہیں لاشیں دکھائی دے رہی تھیں، کہیں زخمی کراہ رہے تھے۔ ہر طرف سے ماتمی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

لوگ بدحواس سے ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایک افراتفری کا عالم تھا۔ راج محمد دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یا خدا! یہ کیسی قیامت آ گئی ہے۔۔۔؟ یوں لگتا ہے، پوری دنیا غارت ہو گئی ہے۔"

اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ جو چادر وہ لپیٹے ہوئے تھا وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی؟ رزاق نے اپنے زخموں کو بھول کر راج محمد کے بائیں ہاتھ کو دیکھا۔ وہ ہاتھ کہنی کی طرف سے مڑا ہوا تھا اور بازو سے چپک گیا تھا۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ تیرا ہاتھ کیسا ہو گیا ہے؟"

وہ اس کے ہاتھ کو پکڑ کر سیدھا کرنا چاہتا تھا۔ راج محمد نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔ "یہ سیدھا نہیں ہو گا۔ کلائی اور بازو کی کھال ایک دوسرے سے چپک گئی ہے۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "مگر یہ ہوا کیسے۔۔۔؟"

وہ بتانا چاہتا تھا کہ سُندس کا نام تیزاب سے مٹاتے وقت تکلیف کی شدت سے ہاتھ مڑ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح ہاتھ رکھے تکلیف کو برداشت کرتا رہا۔ جب اسے سیدھا کرنا چاہا تو پتا چلا کلائی سے کہنی تک کی کھال بازو سے چپک گئی ہے۔ اب وہ اسے الگ کرنا چاہے گا تو بازو کی کھال بھی ادھڑنے لگے گی۔

وہ بہت کچھ بتانا چاہتا تھا مگر سُندس کا خیال آتے ہی تڑپ کر بولا۔ "یا خدا۔۔۔! پتا نہیں وہ کیسی ہو گی؟"

وہ تیزی سے اسکول کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ رزاق نے اسے روکنا چاہا لیکن جانتا تھا وہ دیوانہ نہیں رُکے گا۔ پھر اسے اپنے گھر والوں کی بھی فکر تھی۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ راج محمد اسکول کے قریب پہنچتے پہنچتے ایک دم سے رُک گیا۔ پریشانی سے ادھر دیکھنے لگا۔ اسکول کی وہ عمارت

کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح گھوم گھوم کر اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "سندس۔۔۔ سندس کا سکول۔۔۔۔؟ وہ اسکول کہاں گیا؟"

اسکول کے ملبے سے کتنی ہی طالبات کے رونے اور کراہنے کی آوازوں نے اسے متوجہ کیا۔ وہ ادھر دیکھنے لگا۔ پھر لپک کر اس طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "وہ اسکول کے ملبے میں ہو گی۔"

کتنے ہی لوگ وہاں دوڑتے چلے آرہے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ طالبات کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اِدھر سے اُدھر دوڑتا ہوا ملبے میں جھانک کر سندس کو تلاش کرنے لگا چھتیں اور دیواریں یوں گری ہوئی تھیں کہ دو چار لڑکیوں کے ہی زندہ بچنے کی توقع تھی۔ کسی کے ہاتھ کسی کے پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔ چھت کے اور دیواروں کے بڑے بڑے چٹانی ٹکڑوں کو ہٹانا انسانی ہاتھوں کے بس میں نہیں تھا۔

وہ ہتھوڑوں سے پتھروں اور چٹانوں کو توڑنا چاہتے تھے۔

لیکن نیچے دبی ہوئی لڑکیاں تکلیف سے چیخنے لگتی تھیں۔ بڑی دیر بعد پتا چلا کہ وہاں صرف دو چار ہی زندہ ہیں اور اُن میں سندس نہیں تھی۔

اس کا ایک پڑوسی اپنا سر پیٹتا اور بال نوچتا آرہا تھا۔ راج محمد کو دیکھ کر بولا۔ "کچھ نہیں بچا۔ نہ جان بچی نہ مال بچا۔ تمارے گھر کی دیواریں بھی بیٹھ گئی ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

عشق بہت ہی خود غرض ہوتا ہے۔ معشوق کے آگے ساری دنیا کو بھلا دیتا ہے۔ پڑوسی نے کہا تو گھر والوں کی یاد آئی۔ وہ تیزی سے ادھر دوڑتا چلا گیا۔

***

ملبے کو ہٹاتے ہٹاتے سُندس کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اتنی محنت کے بعد کسی حد تک کامیابی ہوئی تھی۔ باہر نکلنے کا راستہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل سکتی تھی۔ مگر ماں کو چھوڑ کر باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

اُسے پیدا کرنے والی جہاں پڑی ہوئی تھی وہاں تک وہ شگاف سے گزر کر نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ ایک چارپائی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ وہ ایسی حالت میں تھی کہ خود اپنے وجود کو گھسیٹ کر بیٹی کے پاس نہیں آسکتی تھی۔ لوہے کی چارپائی نے ایک شکستہ دیوار کو روکا ہوا تھا۔ وہ عارضی سہارا کسی بھی وقت ساتھ چھوڑ سکتا تھا۔

سُندس تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ ماں کو بچانے کی تدبیر سوچتی رہی۔ پھر اوندھی لیٹ گئی اپنے دونوں ہاتھوں کو اس شگاف سے گزار کر ماں کی بغلوں میں پھنسا کر اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ "ذرا ہمت سے کام لو۔ میں تمہیں کھینچ رہی ہوں۔ تم بھی نکلنے کی کوشش کرو۔۔۔ ہاں۔ ہاں ذرا اور۔۔

بس ذرا اور۔۔۔ ابھی یہاں سے نجات مل جائے گی۔"

وہ دونوں اپنی سی کوششیں کر رہی تھیں۔ اُن کی اس حرکت نے چارپائی کو ہلا دیا تھا۔ ماں کے چہرے سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے دونوں پاؤں چارپائی کے نیچے یوں دبے ہوئے تھے کہ وہ انہیں نکال نہیں پا رہی تھی اور اوپر پڑا ہوا ملبہ دھمکیاں دے رہا تھا اب تب میں کرنا چاہتا تھا۔

خود سندس کے آس پاس ملبہ اس طرح چھایا ہوا تھا کہ کسی بھی لمحے میں زیر و زبر ہو سکتا تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں کھینچ رہی ہوں۔ تم پاؤں نکالنے کی کوشش کرو۔"

ماں کے وجود کو کھینچنا آسان نہیں تھا۔ دونوں ہاتھ پہلے ہی ملبے کو ہٹاتے ہٹاتے مارے تھکن کے بے جان سے ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ بڑی ہمت سے کام لے رہی تھی۔ ماں گھٹنوں تک چارپائی کے نیچے سے نکل آئی تھی۔ سُندس اسے اپنی طرف کھینچتی تھی تو پورے وجود کو ایسی تکلیف دہ گڑ لگتی تھی کہ ماں کی آہیں اور کراہیں دل کو تڑپانے لگتی تھیں۔

وہ سخت اذیت سے گزر رہی تھی۔ سندس اس کی تکلیف کو سمجھ رہی تھی۔ زار و قطار رو رہی تھی۔ آخر کیا کرتی؟ اسے باہر نکالنے کی اور کوئی تدبیر بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ماں نے بے بسی سے انکار میں سر ہلایا۔ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ چارپائی نے ٹوٹی ہوئی دیوار کو روک رکھا ہے۔ وہ ماں کھینچتی ہے تو چارپائی ہلتی ہے اور دیوار بھی اپنی جگہ سے سرکنے لگتی ہے۔

سُندس نے پریشان ہو کر اس جھکی ہوئی شکستہ دیوار کو دیکھا۔ وہ جیسے کسی آسیب کی طرح بازو پھیلائے ماں کے وجود پر گرنے کی تیار تھی۔ اب چارپائی کے نیچے صرف اس کے پاؤں پھنسے ہوئے تھے۔ سُندس اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے تسلیاں دیتے ہوئے بولی۔ "بس تھوڑی سی اور ہمت کر لو۔ یہاں سے نکلنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔"

وہ اس کھینچا تانی میں بری طرح زخمی ہو گی تھی۔ لباس لہو سے تر بتر تھا۔ بڑی دیر بعد ماں کی نقاہت بھری آواز سنائی دی۔ "لگتا ہے پاؤں ٹوٹ گئے ہیں۔ میں یہاں سے نہیں نکل پاؤں گی۔۔۔"

ماں کی بات سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ "نہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم خواہ مخواہ مایوس ہو رہی ہو۔ ذرا دیر دم لے لو۔ تکلیف کچھ کم ہو گی تو پاؤں باہر نکالے جائیں گے۔"

وہ تھوڑی دیر تک ماں کو تسلیاں دیتی رہی۔ پھر دونوں بازوں کو اس کی بغلوں سے گزار کر اسے مضبوطی سے جکڑتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں کھینچ رہی ہوں۔ تم فوراً اپنے پیروں کو نکالنے کی کوشش کرو۔"

وہ سسکاری لیتے ہوئے بولی۔ "کیسے نکالوں۔۔۔؟ بہت درد

ہو رہا ہے۔"

وہ ماں کا حوصلہ بڑھاتی جا رہی تھی اور دھیرے دھیرے اسے اپنی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔ وہ تڑپ رہی تھی تکلیف کی شدت سے چیخ رہی تھی۔ دونوں پیروں کو چارپائی کے لوہے نے جیسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ سنگدل بن جاتی، ماں کی تکلیف کا خیال نہ کرتی۔ تب ہی نجات مل سکتی تھی۔

اس نے یہی کیا۔ ماں کو دونوں بازوں میں مضبوطی سے جکڑ کر پوری قوت سے کھینچتی ہوئی پیچھے جانے لگی۔ یوں پوری طرح باہر آتے ہی شکستہ دیوار کے چٹانی ٹکڑے زوردار آواز کے ساتھ چارپائی پر آگرے۔ آواز ایسی ہولناک تھی کہ وہ دہل کر رہ گئیں۔ پل بھر کو یوں لگا جیسے وہ قیامت خیز زلزلہ پھر ان پر قیامت ڈھانے آگیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی حواس بحال ہوئے تو اس نے ماں سے کہا۔ "یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ فوراً باہر نکلو۔" اُس نے جو راستہ بنایا تھا۔ وہاں سے کھڑے ہو کر تو کیا بیٹھ کر بھی گزرا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ دونوں اوندھی لیٹ گئیں۔ کہنیوں کے بل چھوٹے بڑے پتھروں پر گھسٹتی ہوئی وہاں سے گزرنے لگیں۔ جگہ جگہ سے لباس پھٹ رہا تھا۔ جسم جیسے چھلنی ہو رہا تھا۔ ان تکالیف کو جھیل کر ہی جان بچائی جا سکتی تھی اور وہ بچا رہی تھیں۔ ان لمحات میں اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک ہی بار ملنے والی زندگی کتنی پیاری ہوتی ہے؟ جب ہاتھوں سے اس کا خوبصورت ساتھ چھوٹنے لگتا ہے تب اس کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

وہ احساس ہی تھا جو اُن کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ ورنہ اُس تباہی سے پہلے ایسے کٹھن حالات سے گزرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ دوؤں ہی بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ ملبے سے نکلتے ہی ماں نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ سُندس اپنے حواسوں میں تھی۔ لیکن گردونواح میں دور دور تک پھیلی ہوئی تباہی اس کے ہوش اڑا رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے دیدے پھیلائے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھے دائیں بائیں گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ اتنی بڑی تباہی کو ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔

محلے کے تمام چھوٹے بڑے مکانات مکمل طور پر منہدم ہو چکے تھے۔ ہر طرف ملبے کا ڈھیر تھا، آہیں تھیں، کراہیں تھیں کہیں کوئی بیوہ اپنے شوہر کی لاش پر ماتم کر رہی تھی تو کہیں مائیں، بہنیں اپنے عزیزوں کے بچھڑ جانے پر نوحہ کناں تھیں۔ گیت، سر سنگیت اور پرندوں کی چہکار کے بجائے ہر سمت سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔

اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ "یا میرے اللہ۔۔۔! یہ سب کیا ہو گیا؟ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں؟"

پھر وہ فوراً ہی جھک کر ماں کا شانہ ہلاتے ہوئے بولی۔ "ماں جی۔۔۔! یہ قیامت صرف ہم پر نہیں ٹوٹی ہے۔ یہاں تو سارا محلہ تباہ ہو گیا ہے۔"

اس نے ایک ذرا آنکھیں کھول کر بیٹی کو دیکھا۔ پھر پہلے کی طرح غافل ہو گئی۔ نبض چل رہی تھی، دل کی دھڑکنیں زندگی کا پتا دے رہی تھیں۔ سُندس اسے فوراً ہسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن علاقے کی ناقابل یقین صورتحال دیکھ کی بُری طرح بوکھلا گئی تھی۔

گلی میں یہاں سے وہاں تک درجنوں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسے زخمی بھی نظر آرہے تھے، جنہیں ملبے سے نکال کر گلی میں لٹا دیا گیا تھا۔ ان کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کے لیے کوئی ڈاکٹر نظر نہیں آرہا تھا۔ ان کے لواحقین فور طور پر مرہم پٹی نہیں کر سکتے تھے۔ لہو پونچھ کر پٹیاں باندھ رہے تھے۔

اس نے پلٹ کر ماں کی زخمی وجود کو دیکھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اسے جلد از جلد کسی اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ وہ وہاں سے گزرنے والوں کو دیکھنے لگی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی کسی نامحرم سے بات نہیں کی تھی۔ ایسی محدود رہنے والی لڑکوں کو دنیا کا ہر اجنبی حملہ آور لگتا ہے۔

اس کا لباس اور پھٹا ہوا دوپٹا ایسا ہو گیا تھا کہ وہ چہرے کو اور پورو وجود کو ڈھانپ نہیں سکتی تھی۔ اب تو حوصلہ کرنا تھا۔ بے پردگی لازمی ہو گئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں اِدھر سے اُدھر منڈلانے لگی۔ وہاں سب ہی اپنوں کو ملبوں سے نکالنے اور انہیں کسی اسپتال تک پہنچانے کی فکر میں تھے۔

اس کے ذہن نے سمجھایا کہ اس طرح ہچکچائی رہے گی تو ماں کی تکلیف بڑھتی چلی جائے گی۔ اس نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے ایک راہ گیر کو مخاطب کیا۔ "سنیں۔۔۔! میری ماں جی بہت زخمی ہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا ہے۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

وہ بڑے ہی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کس ہسپتال کی بات کر رہی ہو؟ شہر کی تمام عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئی ہیں۔ شاید تمہیں خبر نہیں ہے ہمارا پورا مظفر آباد تباہ ہو گیا ہے۔"

اس کے ذہن کو شدید جھٹکا سا لگا۔ پہلے تو اس نے یہ سمجھا تھا کہ صرف اس کا گھر ہی گر پڑا ہے۔ پھر گھر سے نکلی تو معلوم ہوا پورا محلہ تہس نہس ہو گیا ہے اور اب وہ راہ گیر اسے شہر کے حالات بتا رہا تھا۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ شہر ہی نہیں پوری دنیا تباہ ہو چکی ہے۔ ہم تو گناہ گار ہیں۔ شاید ہمیں گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مگر بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ انہیں کیوں سزا مل رہی ہے؟ میں نے ایک اسکول کا ملبہ دیکھا ہے۔ وہاں شاید ہی کوئی بچہ زندہ بچا ہو۔"

سُندس نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ تو اب تک یہی سمجھ ہری تھی کہ شیر و دوسرے بچوں کے ساتھ اسکول

میں محفوظ ہو گا۔ لیکن دور تک زمین بوس عمارتوں کو دیکھ کر اور اُس اجنبی کی باتیں سن کر یکباری ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔

"شیرو۔۔۔۔!"

اس نے اجنبی سے کہا" وہ۔۔۔۔ دوسرے محلے میں بب۔۔۔۔ بچوں کا پرائیویٹ اسکول ہے۔ وہ۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟"

اس راہ گیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے صدمے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اسکول ہے نہیں۔۔۔ تھا وہاں کی حالت بھی نہ پوچھو۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بڑی بڑی دیواروں اور کنکریٹ کی بھاری چھتوں تلے دبے ہوئے ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ مگر دو گھنٹے گزر جانے کے باوجود وہاں سے کسی بچے کو نکالا نہیں جاسکا۔ میں تو وہاں سے منہ پھیر کر آگیا ہوں۔ اُن معصوموں کی آہیں اور سکیاں سنی نہیں جارہی تھیں۔"

وہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی بھائی کے اسکول کی طرف جانے لگی۔ وہاں نہ کوئی گلی رہی تھی نہ کوئی محلہ ہر سمت منہدم چار دیواریوں کا میدان حد نظر تک دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں اسکول والی گلی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وہ کہاں گم ہو گئی ہے۔ کافی دیر ادھر اُدھر بھاگتے رہنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ بھٹک رہی ہے۔

وہ دوڑتے دوڑتے رُک گئی۔ کہاں جائے؟ کہاں ہے اسکول؟ وہ آگے پیچھے دائیں بائیں گھوم گھوم کر دیکھنے لگی۔ پیچھے ماں کو چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ راستہ بھی گم ہو گیا تھا۔ دور تک ملبوں کے ڈھیر نے راستوں کی شناخت ختم کر دی تھی۔

وہ کیسے جائے بھائی کی طرف۔۔۔؟ وہ کیسے جائے ماں کی طرف۔۔۔؟ وہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلی پکڑ کر اسے اپنے زندوں یا مُردوں کی طرف لے جاتا۔

***

زلزلہ تو تھم گیا تھا لیکن دور پہاڑوں سے بڑے بڑے چٹانی پتھر لڑھکتے ہوئے نیچے آرہے تھے اور بستیوں کی بستیاں تباہ کرتے جارہے تھے۔ افراتفری میں بھاگنے والی پردہ دار خواتین کے سروں سے چادریں سرک گئی تھیں۔ وہ بیبیاں جو گھر کی چار دیواری میں بھی بے پردہ ہونے سے گھبراتی تھیں۔ اُس مصیبت کی گھڑی میں ان کے لیے حیا کا آنچل بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں گلی کوچوں میں بھٹکتی پھر رہی تھیں۔

راج محمد کا دل کہہ رہا تھا شاید وہ اسکول نہیں گئی ہو گی۔ وہ دوڑتے دوڑتے اُن مصیبت کی ماریوں میں اپنی سُندس کو تلاش کرتا جارہا تھا۔ راستے سے گزرتے ہوئے کتنے ہی گھروں کے ملبے کے نیچے سے کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ کہیں کوئی لرزتا ہوا ہاتھ زبان بے زبانی سے کسی خضر کو پکار رہا

تھا تو کہیں پکارنے والے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔ ہر دو قدم کے بعد کسی نہ کسی کا لاشہ دکھائی دے رہا تھا۔ جگہ جگہ تازہ انسانی خون بکھرا ہوا۔ وہی خون جو کچھ دیر پہلے نہ جانے کس کس کی رگوں کا سرمایہ تھا؟ اب گزرنے والوں کے قدموں تلے مٹی ہو رہا تھا۔

کوئی دیوانہ وار چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا۔ "وادی میں کوئی زندہ بھی بچا ہے یا نہیں۔۔۔؟"

ہر دل کی دھڑکن تیز تھی۔ ہر آنکھ تم تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو سانسیں رکنے لگیں۔ اس ملبے کے ڈھیر کو گھر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنے پیاروں کو نکالنے کے لیے کس راستے سے اندر جائے؟ وہ ماں بہنوں کو پکارتا ہوا اس ملبے کے آس پاس منڈلانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنے پیچھے سے بہنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ رانو اور زلیخا دوڑتی ہوں آکر اس سے لپٹ گئیں۔ وہ اسکول یونیفارم میں تھیں۔ دھول مٹی سے اٹی ہوئی تھیں۔ چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں سے لہو بہہ رہا تھا۔

چار برس کی رانو نے روتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ابھی اسکول نے نکالا ہے۔ ہماری سار سہیلیاں ابھی تک نیچے دبی ہوئی ہیں۔"

بارہ برس کی زلیخا نے کہا۔ "میری ایک سہیلی چھت کے نیچے دب کر مر گئی ہے۔ اور کئی زندہ ہیں مگر دبی ہوئی ہیں۔ بھائی جان! وہ کیسے باہر آئیں گی؟"

ہر زبان تقریباً ایک ہی جیسی داستان سنا رہی تھی۔ چھوٹی بہن رانو نے اپنے گھر کے ملبے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "امی کہاں ہیں؟ اور باجی بھی نہیں ہیں؟"

زلیخا نے جیسے روتے ہوئے کہا۔ "چاچا چاچی اور بچے بھی نہیں ہیں۔۔۔۔ بھائی جان! وہ سب کہاں۔۔۔؟

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ راج محمد نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ ملبے کے اندر کا سناٹا کہہ رہا تھا کوئی نہیں بچا ہے۔ وہ معصوم بچیوں کو کیا بتاتا؟ کس دل سے بتاتا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو چکا ہے اور آگے کیا ہونے والا ہے؟

پھر وہ تینوں اس ملبے کو ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔ اندازہ تھا کہ کہیں نہ کہیں سے ضرور کوئی راستہ نکل آئے گا۔ اس وقت راج محمد کو شدت سے احساس ہوا کہ عشق نے اسے اپاہج بنا دیا ہے۔ ایک ہاتھ کہنی کی طرف سے مڑ گیا تھا اور اس قدر کمزور تھا کہ اسے ہاتھ لگانے سے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ بازو تقریباً ناکارہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے پتھر توڑ کر اپنے پیاروں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ملبے میں بھاری پتھر، شکستہ ستون چھتیں اور گھر کا دوسرا سامان تھا۔ وہ بہنوں کا ساتھ دے رہا تھا لیکن جوان بھائی

ہونے کے ناتے بھرپور مدد نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے جتنا ملبہ اٹھایا جا سکتا تھا اٹھا رہا تھا۔

پڑوس کے ملبے سے تین افراد کی لاشیں نکال جا رہی تھیں۔ انہیں گلی میں رکھا جا رہا تھا۔ اس گھر کی مائیں، بہنیں اور بزرگ ٹوٹی پھوٹی لاشوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ وہ منظر ایسا تھا کہ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

رانو آنکھیں بند کر کے روتی ہوئی بھائی کے بازو سے لپٹ گئی۔ زلیخا بھی منہ پر آنچل رکھ کر آنسو بہانے لگی۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ موت کی خبر سنا رہا تھا۔ ابھی پڑوس کی ماتمی صدائیں مدھم نہیں ہوئی تھیں کہ پچھلے محلے سے آہ بکا کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ وہاں بھی کتنے ہی پیارے ہمیشہ کے لیے اپنوں سے بچھڑ گئے تھے۔

ان تینوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کو تسلیاں دے کر دوبارہ اس ملبے کو ہٹانے میں مصروف ہو گئے۔ سینوں میں دھماکے کرتے ہوئے دلوں سے ایک ہی سوال ابھر رہا تھا۔ "کیا وہ اپنے پیاروں کو زندہ سلامت نکال پائیں گے ؟"

شمالی علاقہ جات میں ہمیشہ سے مشترکہ خاندان کا دستور رہا ہے۔ ایک گھر میں درجنوں افراد رہتے ہیں۔ اس لیے ایک ایک گھر سے کئی کئی لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ کہیں کوئی زندہ نکلتا تھا تو اللہ اکبر کی صدائیں حوصلے بڑھا دیتی تھیں۔ اور کہیں کلمہ شہادت کی آواز پھر سے مایوسیوں میں غرق کر دیتی تھی۔

ملبے کے ڈھیر کو ہٹاتے ہٹاتے زلیخا ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ رانو اور راج محمد دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ ایک وزنی ستون کے نیچے خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔ اس ستون نے بڑی بہن کو اور پھپھو کو ایسے کچل ڈالا تھا کہ چہرے پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ مگر تن کا لباس پہچان بنا ہوا تھا۔ اپنے پیاروں کی موت کا یقین بڑی دیر سے ہوتا ہے۔ راج محمد انہیں چھو کر دیکھ رہا تھا۔ بہنیں کبھی بڑی باجی کو اور کبھی اپنی پھپھو کو پکار رہی تھیں۔ لیکن زندگی کے آثار نہیں مل رہے تھے اور نہ ہی مل سکتے تھے۔

لاشوں کی حالت ایسی تھی کہ انہیں دیکھ کر زلیخا سینہ پیٹنے لگی دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس ہولناک صورتحال میں حواس منتشر ہو رہے تھے۔ رونو بھی ڈگمگاتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے سر تھامتی ہوئی گرنے کے انداز میں بیٹھتی چلی گئی تھی۔ وہاں بکھرا ہوا لہو دیکھ کر سر چکرا رہا تھا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے پلٹ کر ماتم کرنے لگیں۔

پہاڑی علاقوں کے جوان مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں۔ چٹانی حوصلے رکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت چٹانوں کی طرح ان کے حوصلے بھی ٹوٹ رہے تھے۔ پہاڑ کبھی نہیں روتے۔ مگر راج محمد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اپنی بہن

اور چچی کی لاشوں پر ماتم کرنا چاہتا تھا۔ رورو کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بہنوں کو حوصلہ دینا ضروری تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے کہا "خود کو سنبھالو۔ حوصلہ کرو۔ ابھی تو نہ جانے کیا کیا دیکھنا ہے؟ کس کس کے لاشے کو کاندھا دینا ہے؟"

رانو نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ "امی کو ڈھونڈیں بھائی۔۔۔ !نہیں تو۔۔۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

وہ بہنوں کو حوصلہ دے رہا تھا۔ مگر اندر سے خود بھی جیسے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ایک طرف ماں کی فکر تھی تو دوسری طرف سُندس کا خیال دل دھڑکا رہا تھا۔

شہر کے سب ہی گلی کوچوں میں، چھوٹے بڑے قصبوں میں اور تمام دیہاتوں میں موت ایک آسیب کی طرح مسلط ہو گئی تھی۔ کسی گھر سے چار کسی گھر سے چھ اور کسی گھر سے بیک وقت دس میتیں اٹھائی جا رہی تھیں۔

راج محمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "پہلے امی کو ڈھونڈنا چاہیے۔ پھر چچا کے دونوں بیٹوں کی بھی اسکول کے ملبے میں تلاش کرنا ہے۔"

زلیخا نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ سب کیسے ہو گا؟ پتا نہیں وہاں چچا کے بیٹوں پر کیا بیت رہی ہو گی؟ یہاں امی کو نکالتے نکالتے وہاں دیر نہ ہو جائے اور اگر پہلے وہاں جاتے ہیں تو یہاں امی۔۔"

راج محمد نے بے بسی سے کہا۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ یہاں رہیں یا وہاں جائیں؟ چچا کی بھی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔"

وہ ملبے کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہمیں امی کو تلاش کر کے اسکول پہنچنا چاہیے۔"

رانو بے بھیگی ہوئی آنکھوں سے بہن کو دیکھا۔ پھر روتے ہوئے پوچھا۔ "امی زندہ ہوں گی نا۔۔؟"

کیسی بے بسی تھی۔ کیسی بے یقینی تھی؟ اپنی ماں کی زندگی اور موت کے بارے میں بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ تینوں اس اجڑے ہوئے آشیانے میں ماں کو تلاش کر رہے تھے۔ ملبے میں جہاں بھی کوئی چھوٹا بڑا راستہ مل رہا تھا، وہاں سے اندر جا رہے تھے۔ دیوانوں کیطرح اسے پکار رہے تھے۔ کسی بھی پتھر کو یا ٹوٹے پھوٹے سامان کو ہٹاتے وقت یہ خوف ذہن پر مسلط رہتا تھا کہ کہیں کوئی بھاری چیز لڑھک کر خود اُن پر نہ آ گرے۔

راج محمد کو رہ رہ کر سُندس کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ "ماں کو نکالنے کے بعد اُس کے گھر کی طرف جاؤں گا۔ وادی کے ہر فرد پر قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ بھی ایسے ہی حالات سے گزر رہی ہو گی۔ یا اللہ! میری ماں کے ساتھ ساتھ میری سندس کو ھ بھی سلامتی دے۔ اسے کچھ نہ ہو میرے مالک۔۔۔۔"!

وہ ایک پتھر کو ہٹا کر راستہ بنانا چاہتا تھا۔ مگر وہ ناکارہ بازو اس کے وزن کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے اس

وزنی پتھر کو دیکھا۔ پھر دوسرے ہاتھ اور ایک پیر کے ذریعے اس پر پتھر کو ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ زلیخا کن اکھیوں سے بھائی کی بے بسی دیکھ رہی تھی۔ فوراً ہی اس کے پاس آکر پتھر کو ایک طرف دھکیلنے لگی۔ دونوں کی کوششوں سے وہ پتھر ہٹ گیا۔ ملبے کے اندر جانے کا راستہ بن گیا۔ مگر وہ راستہ تھوڑی دور جا کر مسدود ہو گیا تھا۔ وہاں گھر کا آنگن تھا۔ تمام آرائشی سامان کاٹھ کباڑ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ راج محمد نے ماں کو پکارتے ہوئے کہا۔ "امی۔۔۔!امی جی۔۔۔!کیا تم یہاں ہو۔۔۔؟"

پھر وہ خاموش ہو کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔ بہنیں بھی دم سادھے کھڑی تھیں۔ دل ہی دل میں ماں کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت ملبے کے اندر کہیں ہلکی سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی چیز گری ہو۔ انہوں نے ایک دم سے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ زندگی کی آہٹ سنائی دی تھی۔ جیسے ماں نے پکارا تھا۔

راج محمد فوراً ہی اکڑوں بیٹھ کر اندر جانا چاہتا تھا۔ زلیخا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "آگے اور بھی سامان ہو گا۔ آپ ایک ہاتھ سے کیا کریں گے؟ ہٹ جائیں۔ مجھے اندر جانے دیں۔"

اس نے ایک ذرا شرمندگی سے بہنوں کو دیکھا۔ پھر وہاں سے ہٹ گیا۔ زلیخا فوراً ہی اکڑوں بیٹھ کر اندر جانے لگی۔ چھوٹی بہن اور راج محمد اس راستے کے دہانے پر بیٹھے اسے جاتے ہوئے دیک رہے تھے۔ وہ پنجوں کے بل آگے بڑھتی جا رہی تھی اور وقفے وقفے سے ماں کو پکارتی جا رہی تھی۔ جواباً کبھی کبھی دور نزدیک سے ہلکی سی کھٹ پٹ کی آواز سنائی دیتی تھی۔

مختلف سامان اور در و دیوار کا ملبہ رکاوٹ بن رہا تھا۔ آکسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ مگر ماں کو بچانے کا جذبہ ایسا تھا کہ وہ آگے اور آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ راج محمد اور رانو کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ بھائی نے بلند آواز میں پوچھا۔ "زلیخا۔۔۔!تم کہاں ہو؟ امی کا کچھ پتا چلا۔۔۔؟"

اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ "میں ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ یہیں کہیں ہیں۔

وہ دونوں بے چینی سے کسی خوشخبری کا انتظار کر رہے تھے۔ ملبے کے نیچے سے کبھی سامان کو ادھر سے ادھر ہٹانے کی آوازیں آ رہی تھیں، کبھی کبھی زلیخا کی مدھم پکار سنائی دے رہی تھی۔ وہ ماں کو ڈھونڈتی ہوئی پکارتی ہوئی اپنے وسیع و عریض مکان کے ملبے میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی؟

جہاں وہ پہنچی، وہاں مایوسی ہوئی۔ وہاں ماں نہیں تھی۔ ایک بلی نے اسے دیکھتے ہی میاؤں کہا۔ جیسے اس قبرستان میں خوش آمدید کہہ رہی ہو۔ آس پاس کے راستے بند تھے۔ وہ اب تک

پھنسی ہوئی تھی۔ زلیخا کی طرف سے آنے والا راستہ دکھائی دیا تو وہ چھلانگ لگاتے ہی کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔ وہ چیز اپنی جگہ سے ہلی تو آس پاس کی چیزیں اور پتھر لرزنے لگے۔ وہ عجیب منظر تھا۔ بلی دوڑتی جا رہی تھی۔ اور ملبہ گرتا جا رہا تھا۔ زلیخا کی ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔ ادھر کا ملبہ بیٹھ کر خاموش ہو گیا۔ بلی باہر نکل آئی۔ راج محمد لرز کر رہ گیا۔ چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگا۔ "زلیخا۔۔۔! باہر آؤ۔۔۔ فوراً باہر نکلو۔۔۔"

وہ سر جھکا کر دیکھنے لگا۔ جہاں سے زلیخا گزر کر گئی تھی، وہاں کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ اوپر سے بیٹھنے والا ملبہ کہہ رہا تھا ایک تازہ قبر بن چکی ہے۔ رانو نے روتے ہوئے۔ بھائی! باجی چپ کیوں ہے؟ بولتی کیوں نہیں۔۔۔؟"

راج محمد پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ قدرت کا کیا عجب تماشا تھا اُس بلی کو وہاں دب کر مرنا تھا۔ مگر وہ زندہ نکل آئی تھی اور مُردوں کو تلاش کرنے والی بہن وہاں پہنچ کر زندگی ہار گئی تھی۔ اسکول کے ملبے سے زندہ سلامت نکلنے والی کیا جانتی تھی کہ موت اس کے اپنے گھر کے ملبے تلے اس کی منتظر ہے۔

ایسے ہی وقت محلے کا ایک لڑکا دوڑتا ہوا ان کے پاس آیا پھر ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "راج بھائی! وہ۔۔۔ تمہاری امی۔۔۔ وہاں۔ حاجی صاحب کے ملبے میں دبی ہوئی ہیں۔ جلدی چلو۔۔۔ انہیں نکالو۔۔۔"

راج محمد نے شدید حیرانی سے یہ سُنا۔ ماں کو اِدھر ڈھونڈا جا رہا تھا وہ اُدھر پڑی ہوئی تھی اور اسے ڈھونڈنے والی بیٹی اِدھر ملبے میں۔۔۔۔

اس نے ملبے کی طرف دیکھا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

***

سُندس دل ہی دل میں بھائی کے لیے دُعائیں مانگتی ہوئی اسکول کے آثار ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا اس کا بھائی شیر و زندہ ہے مگر کہاں ہے یہ سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ جگہ جگہ ملبے سے نکلی ہوئی لاشوں کو اور درجنوں تڑپتے بلکتے زخمی افراد کو دیکھ دیکھ کر اندیشوں میں مبتلا ہو رہی تھی۔ گھر کی چار دیواریوں میں سکھ چین سے رہنے والیاں تقدیر کی ایک ہی ٹھوکر سے کھلے میدانوں میں آ گئی تھیں۔ ننگے آسمان تلے ننگے سر ننگے پاؤں اپنے پیاروں کے لاشوں پر بین کر رہی تھیں۔

اِدھر اُدھر بھٹکنے میں آدھا گھنٹا گزر گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹتے ہوئے بولی۔ "ہائے شیرو۔۔۔! میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟ تیرا اسکول کہاں گم ہو گیا؟"

دو چار خواتین اپنے گھر کے ملبے کو ہٹانے میں مصروف تھیں۔ ان میں سے ایک نے سُندس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم خواہ مخواہ یہاں بھٹک رہی ہو۔ ہماری اس گلی میں کوئی اسکول

نہیں تھا۔"

وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی۔ "میں کیا کروں؟ اپنے بھائی کو کہاں ڈھونڈوں؟ کوئی مجھے اس کے اسکول تک نہیں پہنچا رہا ہے۔"

ایک بزرگ خاتون نے پوچھا۔ "بیٹی! تجھے اسکول والی گلی کی کوئی نشانی یو یاد ہو گی؟"

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "نشانی۔۔۔؟ ہاں۔۔۔ ہاں ایک نشانی ہے۔ اس گلی میں بادام کے درخت ہیں۔"

"بس تو پھر بادام کے درخت ڈھونڈو۔ پیڑ پودوں کے سوا انسان کے ہاتھوں سے بنی ہوئی ہر چیز نابود ہو گئی ہے۔ وہ درخت تمہیں اسکول تک ضرور پہنچائیں گے۔"

وہ "انشاللہ۔۔۔۔" کہتی ہوئی وہاں سے پلٹ گئی۔ ان مطلوبہ درختوں ڈھونڈنے لگی۔ ننگے پاؤں تھی۔ تلوؤں سے لہو رس رہا تھا۔ سر پر اور بدن پر لگے ہوئے زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر بھائی کو ڈھونڈنے کی تڑپ ایسی تھی کہ وہ تمام تکلیفیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔

اسے زیادہ دیر بھٹکنا نہیں پڑا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی بادام کے اُن درختوں تک پہنچ گئی۔ وہاں بھی کوئی گھر سلامت نہیں رہا تھا۔ اسکول کی عمارت مکمل طور پر منہدم ہو گئی تھی۔ ملبے کے ڈھیر سے پرائمری سکول کا سائن بورڈ جھانک رہا تھا۔

لوگوں کی آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔

وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اس طرف جانے لگی۔ اُس عمارت کی تمام دیواریں اندر کی طرف گری تھیں پھر کنکریٹ کی بھاری چھت نے ان دیواروں پر اپنا فرش بچھا دیا تھا۔ اس دبیز ملبے کو بیلچوں، کدالوں اور ہاتھوں کے ذریعے ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ صورتحال ایسی تھی کہ نہ کوئی اندر سے باہر آ سکتا تھا اور نہ باہر والے اندر جا سکتے تھے۔ سیکڑوں والدین بے بسی سے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔ بلک بلک کر امداد کی التجائیں کر رہے تھے۔

وہ بھی دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ملبے میں اِدھر اُدھر سے جھانکتے ہوئے اپنے شیرو کا پکارنے لگی۔ اندر پھنسے ہوئے بچوں کی آہیں، کراہیں اور سسکیاں ہر فرد کو تڑپا رہی تھیں۔ ماؤں کے کلیجے پھٹ رہے تھے۔ کچھ اپنے جگر گوشوں کو پکارتے پکارتے، سینہ کوبی کرتے کرتے غم کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔

وہاں موجود تمام افراد اپنے اپنے طور پر تدبیریں کر رہے تھے۔ کسی بھی طرح اس ملبے کے اندر پہنچ کر زندہ بچوں کو نکالنے کی فکر میں تھے۔ مگر بے بسی ان کی تمام تدبیروں پر پانی پھر رہی تھی۔ وہ بھی اپنے شیرو کو وہاں سے نکالنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ سینہ پیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ہائے اللہ! میں کیا کروں؟ اپنے بھائی کو کیسے بچاؤں؟ پتا نہیں وہ کیسی اذیت سے گزر رہا ہو گا؟"

لوگ آپس میں صلح مشورے کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "بچوں کو جلد از جلد باہر نہ نکالا گیا تو یہ آکسیجن کی کمی سے اور ملبے کے وزن سے دب کر مر جائیں گے۔"

سُندس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ دوسرے شخص نے کہا۔ "مگر اس ملبے کو ہٹانا آسان نہیں ہے۔"

"تو پھر ان معصوموں کا کیا ہو گا؟"

اس سوال پر سب ہی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک نے کہا۔ "ان وزنی دیواروں اور چھتوں کو کرین کے ذریعہ ہٹایا جا سکے گا۔"

کسی تعجب سے پوچھا۔ "کرین۔۔۔؟"

"کرین کہاں سے آئے گی؟"

"حکومت کیطرف سے اور کہاں سے۔۔۔؟ کوئی نہ کوئی امدادی ٹیم اس ملبے کو ہٹانے کے لیے یہاں پہنچنے والی ہو گی۔"

اس شخص کی اس بات نے نہ جانے کتنے دلوں میں امید کی شمعیں روشن کر دیں۔ ہر زبان پر یہ دعائیں مچلنے لگیں کہ وہ امدادی ٹیم جلد از جلد ان کی دادرسی کے لیے وہاں پہنچ جائے۔

سُندس تھک ہار کر ملبے کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ بڑے دکھ سے بڑے کرب سے معصم کراہوں کو سن رہی تھی۔ بے بسی سے اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا زندگی سے بھرپور معصوم سا چہرہ رورہ کر نگاہوں کے سامنے

(نظم: پہلا حصہ)

خدا کا واسطہ یارا
میرے دل سے نکل جاو
مجھے تم یاد مت آو
میں تم کو بھولنا چاہوں
پھر بھی بھول نہ پاوں
یہ کیسی کشمش میں ہوں میں
مجھے تم یاد آتے ہو
میری بے ربط زندگی میں
تم کتنا ستاتے ہو
چلو ایک بات بتاتی ہوں
تمہیں قصہ سناتی ہوں
میرے اشعار تیرے بن
نہیں بنتے کوئی نغمہ
نہ ہی چاند کو دیکھ کر
کوئی انکھی باتیں
ذہن میں رقص کرتی ہیں
میری کتابیں، میری ڈائری
گرد سے اٹ چکی ہیں اب
مگر دیکھو نا یارا تم
اپنی ڈائری پہ تحریر کرنے کو

(جاری ہے: باقی پڑھیں اگلے صفحے پر)

ابھر ارہا تھا۔ اس کی باتیں، اس کی شوخیاں یاد آ رہی تھیں۔ وہ ملبے کے پتھروں کو ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے بول رہی تھی۔ "حوصلہ کرو شیرو! امدادی ٹیم بس آتی ہی ہو گی۔ تم تو میرے بہادر بھائی ہو ناں۔۔۔؟ ہمت سے کام لیتے رہو۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ایک گھنٹا گزر گیا۔ لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ حکومت کی طرف سے کوئی امدادی ٹیم تو کیا؟ ایک بندہ بھی صورتحال کا جائزہ لینے اب تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ ایک شخص نے مایوسی سے کہا۔ "لگتا ہے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

دوسرے شخص نے کہا۔ "مظفر آباد آزاد کشمیر کا دارالحکومت ہے۔ اس کی تباہی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"شہر کی تمام چھوٹی بڑی سڑکیں ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں۔ پہاڑوں سے اب بھی بڑے بڑے پتھر لڑھک رہے ہیں۔ شاید اسی لیے حکومتی کام میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے؟"

ایک عورت نے روتے ہوئے پوچھا۔ "ہم کب تک یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کا انتظار کرتے رہیں گے؟"

سُندس نے پریشان ہو کر کہا۔ "ان بچوں کی آوازیں مدھم پڑتی جا رہی ہیں۔ خدا کے لیے۔۔۔ کچھ کریں۔ انہیں زندہ در گور ہونے سے بچا لیں۔"

تمام مرد حضرات نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایسے ہی وقت علاقے کے اوپر سے گزرنے والے ہیلی کاپٹر

(نظم: دوسرا حصہ)

مجھے اب لفظ نہیں ملتے
کتابیں کھولنے کا اب من میرا نہیں کرتا
کتابیں جب بھی کھولوں میں
تیرا ہی عکس دکھتا ہے
مجھے وہ شوخ رنگ اور زندگی سے بھرپور قہقہے
اب بے جان لگتے ہیں
برسوں سے میں سکھیوں سے
بہت ہی دور رہتی ہوں
چھوٹی چھوٹی باتوں پہ
سب سے الجھ پڑتی ہوں
میرے دن رات کہتے ہیں
میں انہیں برباد کرتی ہوں
یقین مانو میرے ہمدم
تمہیں میں یاد کرتی ہوں
تیری یادوں کی شدت میں
میں سب کچھ بھول جاتی ہوں
بس اتنا یاد رہتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو
بے حد یاد آتے ہو

شاعرہ۔۔۔۔ مہوش ملک

کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ سب منہ اٹھا اٹھا کر آسمان کو تکنے لگے۔ ایک نے چیخ کر کہا۔ "وہ دیکھو۔۔۔ وہ ہیلی کاپٹر اسی طرف آرہا ہے۔"

"ہاں۔ اس میں ضرور حکومت کی امدادی ٹیم ہو گی۔ سڑکیں بندہ ہو گئی ہیں۔ اس لیے وہ لوگ ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہماری مدد کو آرہے ہیں۔"

تمام افراد فوراً ہی اسکول کے پلے گراونڈ میں جمع ہو گئے۔ ہاتھ ہلا ہلا کر آسمان پر اڑنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ چلا چلا کر انہیں پکارنے لگے۔ سُندس بھی ہاتھ لہرا رہی تھی۔ مدد مدد پکار رہی تھی۔

آسمان کی طرف منہ کر کے ہمیشہ اپنے خدا سے عدا مانگی جاتی ہے۔ مگر ان لمحات میں وہ تمام مصیبت زدہ ان انجانے نا خداؤں کا پکار رہے تھے۔ اُس ہیلی کاپٹر کے ذریعہ شمالی علاقہ جات کی صورت حال کا جائزہ لیا جارہا تھا۔ ایک عورت نے پریشان ہو کر روتے ہوئے کہا۔ "یہ اوپر ہی اوپر منڈلا رہا ہے۔ نیچے کیوں نہیں اترتا؟"

اس کے شوہر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اترے گا۔ کیوں نہیں اترے گا۔۔۔ ذرا صبر تو کرو۔"

وہ بلکتے ہوئے بولی۔ "میرے بچے زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ صبر کیسے کروں؟ "

ہیلی کاپٹر پورے علاقے کا چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ ذرا دور جاتا تھا تو بچوں کے والدین اچھل اچھل کر چیخ چیخ کر اسے واپس بلانے لگتے تھے۔ سُندس کے بازو دکھ رہے تھے۔ ماؤں نے اپنے دلوں کو تھام کر روتے ہوئے کہا۔ "ہائے اللہ۔۔۔! وہ۔۔۔ وہ لوگ تو واپس جارہے ہیں؟"

اسکول کے احاطے میں چیخ وپکار مچ گئی تھی۔ وہ ہیلی کاپٹر ان متاثرین سے اور ان کی پکار سے بہت دور جاچکا تھا۔ ایک عورت اپنے شوہر کا شانہ جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے کچھ کرو۔ انہیں واپس بلاؤ۔ نہیں تو میرا بچہ۔۔۔"

وہ بلک بلک کر روتی ہوئی زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس ہیلی کاپٹر نے ایک ذرا سی امید پیدا کی تھی۔ لیکن اس کے جاتے ہی گہری مایوسی چھانے لگی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اُوپر سے آنے والے نیچے کیوں نہیں اُترے؟ ایک عورت نے سینہ پیٹتے ہوئے کہا۔ "ہائے۔۔۔ اب میری بچی کو کون بچائے گا؟ یا اللہ! ہم سے ایسا کیا گناہ ہو ہے۔ جو یہ عذاب نازل ہو رہا ہے؟"

ایک بزرگ نے مشورہ دیا۔ "توبہ استغفار پڑھتے رہو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا کرے گا۔"

وہ ملبے کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ بڑے دکھ سے سوچ رہی تھی۔ "کاش۔۔۔ آج شیرو اسکول کی چھٹی کر لیتا تو اس وقت ہمارے ساتھ ہوتا۔ پتا نہیں اس ملبے کو ہٹانے کے لیے کون لوگ آئیں گے؟ کب آئیں گے؟ اور اگر کوئی نہ آیا

تو۔۔۔؟"

وہ ایک دم سے تڑپ کر سوچنے لگی۔" ملبے کے نیچے بہت گھٹن ہوتی ہے۔ یہ بچے کب تک ایسے تڑپتے رہیں گے؟ ہم کب تک امدادی کاروائی کا انتظار کرتے رہیں گے؟ وقت یونہی گزرتا رہا تو ان معصوموں کا کیا بنے گا۔۔۔؟"

وہ بے بسی سے اپنا سر پیٹنے لگی۔ خدا سے کسی غیبی امداد کی دعائیں مانگنے لگی۔ اس ملبے کے نیچے سینکڑوں بچے ہلاک ہو چکے تھے۔ مگر وہاں موجود سب ہی والدین اپنے دلوں کو تسلیاں دے رہے تھے۔ اپنے جگر گوشوں کو زندہ بچ جانے والے بچوں میں شمار کر رہے تھے۔

اس کا دل بھی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ شیروز زندہ ہے۔ وہاں ابھرنے والی دبی دبی سی کراہوں میں کوئی ایک آہ اس کی بھی ہے۔ تمام والدین کی نظریں آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑی بے چینی سے کسی مسیحا کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ بروقت ملنے والی امداد سے ہزاروں قیمتی جانیں بچائی جا سکتی تھیں۔ مگر ایسا تو ہمیشہ سے انسانی زندگی میں ہوتا آیا ہے ضرورت کے وقت کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔۔۔ ٭٭٭

اس کی ماں حاجی صاحب کے ملبے میں اس بری طرح پھنسی ہوئی تھی کہ صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ باقی پورا جسم بھاری پتھروں اور ستونوں کے نیچے کچھ اس طرح تھا کہ وہ کچلی نہیں گئی تھی۔ مگر حالات اسے کسی وقت بھی کچل سکتے تھے۔ وہ وہاں بُری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ اسے کھینچ کر نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی کراہیں بیٹے کے دل کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ "کچھ کرو مجھے کسی طرح یہاں سے نکالو۔ میں نے تمہیں کوکھ کے اندھیرے سے نکال کر زندگی دی تھی۔ میرا یہ قرض چکا دو۔ مجھے ایک بار زندگی دیدو۔"

رانو ماں سے لگی بیٹھی تھی۔ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ کبھی اس سے لپٹ جاتی تھی تو کبھی بھائی کا دامن تھام کر کہتی تھی۔

"بھائی جان۔۔۔۔ امی کو باہر نکالیں۔"

ایک طرف چھوٹی بہن کی التجائیں تھیں، دوسری طرف ماں کی آہیں اور کراہیں اسے تڑپا رہی تھیں۔ مگر وہ بے بس تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، بھاری پتھروں، دیواروں اور چھتوں کو بھاری بھرکم کرینوں کے بغیر کیسے ہٹائے؟ کیسے اپنی ماں کو اذیتوں سے نجات دلائے؟ کوئی معجزہ کوئی جادوئی کرشمہ ہی نجات دلا سکتا تھا۔ ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔" میں زندہ نہیں بچوں گ ء۔ میری بوڑھی ہڈیاں ان پتھروں کا وزن برداشت نہیں کر رہی ہیں۔ ہائے اللہ جی! مجھے اس اذیت سے نجات دلا دے۔ اپنے پاس بلا لے۔"

راج محمد بے بسی سے سر کے بالوں کو نوچنے لگا۔ ماں اس کی بے بسی کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے بیٹے کے بازو کو دیکھتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا۔" کل رات تم نے اپنی جان پر یہ ظلم کیا۔ خدا جانے کس کے عشق نے تمہیں نکما کیا ہے؟ کیا دونوں

ہاتھوں سے ماں کو آخری وقت آغوش میں لے سکتے ہو؟"
اس نے بڑی ندامت سے اسے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"میں نے تمہیں تندرست وتوانا پیدا کیا تھا۔ افسوس کہ اپاہج اور معذور دیکھ کر جانے والی ہوں۔ میں نے بڑی محنت سے تماری پرورش کی تھی۔ زمانے کے سرد وگرم سے بچاتی رہی تھی۔ کیا اس لیے کہ تم جان بوجھ کر خود کو معذور بنالو؟ آج مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم مجھے دونوں بازوں کی قوت سے نکال سکتے ہو؟"
وہ ندامت سے بولا۔ "مجھے معاف کر دو امی! آج مجھے اپنی نادانی پر بہت غصہ آرہا ہے۔ یہ معذوری یہ بے بسی مجھے اندر ہی اندر شرمندگی سے مار رہی ہے۔ میں کیا کروں امی۔۔۔! میں تمہارے لیے کیا کروں؟"
وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ گھر کے افراد ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتے جا رہے تھے۔ ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔ بیٹے۔۔۔! مجھے۔۔۔ مجھے دو گھونٹ پانی پلادو۔۔۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔"
وہ فوراً ہی ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ "پانی ۔۔۔ ابھی پلاتا ہوں۔"
پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا حاجی صاحب کے گھر والوں کے پاس آیا۔ وہ سب اپنوں کو بچانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے وقت پتا چلا کہ نلکے ناکارہ ہو گئے ہیں۔ گھروں میں پانی کا ذخیرہ رہتا ہے۔ جب گھر ہی نہ رہے تو ذخیرہ کہاں رہے گا؟ وہاں سامان کے ڈھیر سے رسوئی کے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی بالٹی اُٹھا کر رانو سے بولا۔ "امی کا خیال رکھو۔ میں ابھی چشمہ سے پانی لے کر آتا ہوں۔"
وہ تیزی سے دوڑتا ہوا ایک پہاڑی کی طرف جانے لگا۔ اُدھر سُندس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہیلی کاپٹر جیسے واپسی کا راستہ بھول گیا تھا۔ وہاں سب ہی مایوس ہو گئے تھے۔ اپنی مدد آپ کے طور پر اسکول کے ملبے کو ہٹا کر بچوں کو نکالنے کی کوششوں میں جت گئے تھے۔ وہ بھی ایک بیلچے کے ذریعہ کہیں نہ کہیں۔ سے راستہ بنانا چاہتی تھی۔ مگر سخت پتھروں کو توڑنا آسان نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑنے لگے ۔تکلیف کے مارے بیلچے کے دستے کو پکڑنا دوبھر ہو گیا۔
وہ ایسی ناکامی پر جھنجلا رہی تھی۔ بیلچے کو ایک طرف پھینک کر روتے ہوئے بولی۔ "یا اللہ! یہ کیسا امتحان ہے؟ ہم تیرے ناتواں بندے ہیں۔ ہمیں اس آزمائش سے بچالے۔۔۔ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے ان معصوموں پر رحم فرما۔۔۔"
ایک طرف بھائی پر قیامت ٹوٹی ہوئی تھی اس کی کوئی خیر خبر نہیں مل رہی تھی۔ دوسری طرف ماں کی بھی فکر تھی۔ نہ جانے، اُس پر کیا بیت رہی تھی؟ وہ اسے تشویشناک حالت میں چھوڑ کر آئی تھی۔ اس نے اسکول کے ملبے کو دیکھ کر سوچا۔ "یہ

اتنی جلدی ہٹنے والا نہیں ہے۔ مجھے فوراََ جا کر ماں جی کو دیکھنا چاہیے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گی؟"

وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے شیر واس ملبے کے نیچے سے پکار رہا ہے۔ وہ کشمکش میں کبھی آگے کبھی پیچھے دیکھنے لگی۔ دوں و سمتوں سے لہو چیخ رہا تھا۔ ماں کی خبر گیری بھی ضروری تھی۔ وہ پتھروں اور دیواروں پر ہاتھ پھیر تے ہوئے زیر لب بولی۔ "برداشت کرو۔ صبر کرو۔ میں ماں جی کو دیکھ کر ابھی واپس آجاؤں گی۔"

پھر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔ مگر آدھا راستہ طے کرتے ہی ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نگاہوں کے عین سامنے اس کا دیوانہ وہ جنونی عاشق کھڑا ہوا تھا۔ جس طرح وہ اجڑی ہوئی تھی، اسی طرح وہ بھی بکھرا بکھرا سا دکھائی دے رہا تھا۔ راج محمد نے کبھی اسے بے پردہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک ذرا اجنبیت سے ایک نظر اس پر ڈالی۔ سُندس کے دل نے دھڑکتے ہوئے کہا۔ "یہ تجھے پہچان نہیں رہا ہے۔ فوراََ کترا کے نکلتی چلی جا۔۔۔"

وہ واقعی یک اجنبی کی طرح اسے نظر انداز کرنے والا تھا۔ لیکن وہ جیسے ہی اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے سے چہرے کو چھپا کر اس سے کتراتی ہوئی آگے بڑھنے لگی تو یک دم سے نقاب میں چھپی ہوئی آنکھوں نے اسے پکارا۔ وہ اجنبی لڑکی اسکول والی محبوبہ دکھائی دینے لگی۔ اس نے تڑپ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "سندس۔۔۔! یہ تم ہو۔۔۔؟"

سُندس کے زخمی پاؤں آگے بڑھتے بڑھتے ایک جھٹکے سے رُک گئے۔ وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مم۔۔۔۔ میں سُندس نہیں ہوں۔"

"میں بھی یہی سمجھ رہا تھا۔ مگر عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔"

اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ "خدا کے لیے۔۔ اس مصیبت کی گھڑی میں مجھے پریشان نہ کرو۔"

"ہم ایک جیسی مصیبتوں سے گزر رہے ہیں۔ مجھے تو بس یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم زندہ سلامت ہو۔"

اس کی بات سنتے ہی زخموں سے چُور ماں اور ملبے میں گم ہونے والا بھائی یاد آنے لگا۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں یہ کیسی سلامتی ہے؟ زلزلے سے مرنے والے تو مر گئے۔ مگر جو باقی ہیں وہ بھی زندہ لاش بنے ہوئے ہیں۔ صبح سے اب تک اتنی میتیں دیکھی ہیں کہ اپنی زندگی کا یقین نہیں رہا ہے۔"

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "میری دو بہنیں اور ایک چچی اس زلزلے کی نذر ہو گئیں۔ ماں ملبے کے نیچے سسک رہی ہے۔ تمہارے گھر والوں کا کیا حال ہے؟"

اس بربادی کے عالم میں جبکہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔

وہ اس کا حال پوچھ رہا تھا۔ ایک غمگسار ملا تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان اپنا حال سنانے لگی۔ وہ سن رہا تھا اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ اس کی یہ اپنائیت سُندس کے دل کو چھو رہی تھی۔

ایسے ہی وقت اس نے راج محمد کے ہاتھ کی طرف توجہ دی۔ اسے یاد آیا کہ اُس ہاتھ پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ کیا اب بھی لکھا ہوا ہے؟ وہ سوالیہ نظروں سے ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اطمینان رکھو۔ میں تمہارا نام تیزاب سے مٹا دیا ہے۔"

سُندس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی۔ "تیزاب سے۔۔۔؟ اس پر کیا گزری ہو گی؟ یہ دیوانہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔۔۔؟"

وہ اس ہاتھ کو دیکھ کر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔ "تمہارا نام کس طرح مٹا ہے یہ دکھائی نہیں دے گا۔ یہ دیکھو۔۔۔ ہاتھ اس طرح مڑ کر بازو سے چپک گیا ہے۔ اب یہ کبھی سیدھا نہیں ہو گا۔"

وہ ندامت سے سر جھکا کر بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے امی طعنے دے رہی تھیں کہ میں نے تمہارے عشق میں خود کو اپاہج بنا لیا ہے۔ میں بڑے بڑے پتھر اٹھا لیا کرتا تھا۔ آج امی کو ملبے سے نکالنے کے لیے ایک پتھر ہٹانے کے قابل نہیں رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "کلام پاک میں بالکل درست کہا گیا ہے۔ بے شک ۔۔۔ ہم خود اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے ہیں۔ تم نے وحشت اور جنون میں آکر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ جاؤ۔۔۔ دیر نہ کرو۔ کسی بھی طرح اپنی امی کو ملبے سے نکالو۔"

وہ اپنے جوتے اور موزے اتار کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پیر بری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ یہ اور زخمی ہوں گے تو چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہو گی۔"

وہ ہچکچا کر پیچھے ہٹ گئی۔ انکار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "ماں او بھائی کو تمہاری ضرورت ہے۔ خود کو اس قابل رکھو کہ ان کی مدد کر سکو۔ یہ جوتے سائز میں بڑے ہیں۔ مگر راسے کی سنگینی سے بچاتے رہیں گے۔ انکار نہ کرو۔ انہیں پہن لو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا۔ جب اس نے بڑے غرور سے کہا تھا کہ راج محمد کی دکان سے خریدے ہوئے سینڈل ہرگز نہیں پہنے گی۔ آج وہی جوتوں کا دکاندار اپنے پیروں کے جوتے اسے پیش کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم۔۔۔ تم رو کیوں رہی ہو؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں بھی تو اپنے گھر والوں کی مدد کرنی ہے۔ کیوں مجھ پر یہ احسان کر رہے ہو؟ کیوں خود کو تکلیف میں ڈال رہے ہو؟"

"بحث کرو گی تو میں خود کو اور تکلیف میں مبتلا کروں گا اور خود

پر ظلم کروں گا۔ تمہاری بے رخی مجھے جنون میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اگر چاہتی ہو کہ میں نارمل رہوں تو انہیں پہن لو۔ ورنہ اپنے ہاتھوں سے پہنانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

اس نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔ وہ بہت مجبور ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ موزے اور جوتے پہننے لگی۔ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک ذرا سی سہولت دے کر دل کو آسودگی مل رہی تھی۔ ایسے ہی وقت ماں کی پیاس یاد آنے لگی۔ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "میں امی کے لیے پانی لینے آیا تھا۔ وہ بے چاری پیاس کی شدت سے تڑپ رہی ہوں گی۔"

وہ بولی۔ "میں بھی اپنی ماں جی کے پاس جا رہی ہوں۔ اُدھر بھائی کو ملبے میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ۔کسے دیکھوں کسے سنبھالوں؟"

وہ پھر رونے لگی۔ راج محمد نے پہلی بار اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تمہارے آنسو دیکھ کر دل بیٹھ رہا ہے۔ حوصلہ کرو۔ میں اپنی امی کو پانی پلا کر انہیں کسی بھی طرح ملبے سے نکال کر جلد سے جلد تمہارے پاس آؤں گا۔ ایسی مصیبت میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں اپنی ماں کا خیال رکھنا چاہیے۔ میری فکر نہ کرو۔"

"یہ زندگی تمہاری ہی فکر کرنے کے لیے ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ یوں سمجھو کہ ابھی گیا اور ابھی آیا۔"

وہ ننگے پاؤں دوڑتا ہوا دور جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ بڑی احسان مندی سے ادھر دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے جوتوں کو دیکھنے لگی۔ اُس سے کترانے والی نے آج اُسے پہن ہی لیا تھا اور آج اُسے پہنا تھا تو کل اوڑھنے والی بھی تھی۔

***

پاکستان کے عوام شمالی علاقہ جات میں برپا ہونے والی قیامت صغریٰ سے بے خبر تھے۔ رمضان کے تیسرے دن صبح آٹھ بج کر باون منٹ پر جب مظفر آباد وغیرہ میں اس قیامت خیز زلزلے نے تباہی برپا کی تو عین اس وقت اسلام آباد کی ایک مشہور معروف رہائشی بلڈنگ بھی ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی۔ زلزلے کی ایک خطرناک لہر اُس دس منزلہ عمارت کو زمین بوس کرتی چلی گئی تھی۔

سیکڑوں افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔ کچھ سیمنٹ کی بھاری بھرکم دیواروں اور کنکریٹ کی دبیز چھتوں تلے موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہاں بھی فوری طور پر کوئی امدادی ٹیم نہیں پہنچی تھی۔

ایسے وقت عوام نے محبت اور ہمدردی کے جوش اور جذبوں کا بھرپور عملی اظہار کیا۔ ملک خداداد میں ایسی سہولیات

میسر نہیں تھیں کہ ہزاروں ٹن ملبوں کے نیچے زندہ دفن ہونے والوں کو فوری طور پر نکالا جاتا۔ انہیں نکالنے کے لیے ۔۔۔ کرینیں تھیں اور نہ ہی تربیت یافتہ ماہرین تھے۔ پاکستان بھر کی فلاحی تنظیمیں حرکت میں آگئی تھیں۔ زخمیوں کو فوری طور پر مختلف اسپتالوں میں پہنچایا جارہا تھا۔ میڈیا کے ذریعہ اس قیامت خیز زلزلے کی خبریں گھر گھر میں پہنچائی جارہی تھیں۔

اسلام آباد کی وہ عمارت حکومت، عوام اور غیر سرکاری تنظیموں کی مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ جو بھی امدادی کام ہورہا تھا۔ وہ صرف اس عمارت تک ہی محدود تھا۔ پوری قوم کی کئی گھنٹوں تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ شمالی علاقہ جات میں رہنے والے مظلوم کیسی آزمائش سے گزر رہے ہیں؟

پھر دھیرے دھیرے خبریں موصول ہونے لگیں۔ پاکستان کی تاریخ کے شدید ترین زلزلے کی تباہ کاریوں نے ملک کے اندر اور باہر ہر ذی روح کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ آزاد کشمیر کے تین اضلاع، راولاکوٹ، باغ، اور مظفر آباد کے علاوہ صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں گڑھی حبیب اللہ، بالاکوٹ، شنکیاری، بٹل، سانگلہ ہل اور ایبٹ آباد وغیرہ کے اٹھارہ ہزار کلومیٹر پر مشتمل پہاڑی علاقوں کے چالیس لاکھ عوام اس زلزلے کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی لاکھوں میں تھی۔

میڈیا اور پریس رپورٹرز میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ سب ہی متاثرہ علاقوں میں جاکر صورت حال کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ تازہ ترین خبریں اکٹھا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف تمام متاثرین عذاب میں مبتلا تھے۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر دے رہا تھا۔ فوری طور پر طبی امداد نہ ملنے کے باعث جو شدید زخمی تھے وہ موت کی آغوش میں جاکر ہمیشہ کے مطمئین ہوگئے تھے۔ شرح اموات اتنی زیادہ تھی کہ مرنے والوں کو اجتماعی قبروں میں دفنایا جارہا تھا۔

راج محمد ماں کے لیے پانی تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ جگہ جگہ بہنے والے پہاڑی چشمے نہ جانے کہاں گم ہوگئے تھے؟ کہیں کوئی سرکاری نل بھی سلامت نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا دریا کی طرف جانے لگا مگر وہاں پہنچ کر دماغ کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ آئینے کی طرف شفاف رہنے والا شور مچاتا ہوا دریا اس وقت کسی گندی ندی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ تیرتے ہوئے مردہ جانور، گھروں کا ملبہ اور پہاڑوں سے گرنے والے مٹی کے تودوں نے اس کے شفاف پانی کو حد درجہ آلودہ کر دیا تھا۔

وہ ناگواری سے منہ بناتا ہوا وہاں سے پلٹ کر واپس جانے لگا۔ بے بسی سے سوچنے لگا۔ "یہ کیسا برا وقت آیا ہے؟ ایک تو میں امی کو نکال نہیں پارہا ہوں اور اب یہ ایک نئی آزمائش شروع ہوگئی۔ کہاں سے ملے گا پانی۔۔۔؟ کیسے بجھے گی امی کی پیاس

۔۔۔؟ کوئی گھر سلامت ہوتا تو وہاں سے پانی مانگ لیتا۔ وہ بچار ی تڑپ رہی ہیں کہاں سے لاؤں پانی۔۔۔؟"

وہ علاقہ جہاں دریائے نیلم اور دریائے جہلم شیر و شکر ہو کر بہتے ہیں۔ وہاں کبھی پانی کی قلت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے سوچا اسے میں کسی نہ کسی سے مانگا جائے تو ایک کٹورا پانی ضرور مل جائے گا۔ وہ وہاں سے بھٹکتا ہوا خالی بالٹی لیے ماں کے پاس پہنچا تو ایکدم سے ٹھٹھک گیا۔ ہاتھ سے بالٹی چھوٹ گئی۔

رانو کا سر ماں کے سینے پر ایسے دھرا ہوا تھا۔ جیسے وہ اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرتے ہوئے سو گئی ہو۔ ماں کی پتھرائی ہوئی آنکھوں نے اسے سمجھا دیا۔ پھر بھی دل کہاں مانتا ہے؟ وہ اس کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے پکارنے لگا۔

"امی۔۔۔! امی جی۔۔۔! کیا ہوا؟ تم بولتی کیوں نہیں۔۔۔؟"

پھر اس نے گھبرا کر بہن کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"رانو۔۔۔! اٹھو۔۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ امی کو کیا ہوا ہے؟"

وہ بچی عالم بے خودی میں تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے حالات سے گزر رہی ہے؟ جب بھائی نے اسے جھنجھوڑا تو وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ملبے کے دوسری طرف حاجی صاحب کا بیٹا اپنے کسی عزیز کو نکال رہا تھا۔ اس نے بلند آواز میں راج محمد سے کہا۔ "صبر کرو۔ تمہاری امی اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔"

اس نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔ اس کا آدھا جسم اب بھی ملبے تلے دبا ہوا تھا۔ بیٹے کے اعصاب جیسے جواب دینے لگے۔ وہ ایک ہاتھ سے سر پیٹ پیٹ کر رونے لگا۔ ماں کو پکار پکار کر ماتم کرنے لگا۔ وہ اپنے گھر میں چوتھی میت دیکھ رہا تھا۔ باقی میتیں ملبے میں گم ہو چکی تھیں۔

* * *

سُندس ماں کے پاس پہنچی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان اس کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ دور و نزدیک اور کئی جوان فوری طبی امداد پہنچانے آ گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے پیاروں کو زندگی اور سلامتی نہ دے سکے۔ انہیں دفنا کر خدمت خلق کے جذبے سے آئے ہیں۔ دوسروں کو سلامتی دینا چاہتے ہیں۔

ایک جوان نے کہا۔ "ہم نے زمین بوس ہونے والی ایک دوا کی دکان کے ملبے میں گھُس کر فرسٹ ایڈ کا یہ سامان حاصل کیا ہے۔"

دوسرے جوان نے کہا۔ "اسپتال تو کھنڈر بن چکے ہیں۔ وہاں نہ دوائیں ہیں نہ ڈاکٹر ہیں۔ ہمیں اپنی مدد آپ کے طور پر بہت کچھ کرنا ہو گا۔"

ماں نے سُندس کو دیکھتے ہی پوچھا۔ "شیرو کہاں ہے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ ماں سے لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "تمام بچے اسکول کے ملبے میں دبے پڑے ہیں۔

وہ بھی کہیں ہے۔ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ ہمیں فوراَ وہاں جانا ہو گا۔"

ماں اٹھنے بیٹھنے کے قابل تو ہو گئی تھی مگر دونوں پیر اس بری طرح کچلے گئے تھے کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بیٹے کی حالت زار سنی تو ایک دم سے تڑپ کر بولی۔

"میں جاؤں گی۔۔۔ ابھی جاؤں گی۔ مجھے کسی بھی طرح وہاں تک پہنچا دو۔۔۔"

"مجھے گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ۔۔۔ مگر کسی طرح بھی لے جاؤ۔ میں ابھی ملبے سے نکل کر آئی ہوں۔ میں جانتی ہوں زندہ در گور ہو کر زندگی مُردوں سے بدتر لگتی ہے۔ میرا بچہ اسکول کی قبر میں کیسے سانسیں لے رہا ہو گا؟ مجھے پکارنے کے قابل بھی ہو گا یا نہیں۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ مجھے لے چلو۔۔۔! ابھی لے چلو۔"

ایک نوجوان نے کہا۔"ہم آپ کی ممتا کو سمجھ رہے ہیں۔ ذرا صبر کریں۔ ہم ابھی آپ کو وہاں تک پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں۔"

دو نوجوان تیزی سے چلتے ہوئے وہاں سے گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک خالی ریڑھا دھکیلتے ہوئے لے آ گئے۔ انہوں نے ماں کو اٹھا کر اس پر لٹا دیا۔ وہ انہیں دعائیں دینے لگی۔ وہاں دو اور ایسے جوان تھے۔ جنہوں نے فوری طبی امداد پہنچانے کی تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔"ہم یہاں کچھ نہیں کر سکتے۔ وہاں بچوں کو نکالنے کی کوششیں تو کر سکتے ہیں۔"

دوسرے جوان نے سُندس سے کہا۔"آگے چلو۔ ہمیں بتاؤ۔ اسکول کہاں ہے؟"

وہ اُس کی رہنمائی میں ریڑھے کو دھکیلتے ہوئے اسکول کی طرف جانے لگے۔ ماں بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ جا بجا زخموں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دونوں پیروں کی حالت تو ایسی تھی جیسے ٹخنوں اور پنجوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ درد کے مارے جان نکلی جا رہی تھی۔ لیکن بیٹے کے لیے ایسے تڑپ رہی تھی کہ اپنی تکالیف کو بھولتی جا رہی تھی۔

اسکول کی عمارت کا ملبہ تین گھنٹے گزر جانے کے باوجود جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ ریڑھے کو وہاں تک پہنچا کر اُن جوانوں نے سندس سے کہا۔"ماں جی یہاں رہنے دو۔ پہلے بھائی کو تلاش کیا جائے کہ وہ کہاں ہے؟ پھر ہم انہیں وہاں لے جائیں گے۔"

ماں نے کہا۔"میری فکر نہ کرو۔ جلدی جاؤ۔ پہلے میرے بچے کو تلاش کرو۔"

وہ تینوں ملبے کے قریب آ گئے۔ دور تک بے شمار مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا۔ وہاں کی صورت حال اب تک مایوس کُن تھی۔ کہیں سے کوئی مدد نہیں رہی تھی۔ نہ ہیلی کاپٹر واپس آیا تھا نہ کوئی کرین آئی تھی۔ جن لوگوں کو اپنے بچوں کا

سراغ مل گیا تھا، وہ کُدال بیلچے، چھینی اور ہتھوڑوں کے ذریعہ دیواروں اور پتھروں کو توڑ کر انہیں وہاں سے نکال لانا چاہتے تھے۔

وہاں کا منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ جب اوپر سے کُدال اور ہتھوڑوں سے ضربیں لگائی جاتی تھیں تو نیچے پڑے ہوئے بچوں تک دھمک پہنچتی تھی۔ وہ تکلیف کے مارے چیخنے چلانے لگتے تھے۔ بڑی مجبوری تھی، اپنے پیاروں کو اپنے جگر گوشوں کو وہاں سے نکالنے کے لیے یوں انہیں اذیتیں پہنچانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

وہ دونوں جوان سندس کے ساتھ دوڑتے ہوئے جگہ جگہ پہنچ رہے تھے۔ جہاں کسی بچے کی آواز سنائی دیتی تھی، وہاں سے بھاری پتھروں کو اٹھا اٹھا کر اندر جھانکنے کا راستہ بناتے تھے۔ وہ بھائی کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت دوسری طرف کھدائی کرنے والوں میں سے ایک کے ہاتھ تھم گئے۔ وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں چلا کر بولا۔ "ارے یہ دیکھو۔۔۔ یہ کسی بچے کا ہاتھ نظر آرہا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب ہی ادھر متوجہ ہوئے سب ہی کے دلوں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ ہمارا ہے۔ ہمارا ہی بچہ ہو گا۔۔۔ کہاں ہے؟ کون ہے؟ ہمیں دکھاؤ۔۔۔"

ملبے کے نیچے سے اس بچے کا صرف ایک ہاتھ جھانک رہا تھا اور اس ہاتھ کو دیکھنے کے لیے سب ہی بے چین ہو گئے تھے۔

لیکن وہ ہاتھ بول نہیں سکتا تھا کہ کس کے دل کا ٹکڑا ہے؟

سُندس بھی دوڑتی ہوئی ادھر چلی آئی تھی۔ عورتوں مردوں کی بھیڑ میں اُس بچے تک پہنچنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ جو قریب تھے، وہ زمین پر دوزانو ہو گئے تھے۔ اندنیم تاریکی میں دیکھ رہے تھے۔

ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ "بچہ زندہ ہے۔ اس کے رونے کی آواز آرہی ہے "

یہ بات سن کر کچھ اور لوگ وہاں جھک جھک کر بچے سے مختلف سوالات پوچھنے لگے۔ وہ جواب میں سوائے رونے کے اور کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ ایک نے کہا۔ بچہ سہا ہوا ہے۔

"اگر وہ بولے گا نہیں تو معلوم کیسے ہو گا کہ یہ کس کا ہے؟" کسی نے کہا۔ "کسی کا بھی ہو۔ وہ زندہ ہے۔ شدید تکلیف میں ہے۔ اسے نکالنا ہمارا فرض ہے۔"

کھدائی کرنے والے نے کہا۔ "ملبہ بہت زیادہ اور بھاری ہے۔ اسے ہٹانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔"

ایک عورت نے تڑپ کر کہا۔ "تو کیا اس معصوم کو یونہی پڑا رہنے دوگے؟ وہ بیچارہ بلک رہا ہے۔ خدا کے لیے۔۔ سب مل کر کوشش کرو۔ اسے باہر نکالو۔"

سُندس راستہ بناتی ہوئی وہاں تک پہنچ گئی۔ بچے کے رونے اور سسکنے کی آواز اس کے دل پر دستک دے رہی تھی۔ دستک بالکل جانی پہچانی تھی۔ جو لوگ جھکے ہوئے تھے۔ وہ انہیں

جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "ہٹو۔ ہٹ جاؤ۔۔۔ مجھے پوچھنے دو۔۔۔ میرا دل کہتا ہے، یہ میرا بھائی ہے۔ میرا شیرو ہے۔ شیرو۔۔۔! شیرو۔۔۔"!

وہ سب ایک طرف ہو گئے۔ سُندس نے فوراً ہی دوزانو ہو کر اُس ہاتھ کو تھام لیا۔ اسے سہلانے لگی۔ پہچاننے لگی۔ "یہ شیرو ہے۔۔۔ میرا بھائی ہے۔"

ایک نے پوچھا۔ "ہاتھ تو سب بچوں کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس سے نام تو پوچھو۔۔۔"

باہر روشنی تھی۔ اندر نیم تاریکی میں وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولی۔ "شیرو۔۔۔ میری جان! میں آگئی ہوں۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ حوصلہ کرو۔ ہم ابھی تمہیں نکال رہے ہیں۔ انہیں بتاؤ تم میرے شیرو ہو۔"

اُس کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "با۔۔جی۔۔۔ باجی"!

سُندس نے خوشی سے چیخ ماری۔ "یہ میرا شیرو ہے۔۔۔"

وہ سر اٹھا کر لوگوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے اسے اور اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ اسے کسی طرح نکالو۔ خدا کے لیے جلدی نکالو۔۔۔ "

اس کے ساتھ آئے ہوئے جوانوں نے کہا۔ "باجی! تم وہاں سے ہٹ جاؤ۔ ہم اسے نکالیں گے۔"

وہ شیرو کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولی۔ "میری جان! میں ہاتھ چھوڑ رہی ہوں۔ مگر تمہارے پاس ہی رہوں گی۔ ابھی ماں جی بھی تمہارے پاس آئیں گی۔"

وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ کتنے ہی لوگ ان دو جوانوں کے ساتھ آگے بڑھ کر اُس وزنی ملبے کو ہٹانے کی تدبیر کرنے لگے۔ اسکول کی چھت کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر بچوں پر آپڑی تھی۔ کچھ بچے اس طرح زندہ رہ گئے تھے کہ کوئی ستون یا دیوار اُن بچوں اور چھت کے درمیان آڑے آگئی تھی۔ اس کے باوجود اُن کے جسموں کا کوئی نہ کوئی حصہ کہیں پھنسا ہوا تھا۔

شیرو کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ جہاں پڑا ہوا تھا۔ وہاں چاروں طرف سے جکڑا ہوا تھا۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا اور باہر سے اتنی جگہ نہیں تھی کہ کوئی اندر کی طرف جھک کر اُسے کھینچ کر نکال سکتا۔ بس ایک ہاتھ کسی طرح باہر نکل آیا تھا۔

اللہ تعالی نے ہاتھ اسی لیے دیئے ہیں کہ ایک دوسرے کو پیار محبت سے تھام کر ایک گھریلو، سماجی اور معاشرتی زندگی گزاری جائے۔ یہ ہاتھ ماں کے گلے میں باہنیں ڈالتا ہے اور بہن کی کلائیوں میں چوڑیاں پہناتا ہے۔ پھر اسے ڈولی میں لے جا کر بٹھاتا ہے۔ وہی ہاتھ قبر سے باہر نکل کر ماں اور بہن کو الوادع کہہ رہا تھا اور بہن دور دور سے دیکھ کر تڑپ رہی تھی۔

***

موت بڑی مہربان ہے۔ جب آتی ہے تو زندگی کے تمام جھمیلوں سے نجات دلا دیتی ہے۔ راج محمد نے ماں کی کھلی ہوئی آنکھوں کو بند کر دیا تھا۔ اُس پر چادر ڈال دی تھی۔ اُس بوڑھی خاتون نے زندگی کے آخری لمحات میں بڑی اذیتیں برداشت کی تھیں۔ گھر کی چار دیواری کے بوجھ کو اپنے وجود پر برداشت کرتی رہی تھی۔

ایسا نہ پہلے کبھی ہوا تھا نہ کبھی سنا گیا تھا کہ انسان جیتے ہی آدھا قبر کے اندر رہتا ہے، آدھا باہر۔۔۔ ملبے کی قبر اُس کے آدھے وجود کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور باہر سے زندگی اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ پوری طرح موت کے شکنجے میں نہیں تھی۔ جوان بیٹے اور دنیا والوں کے لیے چیلنج بن گئی تھی کہ ابھی میں تمہاری دسترس میں ہوں۔ مجھے بچا سکتے ہو تو بچا لو۔۔۔

بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ بیٹے کو یہ تماشا دیکھنا تھا کہ ماں کس طرح لمحہ بہ لمحہ بے کسی کی حالت میں تڑپ تڑپ کر جان دیتی ہے؟

مقدر نے یہ تماشا دکھایا اور بیٹے نے دیکھ لیا۔ موت کے بعد بھی تماشا ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اُس نے ماں پر چادر ڈال دی تھی۔ مگر دستور کے مطابق کفن پہنانا تھا اور اُسے دفن کرنا تھا۔ اُس کا آدھا وجود تو جیسے قبر میں تھا لیکن جو آدھا دکھائی دے رہا تھا اُسے کس طرح قبر میں اتارا جائے۔۔۔؟

اُسے باہر نکال کر دفنایا نہیں جا سکتا تھا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے وہ اُسے سمجھا رہے تھے کہ صبر کرنا ہوگا۔ ان چھتوں اور دیواروں کے بڑے بڑے ٹکڑے ہاتھوں سے ہٹائے نہیں جا سکتے۔ کسی کے والدین کسی کے بہن بھائی اور کسی کے معصوم بچے اندر دبے پڑے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں؟ بہر حال وہاں اُن کی قبریں بن چکی ہیں۔ یہاں تمہاری ماں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ اس لیے صبر کرو۔

وہ تڑپ کر بولا۔ "کیسے صبر کروں؟ اگر یہ بھی دوسروں کی طرح نظر نہیں آتیں تو ذرا تسلی ہو جاتی کہ زمین کے نیچے نہ سہی۔۔ زمین کے اوپر ہی ملبے میں دفن ہو چکی ہیں۔ ان کی تدفین نہیں ہوگی تو صبر کیسے آئے گا؟"

یہ حقیقت ہے بندہ مرنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہو جائے تو یک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی آرام گاہ میں بڑے آرام سے ہے۔ اس اطمینان کے بعد ہی لوگ اپنے دوسرے کام نمٹانے لگتے ہیں۔ ماں کی تدفین کے بعد سُدس کی خبر گیری اور دستگیری بہت ضروری تھی۔

لیکن وہ اُس مصیبت کی ماری تک کیسے پہنچے؟ ماں کی زندگی میں اُسے تحفظ نہ دے سکا، اب وہ لاش کہہ رہی تھی کہ زندگی میں نہ سہی۔۔۔ موت کے بعد ہی میری نگرانی کرو۔ ورنہ یہاں کوئی نہ ہوگا تو کتے اور چیل کوئے آکر بوٹیاں نوچیں گے۔

اور اگر نگرانی کی جائے گی تو کب تک۔۔۔؟ کتنے دنوں تک ملبے ہٹائے نہیں جاسکیں گے؟ اس عرصے میں تو کیڑے پڑ جائیں گے۔ کیا ایسا منظر آنکھوں سے دیکھا جاسکے گا؟

راج محمد کا سر چکرا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ ایسے وقت رزاق وہاں پہنچ گیا۔ اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ روتے روتے کہنے لگا۔ "میری ماں، میرے بابا اور میرا چھوٹا بھائی سب ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ وہ ملبے کے نیچے اس طرح تھے کہ انہیں آسانی سے نکال لیا گیا تھا۔ ابھی اُن کی تدفین کے بعد تیرے پاس آیا ہوں۔"

راج محمد نے ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھی بری طرح لٹ گیا ہوں۔ دیکھ۔۔۔ یہ میری امی ہیں اور گھر کے ملبے میں میرا پورا خاندان نابود ہو گیا ہے۔"

رانو ایک طرف بیٹھی رو رہی تھی۔ رزاق نے اُسے گود میں اٹھا کر تھپکتے ہوئے کہا۔ "ہو جاؤ۔ مرنے کے بعد کوئی واپس نہیں آتا۔ تمہارے آنسو بھی ماں جی اور بہنوں بھائیوں کو واپس نہیں لاسکیں گے۔ صبر کرنا ہو گا۔ چپ ہو جاؤ۔۔۔ "

راج محمد نے کہا۔ "امی کا کیا ہو گا؟ یہ کب تک اسی طرح پڑی رہیں گی؟"

پھر اُس نے دو چار افراد کو بلا کر کہا۔ "مرنے کے بعد انسان کو اس لیے بھی چھپا دیا جاتا ہے کہ انسانی جسم کا آخری انجام دیکھا نہ جاسکے۔"

ایک نے کہا۔ "ہم اس بات کو سمجھتے ہیں۔ لیکن خاتون کے کیا کیا جائے؟ انہیں تو نہ یہاں سے نکالا جاسکتا ہے، نہ قبر میں اتارا جاسکتا ہے۔"

رزاق نے کہا۔ "زمین کے اوپر بھی قبر بنائی جاسکتی ہے۔ زندگی ہو یا موت۔۔۔ خواتین کے لیے پردہ لازمی ہے۔ انہیں زمین کے اوپر قبر میں چھپایا جاسکتا ہے۔"

سب ہی نے اس بات سے اتفاق کہا۔ قبر بنانے سے پہلے نام جنازہ ادا کی گئی۔ پھر وہ جہاں تک دکھائی دے رہی تھی وہاں تک اس کے آس پاس بڑے بڑے پتھر چُن دیئے گئے۔ اُن پر لکڑی کے تختے بچھا کر بیلچوں سے مٹی ڈال دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک اونچی سے قبر بن گئی۔ ماں کے جسم کا کچھ حصہ اُس تازہ قبر میں اور باقی حصہ ملبے میں چھپ گیا۔

انہوں نے دکھے ہوئے دل سے فاتحہ خوانی کی۔ راج محمد نے رانو کو آغوش میں لے کر کہا۔ "یہ صبح سے بھوکی پیاسی ہے۔ کھلے آسمان کے نیچے رہ سکتے ہیں۔ لیکن کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام کرنا ہو گا۔"

رزاق نے کہا۔ "میرے مو موں کا گھر اس طرح ٹوٹا ہے کہ اس کا ایک حصہ کسی حد تک رہایش کے قابل ہے۔ ماموں اور ممانی کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ ہم اسے وہاں پہنچا دیتے ہیں۔" وہ بولا۔ "میں تیرے ماموں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک تو وہ ہڈ حرام ہیں پھر بلا کے لالچی ہیں۔ انہیں کچھ دینے کے لیے

ابھی میرے پاس رقم نہیں۔"

"میری جیب میں دو ہزار ہیں۔ میں انہیں ایک ہزار دوں گا تو وہ راضی خوشی رانو کو اپنے پاس رکھ لیں گے۔"

چار برس کی بچی بھوک پیاس سے اور صدمات سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اسے رزاق کے ماموں کے پاس پہنچادیا گیا اور ایک ہزار روپے سے ماموں کی مٹھی بھی گرم کر دی گئی۔ ماموں نے کہا۔"فکر نہ کرو۔ میں ایک دکان کے ملبے میں گھس کر آٹا، چاول اور دال لے آیا ہوں۔ کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ بچی یہاں بھوکی نہیں رہے گی۔"

راج محمد نے مطمئن ہو کر رزاق سے کہا۔"اب ہمیں اسکول کی طرف جانا چاہیے۔ پتا نہیں سُندس کس حال میں ہو گی؟ اس کا بھائی وہاں سے نکالا گیا ہے یا نہیں؟ ہمیں اُس کے لیے کچھ کرنا ہو گا۔"

وہ اسکول کی طرف جانے لگے۔ راسے میں رزاق نے پوچھا۔"یہ تیرا ہاتھ اس طرح کیوں مڑا ہوا ہے؟ میں نے پہلے بھی پوچھا تھا لیکن سُندس کا خیال آتے ہی تو مجھے چھوڑ کر اس کی طرف دوڑتا چلا گیا تھا۔"

وہ اسے بتانے لگا کہ اس نے محبت کے جنون میں خود پر کیسا ظلم کیا ہے؟ رزاق نے تمام باتیں سن کر کہا۔"تو جتنا اچھا انسان ہے اُتنا ہی کم عقل اور عاقبت نااندیش ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔"امی نے بھی آخری وقت طعنے دیئے تھے۔ تُو بھی باتیں سنا۔۔۔ لیکن میں کیا کروں؟ سُندس ہے تو میری زندگی ہے میری دنیا ہے۔ اس کی بے رخی مجھے جنون میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ مجھ سے راضی ہے۔ پہلے کی طرح منہ نہیں پھیرتی ہے۔ مجھ سے باتیں کرنے لگی ہے۔"

جب وہ اسکول کے پاس پہنچے تو شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ بچوں کے والدین اور رشتہ دار ابھی تک وہاں موجود تھے۔ نمازیں پڑھ رہے تھے۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ کتنے ہی جوان سُرنگ کھودتے ہوئے ملبے کے نیچے سے بچوں تک پہنچنے کے راستے بنارہے تھے۔ اوپر سے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ سُرنگ کے ذریعہ اندر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سہ پہر کے بعد مختلف نیوز رپورٹرز کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ شہر کے مختلف حصوں میں جا کر تباہی اور بربادی کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ جہاں جاتے تھے متاثرین ان کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ شکایت کرتے تھے کہ کوئی اُن کی مدد کے لیے کیوں نہیں پہنچ رہا ہے؟ کیا ہمارے ملک میں بھاری پتھروں کو ہٹانے والی کرینیں نہیں ہیں؟ کیا ملک خداداد میں زندہ درگور ہونے والوں کو زندگی کی طرف واپس لانے کے انتظامات نہیں ہیں؟

پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کے پاس ان سوالات کے

جوابات نہیں تھے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ حکومت اور دیگر امدادی ٹیمیں وہاں پہنچنے والی ہیں اور بہت کچھ کرنے والی ہیں۔ وہ انہیں تسلیاں دے رہے تھے۔

راج محمد اور رزاق نے سُندس کے پاس پہنچ کر دیکھا تو وہ انتہائی صدمات سے گزر رہی تھی۔ اس کا بھائی شیرو اس طرح ملبے میں دبا ہوا تھا کہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف اس کا ایک ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی اُس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ماں جی کو ریڑھے پر سے اٹھا کر بیٹے کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی اس ہاتھ سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ ماں نے بیٹے کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "میں آ گئی ہوں۔ میرے بچے۔۔۔! حوصلہ نکالا جائے گا۔ بس ذرا صبر کرو میری جان۔۔۔! تکلیف برداشت کرتے رہو۔ ابھی آرام آ جائے گا۔"

راج محمد ایک ہاتھ سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ دوسرے جوانوں کی طرح مٹی کھود کر اس کے بھائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اُس کے کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔ رزاق نے ان نوجوانوں کے ساتھ مٹی کھودتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ ہم شیرو تک ضرور پہنچیں گے۔"

وہ انتہائی دردناک خطر تھا۔ ماں اور بہن اُس ننھے سے ہاتھ کو تھامے ہوئے تھیں۔۔ مگر وہ ننھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صبح سے شام ہو گئی تھی۔ کہیں سے اذان سنائی دی تو یاد آیا کہ افطاری کا وقت ہو چکا ہے اور وہ بھی کیا وقت تھا کہ کسی کے پاس افطار کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ کچھ لوگ کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے دوڑتے ہوئے وہاں سے کہیں چلے گئے۔ باقی بھوکے پیاسے ہی مغرب کی نماز ادا کرنے لگے۔

دن ڈوب گیا تھا۔ انہوں نے قیامت کا دن دیکھا تھا اب قیامت کی اندھیری رات کو دیکھ رہے تھے۔ بجلی اور دیگر مواصلات کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ پتا نہیں تقدیر انہیں ایسے کتنے دن اور کتنی راتیں دکھانے والی تھی؟

***

موسم بھی کچھ نامہرباں سا تھا۔ دن کو گرمی ہوتی تھی اور سر شام ہی ٹھنڈ پڑنے لگی تھی۔ پھر جیسے جیسے رات گزرتی جاتی تھی سردی بھی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ ماں بیٹی شیرو کے ہاتھ کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ راج محمد اُن کے لیے اونی کھیس لے آیا تا کہ وہ سردی سے محفوظ رہیں۔ ماں نے روتے ہوئے کہا۔ "میرا بچہ سردی میں ٹھٹھرتا رہے گا۔ یہ کھیس اُس پر کیسے ڈالوں؟ ہمارے تو ہاتھ بھی اندر نہیں پہنچ رہے ہیں۔"

اُس معصوم بچے کی تکلیف کو ایک ماں اور بہن سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ افطار کے وقت انہیں کچھ کھانے کو دیا گیا تھا۔ وہ خوراک جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اندر بھوکا پیاسا بلک رہا تھا۔ ایک دانہ تو کیا ایک قطرہ پانی بھی اُس

کے حلق تک پہنچایا نہیں جا سکتا تھا۔

جو لوگ مٹی کھود کر اُس کے قریب پہنچنا چاہتے تھے وہ آگے بڑھتے رُک گئے تھے۔ آگے مٹی نہیں تھی۔ پتھر ہی پتھر تھے۔ خندق کھودنے اور سُرنگ بنانے والے اوزار کام نہیں آرہے تھے۔

اب بھی کچھ اُمید تھی وہ راستہ بدل کی مٹی کھودتے ہوئے شیرو تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر انہوں نے یہی کیا۔ رزاق سب سے آگے تھا۔ وہ لوہے کی سبل لے کے مٹی کھودتا اور چھوٹے بڑے پتھروں کو توڑتا جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت زلزلے کا پھر ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ پورے دن میں یہ تیسرا جھٹکا آیا تھا۔ ان جھٹکوں کی شدت زیادہ نہیں تھی۔ مگر لوگ بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ اُس وقت بھی عورتوں اور مردوں کی چیخ پکار سنائی دینے لگی۔

رزاق جدھر کی کھدائی کر رہا تھا اُدھر کا ملبہ ایک زوردار آواز کے ساتھ ذرا نیچے آیا۔ اُس کی ایک چیخ سنائی دی۔ اُس کے ساتھ ہی اندر شیرو بھی چیخنے لگا۔ ماں اور بہن نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ چیخ چیخ کر اسے پکارنے لگیں۔

"شیرو۔۔! شیرو۔۔۔! یا خدا! میرے بچے پر رحم فرما۔۔۔ یا خدا۔۔۔! میرے بھائی پر رحم فرما۔۔۔ یا خدا! ہم کیا کریں؟ کس طرح اسے بچائیں؟"

اس ہلکے سے جھٹکے کے بعد ملبہ ذرا سا اِدھر اُدھر ہر کر تھم گیا۔ شیرو کی آواز بھی تم گئی۔ وہ گھبرا کر اس کے ہاتھ کو ہلانے لگیں۔ اسے آوازیں دینے لگیں۔ پھر سُندس نے اُس کی نبض ٹٹولی۔ "ماں جی۔۔۔! زندہ ہے۔ میرا بھائی زندہ ہے۔"

دوسری طرف رزاق کی چیخ سنائی دی تھی اور وہ اُس کی آخری چیخ تھی۔ اس کا سر اور سینہ ملبے کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ بے جان ہو چکا تھا۔ اسے بڑی مشکلوں سے نکالا گیا۔ سر اس بری طرح کچل گیا تھا کہ راج محمد اپنے دوست کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس کے بے جان وجود سے پلٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کچلی ہوئی لاش مارے صدمے کی دیکھی نہیں جاتی۔ بے شمار گھروں، چھوٹی بڑی عمارتوں اور اسکولوں کے ملبوں میں مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے بری طرح کچلے گئے تھے۔ لیکن زندہ رہ جانے والے عزیز و اقارب چشم تصور سے اُن کی کچلی ہوئی لاشیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ بس دل کو تسلیاں دے رہے تھے کہ وہ ملبے کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ مقدر کی مہربانی سے کسی روز زندہ نکل آئیں گے۔

شام ہونے تک کچھ غیر سرکاری فلاح تنظمیں امداد کو پہنچ گئی تھیں۔ لیکن اُن کے پاس بھاری ملبہ ہٹانے والی کرینیں نہیں تھیں اور نہ ایسے تربیت یافتہ ماہرین تھے۔ جو یہاں کئی کی حالت میں رہنے والوں کو باہر نکال سکتے۔ جو امدادی ٹیمیں

آئی تھیں۔ وہ زندہ سلامت رہنے والوں کو کھانا، گرم کپڑے اور کمبل فراہم کر رہی تھیں۔ جگہ جگہ اعلان کرتے ہوئے بتایا جا رہا تھا کہ سحری اور افطاری کے لیے لنگر کھولے گئے ہیں۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے کیمپ لگائے گئے ہیں۔ ڈوبنے والوں کے لیے تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ اسپتال نہیں تھے۔ تجربہ کار ڈاکٹرز نہیں تھے۔ لیکن کیمپوں میں فرسٹ ایڈ پہنچانے والوں کے پاس مرہم پٹی کا سامان تھا۔ عارضی طور پر مسیحائی کے لیے کچھ دوائیں بھی تھیں۔ زلزلے سے متاثر ہونے والے اپنے گھروں سے ایک تنکا بھی نہیں نکال پائے تھے۔ ایسے میں انہیں کچھ گرم کپڑے اور کمبل مل رہے تھے۔ کسی حد تک جینے کا سہارا مل رہا تھا۔

وہ رات گزر گئی۔ سُندس اور ماں جی شیرو کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ کبھی سُندس اسے تھام کر چومتی تھی، کبھی ماں اسے چوم کر سہلاتی تھی۔ رو رو کر اسے پکارتی تھیں۔ لیکن جواب نہیں مل رہا تھا۔

ماں گھبرا کر کہتی تھی۔ "یہ بولتا کیوں نہیں ہے؟"

سُندس پھر اُس کی نبض ٹٹولتی تھی اور کہتی تھی۔ "یہ زندہ ہے۔ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بول نہیں پا رہا ہے۔"

ماں تڑپ تڑپ کر اس چھوٹے۔۔۔ خلا کی طرف دیکھتی تھی، جہاں سے ہاتھ نکلا ہوا تھا۔ اگر اندر جانے کا ذرا سا بھی راستہ بن جاتی تو وہ اب تک اپنے بیٹے کے ساتھ دفن ہونے کے لیے وہاں پہنچ جاتی۔ وہ کبھی سینہ پیٹ رہی تھی، کبھی سر پٹخ رہی تھی۔ "یا خدا۔۔۔! یہ میرے بچے پر کیسا ظلم ہو رہا ہے؟ ننھی سی جان ہے اور خوفناک موت سے لڑ رہا ہے۔ اکیلا لڑ رہا ہے۔ میں ماں ہو کر اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میرے مالک! میرے معبود! میرے بچے کو آرام دے۔ زندگی دے۔ یا مجھے ابھی اٹھا لے۔ مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا ہے۔"

سُندس اور راج محمد سے بھی دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ایک معصوم بچہ بھوکا پیاسا پتا نہیں اس وزنی ملبے کے نیچے کس طرح دبا ہوا تھا؟ کیسی تکالیف برداشت کر رہا تھا؟ اسے موت ہی مل جاتی تو ذرا اطمینان ہو جاتا کہ تمام مصائب سے نجات مل چکی ہے۔ نہ موت آ رہی تھی۔ نہ زندگی مل رہی تھی۔ رات تین بجے پھر اس کی ایک ہلکی سی کراہ سنائی دی۔ اس نے دھیمی سی آواز میں پکارا تھا۔ "ماں جی۔۔۔!"

وہ سب ہی تڑپ کر اس خلا کی طرف جھک گئے۔ اسے جواباً آوازیں دینے لگے۔ حوصلہ دینے لگے۔ اس کے پاس پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مگر جھوٹی تسلیاں دینے لگے کہ اُسے نکالنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اندر پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ اس کے بعد شیرو کی آواز سنائی نہیں دی۔ لیکن نبض کہہ رہی تھی کہ وہ بچہ ماں کے پاس آنے کے لیے موت سے لڑ رہا ہے۔ ان حالات میں لڑنے کا حوصلہ نہیں رہتا۔ پھر بھی اپنے مقررہ وقت تک جینے کے

لیے سانسیں لینی ہی پڑتی ہیں۔ اُن لمحات میں وہ بچہ سکرات کے عالم میں ہو گا۔ نہ جی رہا ہو گا نہ مر رہا ہو گا۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ ایک معصوم بچہ کوئی گناہ کوئی غلطی کیے بغیر اپنے پیدا ہونے کی سزا پا رہا تھا۔

قیامت کی وہ رات بچے کے ہاتھ کو تھامے تھامے گزر گئی۔

دوسرا دن نکل آیا۔ مزید امدادی ٹیمیں آنے لگیں۔ قیمتی گاڑیوں میں کچھ ایسی دولت مند خواتین بھی آئیں جو لاوارث بچوں کو گود لینا چاہتی تھیں۔ ان بچوں کو بچھڑے ہوئے ماں باپ کا پیار دینا چاہتی تھیں۔ وہاں بے شمار ایسے بچے تھے۔ جن کے نہ ماں باپ رہے تھے کہ کوئی سرپرست رہا تھا۔ کوئی انہیں ایک وقت کی روٹی کھلانے والا بھی نہیں رہا تھا۔

رانو ماموں کے مکان کے سامنے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں اسے کچھ کھانے پینے کے لیے مل گیا تھا۔ وہ ایک میلے کچیلے بستر پر پھٹا پرانا لحاف اوڑھ کر رات گزراتی رہی تھی۔ اپنی ماں کو اور مرنے والے رشتہ داروں کو یاد کر کے روتی رہی تھی۔ ماموں اور ممانی کا رویہ ایسا تھا جیسے اُسے بوجھ سمجھ رہے ہوں۔

وہ چار برس کی بچی اُن کی خود غرضی کو اور مطلب پرستی کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ اُسے محبت اور اپنائیت نہیں مل رہی ہے۔ دوسرے دن بھائی آئے گا تو وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ اسی لیے وہ مکان کے باہر آکر بیٹھ گئی تھی۔ بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔ دور دور تک دیکھ رہی تھی اور مایوس ہو رہی تھی۔ ایسے ہی وقت ایک گاڑی وہاں آکر رُک گئی۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون نے رانو کو دیکھتے ہی ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی دوسری خاتون نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "ادھر دیکھو۔۔۔ وہ بچی جو بیٹھی ہوئی ہے۔ کتنی خوبصورت ہے؟ اتنی تباہی اور بربادی، غریبی اور مفلسی کے باوجود کیسی گوری گوری، گلابی گلابی سی رنگت ہے؟ ایسے تیکھے نین نقش والی لڑکیاں جوان ہو کر قیامت بن جاتی ہیں۔"

دوسری خاتون نے رانو کو گہری توجہ سے دیکھا۔ پھر اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون سے کہا۔ "نوشاد بیگم۔۔۔! اب تک ہم نے پانچ بچیوں کو گود لیا ہے۔ یہ تو ان سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مگر۔۔۔۔"

نوشاد بیگم نے پوچھا۔ "مگر کیا؟"

"وہ پانچوں بچیاں لاوارث ہیں۔ اُن کے محلے اور پڑوس والوں نے انہیں ہمارے پاس پہنچایا ہے۔ لیکن یہ بچی لا وارث نہیں لگتی۔ اس گھر میں اپنے ماں باپ کیساتھ رہتی ہو گی۔"

"ہاں۔ مگر اس مکان کو دیکھو۔ آدھے سے زیادہ تباہ ہو چکا

ہے۔ یہ لوگ بھی غریب اور ضرور تمند ہوں گے۔ بات کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

وہ دونوں گاڑی سے باہر آ گیءں۔ ایک نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ "ہارن بجاؤ۔۔۔"

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ دونوں رانو کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ ایک اس کے چہرے کو جگہ جگہ سے چھو کر دیکھنے لگی۔ دوسری اس کے بدن کی رنگت اور چکناہٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ ماموں ہارن کی آواز سن کر باہر آیا پھر ان خواتین کو دیکھ کر بولا۔ "جی۔۔۔ فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

نوشاد بیگم نے رانو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کتنی پیاری بچی ہے؟ کیا تمہاری ہے؟"

"نہیں جی۔۔۔ پرائی ہے۔ اس کا بھائی بوجھ سمجھ کر یہاں چھوڑ گیا ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ پھر بھی اس کا خرچہ برداشت کر رہا ہوں۔"

نوشاد بیگم نے کہا۔ "تم ذرا اُدھر چلو۔ میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ دونوں رانو سے دور چلے آئے۔ نوشاد بیگم نے کہا۔ "میں بے اولاد ہوں۔ بچوں کے لیے ترستی ہوں۔ کوئی بچی مل جائے تو اسے حاصل کرنے کے لیے پانچ ہزار روپے دے سکتی ہوں۔"

"پانچ ہزار۔۔۔؟ ماموں کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ "پانچ ہزار روپے۔۔۔؟"

نوشاد بیگم اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے دور بیٹھی ہوئی رانو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسی خوبصورت بچی مل جائے تو میں اس کے دس ہزار بھی دیدوں گی۔"

ماموں کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ اس نے پوچھا۔ "دس ہزار روپے۔۔۔؟ کیا ابھی دیں گی؟"

"ہاں۔ بچی دیکھ رہی ہے۔ میں اس کے سامنے لین دین نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ رانو کے قریب کھڑی ہوئی خاتون نے بھانپ لیا کہ کام بن رہا ہے۔ اس نے جھک کر رانو کو چومتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

"میرا نام رانو ہے۔ ابھی میرے بھائی جان آئیں گے تو مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔"

وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "تم بہت مصیبت زدہ ہو۔ کیا صرف تمہارا بھائی ہے اور کوئی نہیں ہے؟"

اسے محبت اور ہمدردی ملنے لگی تو وہ اپنا دکھڑا سنانے لگی۔ ادھر کار کی پچھلی سیٹ پر تھوڑی دیر تک کھچڑی پکتی رہی پھر وہ دونوں باہر آ گئے۔ ماموں نے اپنے کان سے موبائل فون لگا

رکھا تھا اور رانو کے قریب آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اچھا۔۔۔ راج محمد اسلام آباد میں ہے؟۔۔۔ اپنی بہن رانو کو بلا رہا ہے؟"

رانو یہ سنتے ہی چونک گئی۔ خوش ہو کر فون کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہاں۔ رزاق؟ تم فکر نہ کرو۔ راج سے کہو، میں ابھی اس کی بہن کو بھیج رہا ہوں۔ رانو بس ایک آدھ گھنٹے میں اپنے بھائی کے پاس پہنچ جائے گی۔"

اس نے نوشاد بیگم کو فون دیتے ہوئے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔ راج محمد بھی آپ پر بھروسا کرتا ہے۔ آپ اس معصوم بچی کو اس کے بھائی کے پاس پہنچا کر بہت ثواب کمائیں گی۔"

پھر اس نے رانو سے کہا۔ "بیٹی! فوراً اٹھو اور ان کے ساتھ جاؤ۔ تمہارا بھائی کل ہی اسلام آباد چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے تمہارے لیے گھر لیا ہے۔ بس دیر نہ کرو۔ یہاں سے جاؤ۔"

وہ چار برس کی بچی ذرا قد آور تھی۔ پھر بھی نوشاد بیگم نے اٹھا کر گلے لگا کر ممتا کا اظہار کیا۔ پھر اسی طرح گود میں اٹھاتے ہوئے گاڑی کے پاس آ کر اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ وہ دونوں خواتین بھی بیٹھ گئیں۔ جب وہ گاڑی اسٹارٹ ہو کر دور جاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ماموں نے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گرمی محسوس کی۔ وہاں ہزار ہزار کے دس نوٹ چھپے ہوئے تھے۔

ایسے متاثرہ علاقوں میں پریس رپورٹرز اور امدادی ٹیموں سے پہلے جرائم پیشہ افراد پہنچ گئے تھے۔ بڑے شہروں کے بازار حسن سے آنے والی عورتیں ننھی ننھی خوبصورت بچیوں کو بہلا پُھسلا کر یا انہیں خرید کر لے جا رہی تھیں۔ اغوا کی واردات کرنے والے حسین اور نوجوان لڑکیوں کو بڑی رازداری سے اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ تھانے اور پولیس چوکیاں زلزلے میں نابود ہو گئی تھیں۔ بے شمار سپاہی مارے گئے تھے۔ قانون کا کوئی محافظ نہیں رہا تھا۔ اس لیے کھل کر وارداتیں ہو رہی تھیں۔

وہاں کے شہریوں نے اغوا کرنے والے گروہ کو پکڑا۔ تب پتا چلا کہ اتنی بڑی تباہی اور بربادی کے باوجود شیطانی فطرت رکھنے والے اپنی شیطانیت سے باز نہیں آ رہے ہیں۔ رضا کارانہ طور پر خدمت کرنے والے جوان اور بوڑھے محتاط ہو گئے تھے۔ اب امدادی ٹیموں کا بھی محاسبہ کرنے لگے تھے کہ اُن میں کون صحیح ہے اور کون غلط۔۔۔؟ ایسے ہی وقت میڈیکل سے تعلق رکھنے والے چند طلبہ اور ڈاکٹروں نے ایسی ادویات کی نشاندہی کی جو قابل استعمال نہیں تھیں۔ اُن کے استعمال کرنے کو وقت کئی ماہ اور کئی برس پہلے گزر چکا تھا۔ ایکسپائر ادویات زہریلی ہو جاتی ہے۔ گویا امداد کے نام پر اُن متاثرین کو زہر پہنچایا جا رہا تھا۔

قدرتی حالات نے اُن بے چاروں کو مارنے میں اور تباہ و برباد کرنے میں جو کسر چھوڑی تھی اُسے منافع خور بندے پورا کر

رہے تھے۔ کسی بھی ملک میں جب تباہی و بربادی آتی ہے تو سب سے پہلے منافع خوروں کی عید ہو جاتی ہے۔ وہ چیزوں کے دام بڑھا دیتے ہیں۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ ملاوٹ کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی ایسی چیزیں فروخت کرتے ہیں، جو ضرر رساں ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کو قانون کی گرفت سے بچنے کا کمال آتا ہے اور وہاں تو نہ قانون تھا، نہ قانون کے محافظ تھے۔

جیل کی گرتی ہوئی دیواروں سے کئی مجرم زندہ نکل آئے تھے۔ اُن میں سے بھی تھے جو سزائے موت پانے والے تھے۔ کوئی عمارت گرنے سے نہیں بچی تھی۔ خصوصاً سرکاری عمارتیں مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھیں۔ وکیل حضرات کے دفاتر میں اور عدالتوں میں محفوظ رہنے والی دستاویزات ضائع ہو چکی تھیں۔ سزائے موت پانے والوں کے خلاف کوئی ثبوت باقی نہیں رہا تھا اور جو گواہ تھے وہ بھی کہیں ملبوں میں زندہ در گور ہو چکے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ زلزلے نے پُر امن شہریوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ شریف زادیوں کے سر سے آنچل نوچ لیے تھے۔ اس کے عکس قاتلوں اور مجرموں کو نئی زندگی مل رہی تھی۔

وہ دوسرا دن بھی ڈھل گیا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو ماں بیٹی نے صرف دو گھونٹ پانی پی کر روزہ کھولا۔ پچھلی رات کے بعد اب تک شیرو کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اُن کے حلق سے روٹی کا ایک لقمہ تو کیا پانی بھی نہیں اتر رہا تھا۔

ماں جی اس کے ہاتھ کو اپنے چہرے سے اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "بول میرے بچے۔۔۔! بول۔۔۔ نہیں تو یہ ماں مر جائے گی۔ اس ہاتھ سے ماں کو چھونے والے میر لعل۔۔۔! مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔ کچھ تو بول بیٹے! کچھ تو بول۔۔۔۔"

وہ چھتیں گھٹنوں سے ملبے کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سُندس کی آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی تھیں۔ اب سینے سے صرف آہیں نکل رہی تھیں۔ وہ رو رو کر ایسے کر رہی تھی، جیسے بھائی کے ساتھ ملبے تلے دبی پڑی ہو اور اُس کی ایک ایک تکلیف اپنے اوپر جھیل رہی ہو۔ دور و نزدیک کتنے ہی والدین کے رونے اور ماتم کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ انہیں اپنے بچوں کے بے جان ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ ایسے ہی وقت سُندس نے بھائی کی نبض ٹٹولی تو ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ "شیرو۔۔۔! ماں جی۔۔۔! اس کی نبض نہیں مل رہی ہے۔۔۔ میرا بھائی میرا شیرو اب کبھی نہیں بولے گا۔ کبھی نہیں بولے گا۔"

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ماں پر پہلے تو سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر وہ ہنستے ہنستے بالوں کو نوچنے اور لباس کو پھاڑنے لگی۔ راج محمد دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُن

سے کیا کہے؟ کس طرح صبر کی تلقین کرے؟ ایسے وقت تو کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ صدمہ اتنا شدید تھا کہ ماں رونے کی بجائے ہنس رہی تھی اور اپنا سر دیوار کے ایک ٹکڑے پر مار رہی تھی۔

راج محمد نے اسے پکڑ کر دیوار سے دور کرتے ہوئے کہا۔ "ماں جی! ہوش میں آئیں۔۔۔۔ صبر کریں۔"

ماں پر ایک ہاتھ کی گرفت کمزور تھی۔ اس بوڑھی خاتون نے ایک جھٹکا دیا تو وہ ذرا دور چلا گیا۔ وہ چیخیں مارتے ہوئے بولی۔ "میرا بچہ کیسی موت مرا ہے۔۔۔؟ یا خدا! کیا تُو دیکھ رہا ہے کہ اس معصوم نے کیسے جان دی ہے۔۔۔؟"

وہ چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "اے دنیا والو۔۔۔! یہاں آؤ اور دیکھو۔۔۔ میرا بچہ جس طرح دنیا سے گیا ہے۔ کیا ایسے کوئی جاتا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک بھاری پتھر کو اٹھا لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ سُندس اور راج محمد اس پتھر کو چھین لیتے۔ اُس نے اپنے سر پر اُسے دے مارا۔ سر چکرایا تو پتھر ہاتھوں سے چھوٹ کر ٹانگوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر آ گرا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ بھی نہ نکل سکی۔ دیدے پھیل گئے۔ منہ کھل گیا۔ پھر وہ پیچھے کی طرف الٹ کر چاروں شانے چت ہو گئی۔ ایک دم سے ساکت ہو گئی۔ قسم کھائی کہ بیٹے کے ساتھ قیامت تک ابدی نیند سوتی رہے گی۔

سُندس چیخیں مارتی ہوئی آ کر ماں سے لپٹ گئی۔ مصیبتیں آتی ہیں۔ موت بھی آتی ہے۔ لیکن ایسے ظالمانہ انداز میں آ کر نہیں جھنجوڑتی جیسا کہ وہاں کے ایک ایک فرد کو ابھی تک زلزلے کی طرح جھنجوڑ رہی تھی۔

دہائی دی جاتی ہے، فریاد کی جاتی ہے خدا سے۔۔۔ جب خدا کا ہی قہر نازل ہو رہا ہو تو پھر کس کے آگے دہائی دی جائے۔۔۔؟ ویسے دہائی دینی چاہیے۔ خدا دیر سے سنتا ہے مگر سنتا ضرور ہے۔ اسی لیے راولپنڈی سے نثار ترابی دہائی دیتے ہیں۔

زمیں پر درد کے خمے دہائی دیتے ہیں
یہ کس عذاب کے نقشے دہائی دیتے ہیں
وہ بے بسی ہے کہ منظر تمام مقتل ہیں
وہ بے گھری ہے کہ رستے دہائی دیتے ہیں
جو بن سنور کے اجالے تلاش کرتے تھے
زمیں کی تہ میں وہ بچے دہائی دیتے ہیں
فغاں بہ لب ہیں قلم کی رکی ہوئی موجیں
کھلے ہوئے سب ہی بستے دہائی دیتے ہیں
نڈھال سے کوئی بہنا کہ اس کی آنکھوں میں
جوان بھائی کے سپنے دہائی دیتے ہیں
دعا کو ہاتھ اٹھائے دلوں پہ زخم لیے
مُلول ماؤں کے چہرے دہائی دیتے ہیں

میں سوگوارِ سخن ہوں، نثار دل زدگاں

کہ باغ وویر کے چشمے دہائی دیتے ہیں

***

بیرونی ممالک سے کئی ماہرین جدید مشینوں کے ساتھ آ گئے تھے۔ بڑی مہارت سے ملبے میں گھس کر مردہ اور نیم مردہ افراد کو باہر نکال رہے تھے۔ اُس وقت تک سندس اور راج محمد اپنے تمام رشتوں کی بازیاں ہار چکے تھے۔ ایک ایک کر کے سب ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ پورے چار دنوں کے بعد شیرو کی لاش نکالی گئی تھی۔ اُس کی بھی تدفین ہو گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اُن دنوں کے گھر اور گھر کے تمام افراد نابود ہو گئے تھے۔ دو پیار کرنے والوں کو منزل ملتی ہے۔ وہ ایک ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں جو منزل مل رہی تھی وہ کتنے ہی کانٹوں پر چلنے اور پیروں کی چھلنی کرنے کے بعد مل رہی تھی۔ آگے بھی جو راستہ تھا وہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جائیں گے؟ باقی زندگی کس طرح گزاریں گے؟

اس وقت وہ ایک کیمپ میں تھے۔ ایک بڑے سے شامیانے نے نیچے چاروں طرف قناتوں کی چار دیواری بنادی گئی تھی۔ وہاں کتنے ہی خانماں برباد پناہ لے رہے تھے۔ ہر خاندان کے مرد حضرات نے اپنی بیویوں اور بچوں کے لیے تھوڑی تھوڑی سی جگہ گھیر ائی تھی۔ بستر بچھا لیے تھے اور ان کے چاروں طرف چادریں تان لی تھیں۔

سُندس اور راج محمد نے بھی یہی کیا تھا۔ اپنے لیے تھوڑی سی جگہ گھیر کر چادروں کی چار دیواری بنائی تھی۔ اگرچہ اُن کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا مگر بدترین حالات نے انہیں یکجا کر دیا تھا۔ وہاں کوئی اُن کا سرپرست اور دوسرے رستے دار نہیں تھے۔ صرف ایک اعتماد کا رشتہ تھا۔ سُندس کا دل کہتا تھا کہ وہ راج محمد کے ساتھ محفوظ رہے گی اور راج محمد نے تو پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی۔

پہلے ہی دن آس پاس کے لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔ "کیا تم دونوں میاں بیوی ہو؟"

راج محمد نے انکار میں سر ہلا کر جھوٹ کہا۔ "نہیں۔۔۔ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "تم دونوں ایک بھرے پُرے خاندان میں ہوتے تو ایک چھت کے نیچے ساتھ رہ سکتے تھے لیکن ایسی حالت میں تم چچازاد بہن بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہو۔"

سُندس نے پریشان ہو کر راج محمد کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "ہم بہن بھائی تھے۔۔۔ اب نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ میری منگیتر ہے۔ ہماری شادی ہونے والی تھی۔ لیکن اس سے پہلے ہی یہ بربادی ہو گئی ہے۔"

سُندس کو یہ سُن کر اچھا بھی لگا اور عجیب سا بھی۔۔۔ کہ وہ اس کی منگیتر ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت نہیں تھی لیکن حالات نے راج محمد کو جھوٹ بولنے پر اور سُندس کو جھوٹ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پھر بھی لوگ اعتراجض کر رہے تھے کہ نکاح کے بغیر دونوں کو ایک ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔ راج محمد نے کہا۔ "آپ حضرات ہمیں تھوڑی سی مہلت دیں۔ ذرا سنبھلنے کا موقع دیں۔ ہم جلد ہی نکاح پڑھوالیں گے۔ اس سے پہلے میری ایک چار برس کی بہن ہے۔ میں اُسے لے آتا ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ رہا کرے گی۔"

وہاں سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا راج محمد اپنی بہن کو لے آئے لیکن سُندس سے صرف دن کے وقت ملاقات کرے۔

ضروری باتیں کرے۔ پھر اس سے دور ہو جایا کرے۔ رات کو سُندس اور اُس کی چھوٹی بہن کے پاس کوئی بوڑھی خاتون آ کر سو جایا کرے گی۔

راج محمد رانو کو لینے کے لیے ماموں کے پاس آیا تو سب سے پہلے یہ افسوناک خبر سنائی کہ اس کا بھانجا رزاق اسکول کے ملبے میں دب کر اللہ کو

پیارا ہو گیا۔

ماموں نے کہا۔ "میں بھی تمہیں یہ افسوس ناک خبر سناتا ہوں کہ تمہاری بہن رانو یہاں سے کہیں چلی گئی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اُسے امانت کے طور پر آپ کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ یہاں سے کہاں جائے گی؟ آپ نے اسے جانے کیوں دیا؟"

وہ بولا۔ "دیکھو میاں! آنکھیں نہ دکھاؤ۔ میں تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ ایک تو ایسی ضدی لڑکی میرے متھے مار دی کہ ایک ہی رات میں اُس نے ہماری زندگی حرام کر دی۔ بار بار ضد کرتی تھی کہ بھائی جان کے پاس جائے گی۔ ہم نے اُسے اُس کمرے میں بند کر دیا تھا۔ آؤ۔۔۔ وہاں آ کر دیکھو۔۔۔"

وہ گھر زلزلے سے بری طرح شکستہ ہو گیا تھا۔ ماموں اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں آیا پھر بولا۔ "میں نے اُسے یہاں بند کیا تھا۔ باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ وہ یہاں سے بھاگ نہیں سکتی تھی۔ لیکن یہ بھول گیا کہ کھڑکی کے راستے فرار ہو سکتی ہے۔ یہاں۔۔۔ اس کھڑکی کو دیکھو۔۔۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ پھر بولا۔ "یہاں لوہے کی چار سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن زلزلے کی وجہ سے ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ ہم اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ ان سلاخوں کو ہلا ہلا کر انہیں نکال کر خود کہیں نکل جائے گی۔"

راج محمد نے جھجلا کر پوچھا۔ "وہ کہاں جا سکتی ہے؟ آپ نے مجھے خبر کیوں نہیں دی کہ وہ کہیں چلی گئی ہے؟"

"یہاں میری مصیبتیں میرے مسائل کیا کم ہیں کہ میں تمہیں ڈھونڈ پھرتا؟ میں نے سوچا جب آؤ گے تو بتا دوں گا۔ اب خود ہی جا کر اُسے ڈھونڈو۔ کسی نہ کسی کیمپ میں پڑی ہو گی۔"

وہ غصے سے بولا۔ "میں جا رہا ہوں۔ اُسے ڈھونڈوں گا۔ خدا نخواستہ وہ نہ ملی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"ارے واہ۔۔۔ یہ اچھی بدمعاشی ہے؟ ایک پاگل سی لڑکی کو میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔ اب وہ بھاگ گئی ہے تو مجھے الزام دے رہے ہو۔ مارنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ اس ایک ہاتھ سے کیا مارو گے؟ پہلے دوسرا ہاتھ سیدھا کر لو۔ پھر مجھے دھمکی دیتے رہنا۔"

راج محمد نے بڑے صدمے سے اپنے معذور ہاتھ کو دیکھا۔ پھر وہاں سے جانے لگا۔ ماموں نے چیخ کر کہا۔ "اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر مجھے تھانے پولیس کے چکر میں ڈالو گے تو میں صرف انکار کر دوں گا کہ تمہاری کوئی بہن میرے گھر میں آئی تھی۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ جو گواہ تھا وہ مر چکا ہے۔

وہ راج محمد کے پیچھے بڑبڑاتا ہو دروازے تک آیا۔ "اب ادھر کا راستہ بھول جاؤ۔ دوسری بار آؤ گے تو میں تمہیں پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔ تمہاری کوئی امانت میرے پاس نہیں تھی۔ جاؤ۔۔۔ جو کرنا ہے کر لو۔"

پہلے ہی پریشانیاں کچھ کم نہیں تھی۔ اب بہن کی گمشدگی نے ایک اور پریشانی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اُسے پوری وادی میں ڈھونڈنے لگا۔ جہاں جہاں متاثرین کے لیے عارضی پناہ گاہیں بنائی گئی تھیں، وہاں جا کر ایک ایک بچی کو دیکھتا رہا لیکن اُن میں رانو کہیں نظر نہیں آئی۔"

وہ سر جھکائے ہوئے سُندس کے پاس آیا۔ اُس نے پوچھا۔ "رانو کہاں ہے؟"

راج محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کوئی بُری خبر ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کہا۔ "پتا نہیں وہ کہاں گم ہو گئی ہے؟"

"وہ کیسے گم ہو سکتی ہے؟ تم نے تو اسے رزاق کے ماموں کے پاس چھوڑا تھا۔"

"وہ کم بخت کہہ رہا ہے، رانو میرے پاس آنے کے لیے ضد کر رہی تھی۔ رات کو چپ چاپ مجھے ڈھونڈنے کے لیے اُس گھر سے نکل گئی۔"

وہ ایک ہاتھ سے سر تھام کر بولا۔ "یا خدا۔۔۔! وہ ننھی سی بچی کہاں گئی ہو گی؟ تین دن گزر چکے ہیں۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی؟ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟"

"کیا تم نے اسے کہیں تلاش کیا ہے؟"

"میں صبح یہاں سے گیا تھا اور اب شام ہو رہی ہے۔ سارا دن

اسے ڈھونڈ تا رہا ہوں۔"

شامیانے میں جو پنچایت قائم ہوئی تھی۔ اُن پنچوں کو بتایا گیا کہ اس کی بہن لاپتا ہو گئی ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ ایک بوڑھے نے گھور کر پوچھا۔ "بہن کہیں گم ہو گئی ہے یا وہ تھی ہی نہیں؟ کیا تم ہم سے جھوٹ بول رہے ہو؟ دھوکا دے رہے ہو؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ میں نے اسے ایک دوست کے ماموں کے گھر میں چھوڑا تھا۔ وہ امانت رکھنے والا ماموں کہہ رہا ہے بہن رات کے وقت گھر سے نکل کر کہیں چلی گئی ہے۔"

کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پنچ کے دو بوڑھوں اور وہاں کے چار چھ جوانوں کو لے کر ماموں کے گھر آیا تا کہ اُس کی گواہی پیش کر سکے۔ لیکن اس شکستہ مکان کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ موموں اپنی گھر والی کے ساتھ کہیں جا چکا تھا۔ ایک نوجوان نے کہا۔ "یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے۔ تم ہمیں دھوکا دے رہے ہو۔"

راج محمد نے جھنجلا کر کہا۔ "بکواس نہ کرو۔ میں کسی کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ آج صبح ماموں یہیں تھا۔ لگتا ہے الزام سے بچنے کے لیے کہیں بھاگ گیا ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "تم جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہو۔ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں بھلا کون رہ سکتا ہے۔"

کوئی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اُس نے بہن کو وہاں امانت کے طور پر رکھا تھا اور وہ اُس گھر سے نکل کر کہیں چلی گئی تھی۔ اُسے پھر پنچایت میں بلایا گیا اور کہا گیا۔ "تمہاری بہن کا کوئی وجود ہو یا نہ ہو۔ ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ اگر تم مسمات سُندس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہو تو آج ہی نکاح پڑھاؤ۔ ورنہ اُس سے دور ہو جاؤ۔ کسی دوسرے کیمپ میں جا کر رہو۔"

راج محمد نے کہا" کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اُس بے یار و مددگار لڑکی کو تنہا چھوڑ دوں؟"

ایک شخص نے کہا۔ "وہ تنہا نہیں رہے گی۔ یہاں ہمارے بیوی بچوں کے درمیان رہا کرے گی۔ ہم اس کے لیے لنگر سے کھانا اور کیمپوں سے اس کی ضرورت کی چیزیں لے آیا کریں گے۔"

ایک اور بزرگ نے کہا۔ "اگر تمہیں اُس کی اتنی فکر ہے تو فوراً ہی نکاح کیوں نہیں پڑھا لیتے؟"

"آپ ہمارے حالات کو سمجھیں۔ میری والدہ، بہنیں اور کتنے ہی رشتہ دار ایک دن میں وفات پا چکے ہیں۔ آپ حضرات سُندس کی والدہ اور بھائی کی موت دیکھتے تو تڑپ جاتے۔ پھر یہ سمجھ پاتے کہ ان حالات میں کوئی شادی خانہ آبادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "شادی کا مطلب ہے خوشی۔۔۔ ہم یہ

نہیں کہتے کہ تم خوشیاں مناؤ۔ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ نکاح کے دو بول پڑھا کر ازدواجی رشتہ قائم کرو۔ تاکہ دینی احکامات کے مطابق اس کے ساتھ رہ سکو۔"

وہ بولا۔ "آپ حضرات تنہائی میں مجھے سُندس باتیں کرنے کی اجازت دیں۔ ہم کسی نتیجے پر پہنچ کر آپ کو اپنا فیصلہ سنائیں گے۔"

اُسے سندس سے تنہائی میں بات کرنے کی اجازت مل گئی۔ وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں اندر سے بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔ لہو کے ایسے رشتے بچھڑ گئے ہیں کہ کوئی نیا رشتہ جوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ نکاح کا مطلب یہی ہے کہ ایک نئی خوشی کی طرف آؤں۔ جبکہ میں کوئی خوشی نہیں منانا چاہتی۔"

"بے شک۔۔۔ کسی بھی طرح کی خوشی نہ مناؤ۔ لیکن دنیا والوں کی زبانیں بند رکھنے کے لیے صرف نکاح پڑھالو۔ اُس کے بعد ہمارا کوئی ازدواجی رشتہ نہیں ہو گا۔ ہم دور ہی دور رہ کر ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔"

سُندس نے اس کے معذور ہاتھ کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "میری بات کا بُرا نہ منانا۔ تمہاری جوتوں کی دکان مٹی میں مل چکی ہے۔ کاروبار تباہ ہو چکا ہے۔ تم ایک ہاتھ سے محنت مزدوری نہیں کر سکو گے۔ ہم کب تک یہاں بیٹھ کر لنگر کا کھانا کھاتے رہیں گے؟ دوسروں کو اُترن پہنتے رہیں گے؟ کیا کوئی نہیں ساری زندگی کھلاتا رہے گا؟ یہاں سے اسلام آباد، لاہور یا کراچی جا کر کیسے محنت کرو گے؟ دو ہاتھوں والے کو نوکری نہیں ملتی۔ تمہیں کیسے ملے گی؟"

اُس کی ایک ایک بات راج محمد کے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہی تھی۔ یہ حقیقت سمجھ میں آرہی تھی کہ سُندس تو کیا کوئی لڑکی کسی معذور سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ وہ دل برداشتہ ہو کر بولا۔ "میں چاہتا ہوں تم پر جو مصیبتیں آچکی ہیں، ان کے بعد پھر کوئی مصیبت نہ آئے۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بھول گیا تھا کہ معذور ہوں۔ تمہاری زندگی میں آؤں گا اور مصیبت بنتا رہوں گا۔"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ ایک ہاتھ والے بھی کامیاب زندگی گزارتے ہیں۔ مجھے یہ فخر ہے کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ میرے لیے جان کی بازی بھی لگا سکتے ہو۔ تمہارے جیسا جیون ساتھی کسی قسمت والی کو ہی مل سکتا ہے اور میں تمہارے ساتھ ہی قسمت سنوارنا چاہتی ہوں۔ لیکن ابھی نہیں۔۔۔"

راج محمد نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ کبھی دل توڑ رہی تھی کبھی اُسے اپنے دل میں بٹھا رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ "ابھی انتظار کرنا چاہتی ہوں کہ حالات سازگار ہو جائیں۔ یہ شہر یہ وادیاں پھر سے آباد ہونے لگیں۔ تمہارا کاروبار پھر شروع ہو جائے۔ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہوئی ہے؟

اہم اچھے دنوں کا انتظار کر سکتے ہیں۔"
وہ بولا۔"یہاں جو پنچایت قائم ہوئی ہے۔اس کے پنچ انتظار نہیں کرنا چاہتے۔ہم سے ابھی کوئی آخری فیصلہ سننا چاہتے ہیں۔"
وہ بولی۔"ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے۔ان کی نظروں میں نہیں رہیں گے۔پھر یہ ہم سے کسی طرح کا مطالبہ نہیں کریں گے۔"
"یہ ہمیں ایک ساتھ کہیں جانے نہیں دیں گے۔میں یہاں سے جاؤں گا تو وہ سب تمہاری کڑی نگرانی کریں گے۔ہمیں ملنے نہیں دیں گے۔جب ملنا چاہیں گے تو گناہ گار اور سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔"
"تو پھر یہی ایک راستہ ہے۔تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔میری فکر نہ کرو میں یہاں عورتوں کے ساتھ رہ لوں گی۔"
"چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں جیوں گا۔تم سے دور جا کر تمہاری ہی طرف دھیان لگا رہے گا۔میں کوئی کام نہیں کر سکوں گا۔ساتھ رہو گی تو بڑے جذبوں سے تمہارے لیے بہت کچھ کر سکوں گا۔"
وہ بولی۔"تمہارے ان محبت بھرے جذبات کو سن کر دوسری لڑکیاں خوش ہو سکتی ہیں۔لیکن میں نہیں ہو سکتی۔یہ سچ تمہیں برا لگے گا کہ تم مجھ سے محبت نہیں دشمنی کر رہے ہو۔جسے چاہتے ہو اُس کی بربادی اور بدنامی کا احساس نہیں ہے۔"
راج محمد نے چونک کر اسے دیکھا۔وہ ماضی میں جھانکتے ہوئے بولی۔"پہلے تم اسکول کے سامنے بیٹھ کر مجھے دیکھتے رہتے تھے۔یہ نہیں سوچتے تھے کہ لوگ دیکھیں گے تو میں بدنام ہو جاؤں گی۔اُس کے بعد تم نے ایک گلی میں راستہ روکنا شروع کر دیا۔یہ سمجھ رہے تھے کہ مجھ سے والہانہ محبت کرتے ہو۔یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ میں ایک شریف زادی ہوں۔اُس گلی میں بدنام ہو جاؤں گی تو کہیں سے میرا رشتہ نہیں آئے گا۔میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"
وہ جو کہہ رہی تھی درست کہہ رہی تھی۔وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔وہ اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولی۔"پھر تم نے اپنے ہاتھ پر میرا نام لکھا۔اس طرح لکھا کہ وہ مٹایانہ جا سکے اور دنیا دیکھتی رہے۔عشق کے جنون میں تم نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ میں تم سے کس قدر سہمی ہوئی ہوں؟تمہاری محبت متاثر کرتی تھی لیکن محبت زیادہ خوف طاری رہتا تھا اور اب بھی ہے۔"
اُس کی آنکھوں میں آنسو ہو گئے۔وہ آنکھوں پر آنچل رکھتے ہوئے بولی۔"میں یہاں اتنے لوگوں کے درمیان بدنام ہو رہی ہوں۔فی الوقت نکاح پڑھوانے سے انکار کر رہی ہوں۔میری عقل کہتی ہے مستقبل کی اچھی طرح منصوبہ بندی کیے

بغیر شادی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی لیے میں انکار کر رہی ہوں۔ تم مجھے یہاں چھوڑ کر جاؤ گے تب بھی عورتیں طرح طرح سے بدنام کریں گی اور ہم ساتھ بھی کہیں نہیں جاسکتے۔ کیونکہ ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں۔"

اس کا آنچل بہ دستور آنکھوں پر تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ "خدا کے لیے سوچو کہ میں کن مصیبتوں میں مبتلا ہو گئی ہوں؟ نہ اِدھر کی رہی ہوں نہ اُدھر کی۔۔۔ پیار چاہتی ہوں۔ مگر لیلیٰ اور ہیر کی طرح بدنام ہو کر نام کمانا نہیں چاہتی۔ اگر محبت کہتی ہے کہ سوہنی کی طرح کچا گھڑا اٹھا کر دریا پار کروں تو یہ آج کے دور میں سراسر نادانی ہے۔ میں وقت اور حالات کے مطابق تمہاری محبت قبول کروں گی۔ جاؤ۔۔۔ پنچایت والوں سے کہہ دو میں یہیں حالات کے رحم و کرم پر رہوں گی۔ میں۔۔۔ "

اس نے آنکھوں پر سے آنچل ہٹا کر مزید کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ نہ جانے کب کا جا چکا تھا؟ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پتا نہیں اُس نے کیا سنا کیا نہیں سنا۔۔۔ اور کب چلا گیا؟

وہ انتظار کرنے لگی۔ شاید وہ پنچوں کو اپنا فیصلہ سنانے گیا ہے اور فیصلہ تو یہی ہو گا کہ انہیں ایک دوسرے سے دور ہو جانا ہے۔ راج محمد اس کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ لیکن اُن لمحات میں پہلی بار ایسا لگ رہا تھا جیسے اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔۔۔ ہائے! کیسے رہے گی۔۔۔؟ کیسے زندگی گزارے گی۔۔۔؟

تھوڑی دیر بعد چادر کی چار دیواری کے باہر پنچوں نے آکر آواز دی۔ "کیا ہوا راج محمد۔۔۔! کیا ہم تمہارا فیصلہ سننے کے انتظار میں بیٹھے رہیں؟"

سُندس ان کی بات سن کر چونک گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔ آپ کے پاس گئے ہیں۔"

"وہ ہمارے پاس تو نہیں آیا۔۔۔ ہمیں بٹھا کر کہاں بھاگا پھر رہا ہے؟"

دوسرے بوڑھے نے کہا۔ "وہ جھوٹا اور فریبی ہے۔ ہمیں یہاں سے کسی ماموں کے گھر تک لے گیا تھا۔ وہاں اس کا جھوٹ کھل گیا تھا۔ یہاں بھی کوئی ایسی بات ہوئی ہے کہ وہ منہ چھپا کر بھاگ گیا ہے۔"

سُندس آنچل سے چہرے کو ڈھانپتی ہوئی باہر آکر بولی۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ آپ ہمارے صدمات کو سمجھیں۔ ان حالات میں آپ کا فیصلہ ہمیں الجھن میں ڈال رہا ہے۔ ہمیں کچھ وقت دیں۔ میں اُن کی چچازاد ہوں۔ ہم کسی فیصلے پر پہنچنے تک یہاں ساتھ تو رہ سکتے ہیں۔ "

"ہرگز نہیں۔۔۔ جب تک اُس سے تمہارا نکاح نہیں ہو گا وہ یہاں تمہارے قریب بھی نہیں آئے گا۔"

ایک اور بوڑھے نے کہا۔ "اگر وہ چھپ کر آئے گا تو ہم بے حیائی برداشت نہیں کریں گے۔ تم دونوں کو عبرتناک سزا ملے

گی۔ "

وہ سب اُسے دھمکیاں دے کر چلے گئے۔ سُندس جانے والے کا انتظار کرتی رہی۔ رات گزرنے لگی تو وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ پریشان ہو کر سوچتی رہی۔ "اسے میری کوئی بات بُری لگی ہے۔ وہ دیوانہ ہے جنونی ہے۔ میرے عشق میں ایک بار اپاہج ہوا ہے۔ دوسری بار نہ جانے کیا کر بیٹھے۔۔۔؟"

اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ دوسرے دن بھی وہ بھوکی پیاسی اس کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے اندر یہی سوالات گردش کر رہے تھے۔ "وہ کہاں گیا ہو گا؟ کیا کر رہا ہو گا؟ مجھے سوچنے کے سوا اُسے آتا ہی کیا ہے؟ اور جب بھی سوچتا ہو گا جنون میں مبتلا ہو جاتا ہو گا۔ "

میں نے تو اپنی اور اُس کی بہتری کے لیے سمجھایا تھا۔ اُسے خود بھی سمجھنا چاہیے کہ جنونی محبت نقصان پہنچاتی ہے۔ آج کے دور میں سوچ سمجھ کر محبت کرنی چاہیے۔ تب ہی ہم ایک تعمیری زندگی گزار سکتے ہیں۔ ورنہ تخریب مقدر بن جاتی ہے۔"

وہ تمام دن روزے سے رہی۔ بار بار چادر ہٹا کر باہر کی طرف دیکھتی رہی ایک تو پچھلی رات سے جاگ رہی تھی پھر سحری بھی نہیں کی تھی۔ افطار کے وقت چکرا کر گر پڑی۔ آس پاس کی خواتین نے اُسے سنبھالا۔ پانی اور کھجور سے افطار کرایا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی آنکھیں بند کر کے جیسے سو گئی۔ نیند بھی تھی اور اُس کی یادوں کی بیداریاں بھی تھیں۔ وہ آنکھ کھولنے کے بعد کہہ نہیں سکتی تھی کہ سو رہی تھی یا اُس جانے والے کے پیچھے بھاگتی رہی تھی؟

کئی گھنٹوں کے بعد ایک خاتون اُس کی تیمارداری کے لیے آئی تو پتا چلا وہ بخار میں پُھنک رہی ہے۔ اُس نے رضاکاروں کو اطلاع دی۔ وہ لوگ فوراً ہی ایک ڈاکٹر کو لے کر آئے۔ وہ آنکھیں بند کیے بڑبڑا رہی تھی۔ کبھی کبھی چیخ پڑتی تھی۔ ڈاکٹر نے اُس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹمپریچر ایک سو پانچ تک پہنچا ہوا ہے۔ اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی جائیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ بہتر ہے اسے کیمپ اسپتال پہنچایا جائے۔ وہاں اس کی برابر دیکھ بھال ہوتی رہے گی۔"

وہاں اپنوں کو سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ بھلا ایک جوان لاوارث لڑکی کی دیکھ بھال کون کرتا؟ اُسے کیمپ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں طبی امداد پہنچانے کے لیے جو ڈاکٹرز اور رضاکار تھے وہ خدمت خلق کے جذبوں سے سرشار ہو کر بڑی تندہی سے مسیحائی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ لیکن فرشتہ صفت انسانوں کے درمیان شیطان کی موجودگی لازمی ہوتی ہے۔

کیمپ اسپتال میں ڈاکٹر شاہنواز نے نبض دیکھنے کے لیے سُندس کی ریشمی کلائی کو ہاتھ میں لیا تو اندر سے بے ہاتھ ہونے لگا۔ وہ آنکھیں بند کیے چاروں شانے چت ایسے پڑی تھی

جیسے نگاہوں کے سامنے کتاب ہوشربا کا ورق ورق کھول دیا گیا ہو۔ رضاکاروں کی موجودگی میں مریضوں کو سنبھالنے والا ڈاکٹر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے دل لگا کر اُس کا معائنہ کیا۔ دوائیں دیں۔ بڑی دیر تک دوسرے مریضوں کو بھول کر سُندس کو ہی ٹریٹمنٹ دیتا رہا۔ پھر اُس نے رضاکاروں سے کہا۔ بخار کم ہو گیا ہے۔ اسے یہیں رکھا جائے گا۔ آپ سب رضاکار ہیں۔ کیا اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے؟"

ایک نے کہا" اس کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ آپ کہیں تو کسی خاتون کو اس کے پاس چھوڑ دیا جائے۔"

ڈاکٹر شاہنواز نے جلدی سے کہا۔" اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے ہمارے پاس اسٹاف کی کمی نہیں ہے۔ آپ لوگ جائیں۔ اسے آرام سے سونے دیں۔"

اس اسپتال کا ایک حصہ منہدم ہو گیا تھا۔ دوسرا حصہ قدرے شکستہ حالت میں تھا۔ وہاں تشویشناک حالت میں آنے والے زخمیوں اور بیماروں کے لیے دو چار کمرے مختص کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر شاہنواز نے سُندس کو ایسے ہی ایک خالی کمرے میں یہ کہہ کر پہنچا دیا کہ اُس کی حالت تشویشناک ہے۔

جبکہ ڈاکٹر کی حالت تشویشناک تھی۔ اُس نے کمرے میں آ کر پھر معائنہ کرنے کے بہانے اُسے ہاتھ لگایا۔ جہاں بھی ہاتھ لگایا، پھسلتا چلا گیا۔ ایسے وقت سُندس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک اجنبی کو اتنے قریب دیکھ کر چونک گئی۔ کمزور سی آواز میں چیختے ہوئے بولی۔" کون ہو تم۔۔۔؟"

پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔" میں کہاں ہوں؟" تھکپنے والا ہاتھ بدن کے اُسی حصے پر رہ گیا۔ وہ بڑی نقاہت سے اُس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے بولی۔" مجھ سے دور رہو۔ ابھی ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے کوئی جھنجوڑ رہا ہے۔"

" تمہیں تیز بخار ہے۔ تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ میں ابھی دوا دیتا ہوں۔ ایک ہی خوراک میں بخار بھی کم ہو جائے گا اور نیند بھی آ جائیگی۔"

وہ دوا لانے کے لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ قابو میں آنے والی نہیں ہے۔ اور شیطان تھا کہ بے قابو ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک ایسا انجکشن لا کر لگایا جس کے نتیجے میں وہ مزید کمزور ہو گئی۔ پریشان ہو کر ڈاکٹر سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وقت گویائی ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

وہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔" بول نہیں پاؤ گی۔ مجھ سے راضی رہو گی تو یہاں سے ہنستی بولتی جاؤ گی۔ ورنہ کہیں جانے اور بولنے کے قابل نہیں رہو گی۔"

وہ اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے بولا۔" میں مناسب وقت پر آؤں گا۔ ہو سکے تو آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ سُندس اُکی نظروں سے اس کی باتوں سے

اور حرکتوں سے اُس کی شیطانی ارادوں کو سمجھ گئی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی کسی کو مدد کے لیے پکارنا چاہتی تھی۔ اس کے منہ سے دھمی دھمی سی آوازیوں نکل رہی تھی۔ جیسے ہوا کے بھکپے نکل رہے ہوں۔ وہ بڑی نقاہت سے آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بیڈ سے اترنا چاہتی تھی مگر پھر چکرا کر تکیے پر گر پڑی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ ہماری دنیا میں ہوتا کیا ہے؟ خدا کا قہر نازل ہوتا ہے تب بھی انسان عبرت حاصل نہیں کرتا۔ کہا جارہا تھا کہ گناہوں کی سزا دینے کے لیے وہ زلزلہ آیا تھا۔ مگر وہاں تو زلزلے کے نتیجے میں معصوم بچے اور بے گناہ افراد تباہ و برباد ہو گئے تھے اور مارے گئے تھے۔ گناہ گار تو زندہ تھے۔ وہ شیطانی عمر پا رہے تھے۔

یہ خیال درست نہیں ہے کہ گناہ گاروں کو سزا دینے لیے قدرت کی طرف سے زلزلہ آیا تھا۔ ہزاروں لاکھوں سال پہلے جب انسان نہیں تھا۔ تب بھی زلزلے آیا کرتے تھے۔ بجلیاں گرتی رہتی تھیں۔ زمین شق ہوتی تھی اور سمندر اُبل پڑتے تھے اور اگر یہ درست ہے کہ زلزلے کی صورت میں قدرتی آفت نازل ہوئی ہے تو یہ مقام فکر ہے کہ قدرت ظالم ہے یا بندہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے؟

ایک قدرتی آفت بھی جو بندوں پر گزر گئی۔ لیکن بندوں نے بندوں کے ساتھ کیا کیا؟ جو ملبوں میں مر گئیں۔ سو مر گئیں۔ جو زندہ رہیں اُنہیں کوٹھوں پر بٹھانے کے لیے اغوا کیا گیا۔ جہاں آفات نہیں آئیں جہاں خوشحالی ہے۔ آیندہ وہاں اسی قوم کے لوگ اُن کا مجرا سنیں گے اور بچیوں کے جوان ہونے کا انتظار کریں گے۔

جو متاثرین بیماریوں سے لڑ رہے تھے۔ منافع خور بندوں نے اُن کے لیے زہریلی دوائیں سپلائی کیں۔

جن بندوں کو امدادی سامان پہنچایا جارہا تھا انہیں لوٹنے والے بھی بندے ہی تھے۔ امدادی سامان کے بھرے ہوئے ٹرک چور بازاروں میں فروخت ہوتے رہے۔ اگر حساب کیا جائے تو ظلم قدرت کی طرف سے نہیں ہوتا۔ بندوں کی طرف سے بندوں پر ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ انسان کے آخری لباس کفن کو اتنا مہنگا کیا گیا کہ بے شمار لاشے پھٹی پرانی چادروں میں لپٹ کر دفنائے گئے۔

یہ کیا کرتا ہے انسان۔۔۔؟ کیا خود پر ظلم نہیں کرتا۔۔۔؟ انی کنت من الظالمین۔۔۔بے شک قرآنی آیتوں کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔

دوسری صبح اسپتال کے بیڈ پر سُندس بے جان پڑی ہوئی تھی۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ کہیں لہو کے دھبے بھی نظر آرہے تھے۔ بڑی بڑی عمارتوں کے ملبے تلے ایسی موت نہیں آتی جیسی بے حیائی اور درندگی کے ملبے تلے آجاتی ہے۔

اُس کی کھلی ہوئی ساکت آنکھیں کہہ رہی تھیں۔"راج

محمد۔۔۔! آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تیرے انتظار میں۔۔۔

تُو کہاں ہے؟ مجھے تو بڑا آرام آ گیا ہے۔۔۔۔"

خوابوں کی بستی میں

سپنوں میں کھو کر

یہ کیا بے رخی ہے

خیالوں میں بھی تم میرے نہیں ہوتے

مجھے ایسے پیچھا چراتے ہو

جیسے ہم اجنبی ہیں

صدیوں کے بچھڑے بھی مل جاتے ہیں

ہم ساتھ رہتے ہوئے بھی

ایک کیوں نہیں ہوتے؟

ساتھ کیوں نہیں چلتے؟

سب کچھ تو ہو جاتا ہے اس دنیا میں

خواب ٹوٹ کر جڑ جاتے ہیں

لوگ بکھر کر سمٹ جاتے ہیں

(محمد شعیب)

افسانچہ

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ تم کو کن لفظوں میں یاد کروں اور تم کو کن الفاظ کا خطاب دوں کہ اچانک تم میرے سامنے آ گئ دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا بدن بے جان مورت کی طرح لگنے لگا میں جب بھی تم کو دیکھتا میری عجیب سی حالت ہونے لگتی امی بہن بھائ سب مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ اب اس کو اتنا یاد نہ کیا کرو اس کا خیال اپنے دل سے نکال دو کہ کسی کو یاد کرنا اتنا اچھا نہیں ہوتا مجھ پر میرے گھر والوں کی نصحیت کا کچھ اثر ہونے لگا اور میں آہستہ آہستہ اس کو بھولنے لگا میں جب بھی اپنے دو دوستوں سے اس کا ذکر کرتا تو میرے دوست تنگ آ جاتے اور کہتے یار تم کو اور کوئ بات نہیں آتی ہم جب بھی تمہارے پاس آتے ہیں تم اسی کا قصہ چھیڑ کر بیٹھ جاتے ہو جیسے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

اپنی تو نیند اڑ گئ تیرے فسانے میں

اپنے شاعر کے احترام میں میں بھی اپنا قصہ مختصر کرتا ہوں آہ میری پیاری گھڑی میں تم کو کتنا مس کرتا ہوں جو ایک دوست نے پچھلے سال سالگرہ پر مجھے گفٹ دی تھی نہ جانے تم کہاں کھو گئ ہو

عنبرین اختر

اک ورق زندگی کا

ماورا خان

بسین اپنے کمرے کی کھڑکی سے، طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں پھوٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی اب تو ہر رات ایسے ہی گزرتی تھی کہ فجر سے پہلے ہی آنکھ کھل جاتی تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے سری رات جاگتی رہی ہو۔ اپنے گھر کی، اپنے بہن بھائیوں کی باتیں، گویا فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی میں ایسا کیول ہو جاتا ہے جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

ماہین، بسین کی بڑی بہن تھیں جنہیں چھوٹے بہن بھائی "بی" کہہ کر بلاتے تھے، بڑے بھائی، چھوٹے بھیا، امی، ابا یہ تھا ہمارا مختصر سا گھرانہ اگر ہم سوچیں کہ کائنات میں سب سے پیارے اور اہم رشتے کون سے ہیں تو فوراً لبوں پر ماں باپ اور بہن بھائیوں کے نام سر سرانے لگتے ہیں کتنے خوبصورت رشتے ہوتے ہیں یہ بغیر کسی غرض بغیر کسی لالچ کے بس محبت کیے جاتے ہیں ایک دوسری سے لیکن جس گھر میں محبت ہی نہ ہو، ایک دوسرے کے احساسات کا پاس نہ ہو وہاں ان رشتوں کو کیا نام دیں۔۔۔

ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے امی ابا سے مخاطب ہوئیں۔

سنو! احتشام! کچھ اپنی بیٹوں کی طرف بھی توجہ کر لو، تمہیں ان کا بالکل خیال نہیں ہے، امی نے تو بڑے مان سے ابا سے شکوہ کیا تھا لیکن ابا؟؟؟ وہ تو جیسے کچھ سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ امی کی آہستگی سے کہی ہوئی بات پر بھی ایک دم بھڑک اٹھتے تھے، فوراً غصے سے بولے میں کیا خیال کروں، تم جانو تمہاری بیٹیاں پڑھا لکھا کے، تم نے انہیں دو کوڑی کا کر دیا ہے امی پھر بھی دسان سے بولے گئیں۔

"شاوہاں نہیں کرنیں کیا انکی، بڑی ہو گیں ہیں"

ابا کا غصہ برقرار تھا۔

"کہاں سے کرو گی شادی، ہے تمہارے پاس کچھ، باتوں سے نہیں ہوتیں شادہاں۔۔۔ باہر جاتے ہوئے ابا بولتے گئے۔۔

ابا جن کی زبان اور مزاج میں زمانے بھر کی کڑواہٹ بھری ہوتی تھی۔ بات کرو تو گویا دل میں یہ ضرور بول لو کہ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

اور۔۔۔ امی وہ ہمیشہ کی طرح ابا کی باتوں کے بعد کچن کے کام میں مصروف ہو جاتیں یہ تھی ہمارے گھر کی ہر صبح جو امی کی باتوں اور ابا کی چخ چخ سے شروع ہوتی تھی۔ ماہین جو امی ابا کے جھگڑے سن سن کر اور گھر کے خرچوں کا رہ‌ن سن سن کر بڑی ہوئیں تھیں۔ بہت حساس تھیں اکثر مجھے سمجھاتیں کہ بسین مجھ سے میں تمہیں دیکھ رہی ہوں، تمہارا دھیان پڑھنے میں بالکل نہیں ہے۔ تمہارے سیکنڈ ائیر کے ایگزامنر سر پر ہیں لیکن تمہیں دیکھ کر لگتا ہی نہیں،

میں جو طبیعتاً بڑی لاپراہ واقع ہوئی تھی۔ "بی" کی باتوں کو سن کر ہوا میں اڑا دیتی کہ چھوڑو بی، کیا کرنا ہے پڑھ لکھ کر، شادی ہو جائے گی تو پھر کس بات کی فکر ہو گی۔

اچھا! ماہین نے حیرت سے بسین کو دیکھ کر کہا، شادی نہ ہوئی اللہ دین کا چراغ ہو گیا کہ شادی کے بعد جو چاہو گی تمہارے سامنے آجائے گا (شادی نہ ہوئی اللہ دین کا چراغ ہو گیا کہ جو) کیا ہو گیا بی آپ کو اب ایسا بھی نہیں تم نہیں جانتی بسین، زندگی اتنی بھی آسان نہیں جتنی تم نے سمجھ لی ہے۔

میں پھر بھی بی کی باتیں نہ سمجھ پائی اور لگ جاتی بحث کرنے، کیوں؟ آپ کو نہیں کرنی کیا شادی۔

"نہیں "بی کا سخت سا جواب ہوتا کیوں؟ ساری زندگی اس گھر کے جھگڑے نمٹاتے ہوئے گزار دیں گی۔

ہاں!۔۔ ابھی مجھے بہت پڑھنا ہے پھر جاب کرنی ہے۔

پڑھ لیا آپ نے۔۔ اور جاب کرنے دی ابو نے آپ کو۔۔

فضول باتیں نہ کرو اور اب جاؤ یہاں سے۔۔ بسین شام کی جائے لیکر بر آمدے میں بیٹھے اا عمران بھائی ابا سے باتیں کر آتی ہے۔

عمران بھائی ابا سے باتیں کر ویسے تھے۔

"ابا میں لاہور جانا چاہتا ہوں وہاں میرے کافی دوست بھی ہیں جو اچھی جاب پر ہیں۔

میں۔۔۔ یہاں رہنا نہیں چاہتا ابا، یہاں کے حالات اسے۔۔ ہیں کہ یہاں رہ کر سبھی ترقی نہیں کر سکتا۔۔

"ہاں ہاں بیٹا (بڑے بھائی کی تو ہر بات ابا ایسے مانتے تھے کہ شاید ہی ان کی کسی بات کا کبھی انکار کیا ہو سو فوراً حامی بھر لی "کیوں نہیں" جاؤ خوب کماؤ کھاؤ خوش رہو۔ عمران بھائی خوشی خوشی بولے۔

"ہاں ابا میں وہاں جا کر سیٹ ہو جاؤں گا تو آپ سب لوگوں کو بھی وہیں بلا لوں گا۔

"ارے نہیں بیٹا۔ ہمیں کیا کرنا ہے کہیں جا کر، پرانی جگہ ار اپنا شہر چھوڑ کر دوسرے شہر جا کر رہنا بڑے بوڑھوں کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے، گزر گئی ہماری تو۔

اور بہن سوچ رہی تھی یہ ابا کتنی بڑی بے وقوفی کر رہے ہیں۔

بسین بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ جو ماہین اور بسین کا مشترکہ کمرہ تھا۔

حد ہو گئی، جیسے ہم تو کچھ ہیں ہی نہین ابا کے خوش رہنے کا حق

صرف بڑے بھائی کو یہی ہے۔
کتاب پڑھتے پڑھتے ماہین نے سر اٹھا کر حیرت سے بسین کو دیکھا۔
کیاہوا؟؟ کون تم سے خوشی رہنے کا حق چھین رہا ہے۔
"بسین بولے گئی "اب دیکھ لینا یہ جو ابا بڑے بھائی کو لاہور جانے کی اجازت دے رہے ہیں نا، یہ کوئی بڑا گل کھلائیں گے وہاں جا کر۔
ماہین فکر مندی سے بولی، ہاں۔۔ ان کی توجہ بڑی پرانی خواہش ہے، ہم کر بھی کیا لیں گے اگر وہ چلے گئے پہلے ہی کونسا سیدھے منہ بات کرتے ہیں۔
بسین کھڑے کھڑے بولے جا رہی تھی۔ ارے سارا بہن ابا کا ابا یہ کیوں نہیں سوچ رہے کہ میری بیٹیاں بھی ہیں ان کی شادیاں کرنی ہیں۔ دیکھ لینا جو یہ پلٹ کر ہمیں پوچھیں۔
"چھوڑو۔۔ جبھی میں تم سے کہتی ہوں اپنی پڑھائی پر دھیان دو، تا کہ کسی سہارے کی تمہیں ضرورت نہ رہے۔ بی نے کتاب میز پر رکھتے ہوئے کہا اتنے میں امی دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر لے کر ان کے کمرے میں آتی ہیں۔
امی کچھ سنا آپ نے، یہ عمران بھائی واقعی لاہور جا رہے ہیں۔
امی:۔ ہاں بیٹا سنا تو ہے، جو رہی سہی کمائی عمران کی آتی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اپنے ابا کو تو تم جانتی ہی ہو کیسے گن گن کر پیسے دیتے ہیں اور گھر بھی کرایہ کا ہے، وہ تو بھلا ہو مالک مکان کا، برسوں سے ایک ہی کرایہ چل رہا ہے۔
بسین یہ سب آپ کی ڈھیل ہے امی، آپ جو ابا کی ہر بات پر سر جھکا کر ہاں کہتی رہتی ہوں۔ شروع سے ابا کو صحیح رکھا ہو تا تو آج ابا ایسے نہیں ہوتے، امی نے خشمگین نگاہوں سے بسین کو دیکھا
"چپ جو آئندہ ایسے بولی ہو، باپ ہیں تمہارے پھر وقسمت کا جو لکھا ہو تا ہے وہ تو پورا ہو تا ہی ہے آخری جملہ امی نے اداسی سے بولا۔
بسین ابا بر آمدے میں پیچھے تخت پر ہم دراز اخبار پڑھ رہے تھے چھوٹے بھائی باہر سے آئے۔
ابا:۔ آؤ میاں آو کہاں سے آرہے ہو۔
رضوان ابا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سر جھکا کر بولے۔
ابا مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔
بسین چائے لاتے ہوئے بولی۔۔ دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جانا ہو گا اور کیا کرنا ہے انہیں
رضوان نے گھور کر بہن کو دیکھا
"تم تو چپ ہی رہا کرو میں ابا سے بات کر رہا ہوں۔"
(بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے رضوان نے بھی پر پر دے نکالنے شروع کر دیئے، امی کو پیسے دینے کے لیے ابا کے پاس سو سو بہانے ہوتے تھے۔ جبکہ امی گھر کے خرچ کے لیے ہی مانگتی تھیں گھر کی ایک ایک ضرورت کے لیے امی کو سینکڑوں باتیں سناتے تھے لیکن بیٹیوں کے لیے ابا کے پاس پیسوں کی کمی نہیں ہوتی تھی۔
یہ لو باقی پیسے واپس لے آنا ابا کرتے کی جیب سے پیسے نکالتے ہوئے بولے۔

امی کچن سے نکلتے ہوئے بولیں۔

" کبھی بیٹیوں کی ضرورتیں ہی پوچھ لیا کریں انہیں بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے۔

ابا نے آنکھوں پر چسمہ لگاتے ہوئے اسی کو ایسے دیکھا جیسے کوئی غلط بات کہہ رہی ہوں۔

آرام سے رہ رہی ہیں کھا پی رہی ہیں اور کیا چاہیے انہیں یہ کہتے ہوئے ابا تو باہر چلے گئے لیکن امی کے لیے لمحہ فکریہ چھوڑ گئے۔

ماہین کی اپنی کلاس فیلو رمشا سے بہت دوستی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صیحح ہو گا کہ رمشا، ماہین کی سادگی شرافت، ذہانت اور سیکھتے کی گرویدہ تھی ایک دن موقع دیکھ کر رمشا نے اپنی امی سے کہا۔

(رمشا ایک اپر کلاس سے تعلق رکھتی تھی خوبصورت گھر کا منظر)

امی نہین ماہین کی شادی اگر شجاع بھائی سے ہو جائے تو کیسا رہیگا۔

ہومنہ امی نے مسکراتے ہوئے کہا یہ تو شجاع سے پوچھو اس نے ماہین کو دیکھا ہوا ہے، ویسے دیکھنے میں تو سیدھے سادھے گھر کی لگتی ہے بذات خود تو اچھی بچی ہے۔

رمشا ہنستے ہوئے بولی امی شجاع بھائی کی آنکھوں میں پسندیدگی دیکھر کر ہی تو میں اتنی بڑی بات آپ سے کہہ رہی ہوں۔

اچھا۔۔۔؟ اور تم نے اپنی دوست کی مرضی بھی معلوم کی؟ امی نے سنجیدگی سے پوچھا

"ہومنہ فی الحال تو نہیں لیکن مجھے اندازہ ہے وہ انکار نہیں کرے گی" رمشا سوچنے والے انداز میں بولی۔

اگلے دن رمشا نے ماہین سے کہا

وہ۔۔۔ سنو! امی تمہارے گھر آنا چاہ رہی ہیں۔

"اچھا۔۔پہلے تو ماہین گھبرا گئی۔ پھر سنبھل کر بولی ویلکم۔۔۔ ضرور آئیں۔

پوچھ گی نہیں کیوں؟

کیوں؟ کوئی خاص بات ہے،

"جی۔۔ ہمارے اکلوتے بھائی شہنشاہ شجاع ولہ کو آپ پسند آ گئیں ہیں۔ لہذا ابا بدولت کو یہ ذمہ داری سوپنی گئی ہے کہ آپ کے گھر جا کر معاملہ آگے بڑھایا جائے۔

رمشا نہیں کر منہ اقیہ انداز میں تمام تفصیلات بتا رہی تھی اور ماہین۔۔ وہ تو حیرت کے سمندر میں محفوظ زن تھی اسے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ رمشا کیا کہہ رہی ہے۔ کہاں رمشا کی فیملی، کروڑ پتہ لوگ اور کہاں ماہین کا گھرانہ

ماہین ایک دم گھبرا کر بولی

"نہیں۔۔ یہ ممکن نہیں۔

کیوں؟؟؟؟ رمشا نے سوال کیا۔

تمہاری اور ہماری مالی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے یار ماہین دھیرے سے جواب دیا۔

بہن بھئی۔۔ ہم نہیں مانتے اس فرق کو سمجھیں؟

رمشا نے دوٹوک الفاظ میں اسکے خیلا کی تردید کر دی۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد رمشا اپنی امی او بھائی کے سات انکے گھر

آ گئے اور بس یہی غضب ہو گیا کہ لڑکا کیوں ساتھ آیا ہے۔

ابا تو بالکل ہتھے سے اکھڑ گئے۔

یہ باہر پڑھنے جاتی ہے یا دوستیاں کرنے، ہم لوگ اتنے ایڈوانس نہیں ہیں اور لڑکا ماں کے ساتھ خود گھر آ جائے اور پھر ہمارا اور ان کا کوئی میل بھی نہیں ہے۔ ایسے بے جوڑ رشتے زیادہ عرصے تک نہیں چلتے۔ ان کے جانے کے بعد ابا بولے جا رہے تھے۔ امی نے ابا کو ٹھنڈا کر کے سمجھانے والے انداز میں کہا

"ارے بھئی کو سنا غضب ہو گیا۔ اگر لڑکا بھی آ گیا ان کا تو ماحول ہی ایسا ہے ان کے لیئے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے احتشام، آپ تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو رہے ہیں اور پھر یہ رشتہ ماہین کی خوبیوں اور قابلیت کو دیکھ کر آیا ہے ورنہ انہیں کوئی شوق نہیں ہے آپ کے گھر سے رشتہ جوڑنے کا۔

آخری جملہ امی نے غصے سے کہا۔

ابا کو اور غصہ آ رہا بولے

"ہاں جی۔۔۔۔۔ اب تو بیٹی صاحبہ خود ہ اپنا رشتہ لے کر آ گئیں۔

اور ماہین کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسا اس نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہے یا وہ قصور وار ہے۔

ابا نے غصے سے چلا کر عمران بھائی کو آواز لگائی

عمران۔۔

جی ابا عمران بھائی کمرے میں آئے۔ ذرا پتہ تو کرو کیسے لوگ ہیں یہ، کچھ بھروسہ نہیں ہوتا ان بڑے لوگوں کا، نظر کچھ آتے ہیں اندر سے کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔

اور واقعی بڑے بھائی نے کوئی اور فرض نبھایا ہو یا نہ نبھایا ہو، یہ ذمہ داری پوری جانفشانی سے نبھائی اور ایسی نبھائی کہ اچھے خاصے شریف لوگوں کو بدمعاش قرار دے دیا اور ماہین تو اس معاملے میں کچھ بولی ہی نہیں، پہلے ہی ابا اسے شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے، یوں یہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔

رمشا کی دوستی میں بھی دراڑ پڑ گئی

ایک دن کالج میں رمشا نے ہی ماہین کو بتایا کہ تمہارے بھائی نے شجاع بھائی سے پتا نہیں کس انداز میں بات کی کہ شجاع بھائی پریشان سے ہو گئے کہ ابھی سے ان لوگوں کا رویہ ہم نے اسطرح کا ہے تو رشتہ داری کیسے نبھے گی اور یوں ماہین کی زندگی میں خوشیاں آنے سے پہلے ہی روٹھ گئیں۔

امی نے پوچھا بھی کہ بیٹا بتاؤ اگر تم راضی ہو یا تمہاری پسندید گی ہے تو میں رمشا سے بات کروں اور ماہین بے چاری ہمیشہ کی تابعدار، فوراً نفی میں گردن ہلا دی۔

"بس یہ معاملہ یہیں ختم کر دیں امی"

"کیا سوچتے ہونگے وہ لوگ ہمارے بارے میں"

امی نے فکر مندی سے ماہین کو دیکھا اور خاموش سی ہو گئیں۔

۔۔

ایم اے کرنے کے بعد ماہین نے جاب کر لی (ابا کی ممالنت کے باوجود) ایک دن امی نے پیار سے انہیں سمجھایا۔

"اپنے پیسے جمع کرنا بیٹا"

"کیوں؟ یہ جواب تھا بی کا۔

امی نے بی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہو کہا۔ تمہارے باپ کو تو تمہاری کوئی فکر نہیں تم ہی اپنی شادی کے لیے کچھ جمع کر لو۔

"نہیں امی مجھے شادی نہیں کرنی" ماہین نے بیزاری سے کہا۔

امی بولیں۔ ساری عمر ایسے ہی رہنا ہے کیا۔

ماہین نے آہنگی سے کہا۔ آپ نے کیا پایا شادی کر کے سوائے پریشانیوں کے

نہیں بیٹا اسے نہیں کہتے، اللہ تعالیٰ تمہارے نصیب اچھے کرے۔ امی سمجھانے والے انداز میں بولیں۔

"اچھا آپ خود ہی بتائیں اگر میری قسمت میں بھی ابا جیسا شخص ہو تو؟؟؟

کیوں فضول باتیں کرتی ہو۔

نہیں امی آئندہ آپ اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔

ہاں۔۔۔ بسین کی شادی کر دیں وہ چاہتی بھی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے۔

میں جو دور بیٹھی یہ ساری گفتگو سن رہی تھی بی کے چہرے پر پھیلی ہوئی آزارگی صاف محسوس کر رہی تھی۔

ماہین کے جاب کرنے پر ابا نے جو قیامت اٹھائی تھی اسکو سہنا امی کا ہی ظرف تھا۔ امی جو نہایت سلیقہ منہ اور صابر قسم کی انسان تھیں لیکن ابا کی تلخ اور کڑوی باتیں سن سن کر گویا خود بھی کڑوی گولی ہوتی جارہی تھیں۔ زندگی کی کٹھن چکی میں پیستے پیستے گھر کو جیسے تیسے چلا رہی تھیں۔ پھر ابا نے بھی تو الٹی میٹم دے دیا کہ میں نے بسکٹ کھلا دیا اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ بھلا اپنے بچوں اور بیوی کو کوئی ایسے کہہ سکتا ہے۔

لیکن میرے ابا نے واقعی کہہ دیا تھا، یہ نہیں تھا کہ ابا کردار کے لحاظ سے کوئی بُرے آدمی تھے، ہاں بس گویا ماں سے ناراض ہی رہتے تھے۔ ابا جب ریٹائر ہو گئے تھے۔ جب میں پانچ سال کی تھی بس پنشن پر گزارا تھا یا وہ چھوٹی موٹی پرائیویٹ نوکریاں جو ابا اکثر کرتے رہتے تھے۔

ابا نے اپنی تھوڑی بہت جو جمع پونجی تھی وہ بڑے بھائی کو عنایت کر دی تھی۔ بقول ابا کے انوسٹ کر رہا ہوں۔ یہی بیٹا تو میرے کام آئے گا۔ بڑے بھائی کو بھلا کیا کام آنا تھا۔ لاہور جا کر جیسے ہی نوکری ملی شادی کی رٹ لگا دی اور آخر کر کے ہی دم لیا یہ نہ سوچا کہ دو چھوٹی بہنیں بھی ہیں خود غرضی دیکھا ہی دی انہوں نے۔

اور بھائی، بھابی نے تو دو دن بھی سسرال میں رہنا گوارا نہ کیا اور لے گیء بھائی کو میکے لاہور، پھر تو اماں نے چھوٹے بھائی کو دانتوں سے پکڑ کر رکھا کہ کہیں وہ بھی نہ چلا جائے۔

ہر دوسرے تیسرے مہینے، عمران بھائی معہ بھابی کے کراچی آتے تو امی ان کی خاطر میں ایسے لگ جاتیں جیسے وہ کوئی غیر مہمان ہوں، ایک ہفتہ انکی ایسی خاطر مدارت ہوتیں کہ پورا مہینہ ہم صرف پتلی دال اور شوربے والے آلو کھاتے ہی گزارتے۔

یہی باتیں ماہین کو سخت ناپسند تھیں کہ عمران بھائی کو گھر کے سارے حالات کا علم ہے اس کے باوجود وہ امی کو منع نہیں کرتے تھے کہ اتنا خرچہ نہ کریں۔ اور اس بار تو عمران بھائی

نے حد ہی کر دی ایک دن امی نے موقع دیکھ کر بھائی سے کہا

"ارے عمران سنو! تمہارے کافی جاننے والے ہونگے دوست وغیرہ بھی اور بہو کا میکہ بھی بھرا پڑا ہے، ماہین کے لیے کوئی لڑکا دیکھو نا۔۔۔؟

"کیا کہہ رہی ہیں امی آپ" (حسب معمول بھائی کا لہجہ سخت تھا) "بھلا اپنی بہن کی شادی کے لیے میں لوگوں سے کہوں کہ میری بہن سے شادی کر لو۔

ارے بھئی میرا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے۔ طریقہ سے بات کرنا شاید کہیں بات بن جائے۔

بھائی نے کھانا کھاتے کھاتے سائیڈ پہ گردن کو جھکا دیا۔

اور میں بھائی کے اس رویے پر دکھی سی ہو گئی امی کے چہرے پر عجیب سی بے بسی تھی۔ لیکن نہیں بھئی انہوں نے تو جیسے عزت اور لحاظ بالائے طاق رکھ دیئے تھے، یہ ابا کے امی کے ساتھ سخت رویے کا اثر تھا جو بھائی کی عادتوں میں بھی جھلکتا تھا۔

بھابی کمرے میں آئیں تو امی خاموش ہو گئیں۔ میں نے اس واقعے کا ذکر بی سے بھی نہیں کیا۔۔ شاید وہ مجھ سے بھی زیاد دکھی ہو جاتیں۔۔۔

دن بڑے بور گزر رہے تھے۔۔ اسی دوران میرے بی اے کے ایگزامز بھی ہو گئے۔

بی نے اپنی ایک دوست کے ذریعے ایک پرائیویٹ اسکول میں میرے لئے جاب کی بات کر لی۔

ابا نے سنا تو ماہین کو خوب ڈانٹا۔

"بہت اچھے، چھوٹی کو بھی لائن پر لگا دیا۔"

سر پکڑ کر رہ گئی ایک دن (ابا امی کی طرف دیکھ کر بولے)

امی دھیمے دھیمے لہجے میں بول رہی تھیں۔

"اچھا تو کیا، کیا ہے، اپنا خرچ تو نکال لیں گی نا کسی کی محتاج تو نہیں ہوں گی۔

امی جلتے سلگتے ہوے۔ دنوں میں میرے لیے میری ایک کولیگ کے ذریعے اشتہ آیا جو میرے لیئے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوا اور بغیر کسی پس و پیش کے منظور کر لیا گیا۔ لیکن میں بعذ تھی کہ پہلے "بی" کی شادی ہو گی مجھے انکی یہ ویران ویران اور بور زندگی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن بی نے مجھے ڈانٹ دیا کہ۔

خاموش رہو۔ (اور اپنی شادی کی تیاریاں کرو میری فکر چھوڑو) تم جانتی ہو کہ ابا جس قسم کے رشتے میرے لئے لاتے ہیں۔ وہ مجھے کسی صورت قابل قبول نہیں ہیں۔ بی نے میری اچھی خاصی خبر لے ڈالی اور میں خاموش ہو گئی۔

ایک دن موقع پا کر پھر میں نے بی کو پکڑا اور لگی سمجھانے دنیا کی اونچ نیچ۔

دیکھ بی۔ اکیلے زندگی گزارنا بڑا مشکل کام ہے کوئی تو ہمدارد اور ساتھ ہونا چاہیے نا!

"اچھا تم کب سے بڑی بن گئیں" بی نے ہنس کر مجھے دیکھا اللہ بی تم ہنستی رہا کرو۔ کتنی اچھی لگتی ہو ہنستی ہوئی۔ پلیز بی بات کو ٹال نہیں (میں نے پھر بات شروع کی) میرے چہرے پر پھیلی اداسی بی کو بھی اداس کر گئی۔ بہت آہستگی سے بولیں۔

کیسے کرلوں شادی اور کس سے کروں، تمہارا جو رشتہ آیا ہے وہ واقعی بڑا مناسب ہے، میں نے تو امی سے کہا ہے کہ دیر نہ کریں تمہاری شادی میں اور امی میرے بات کو ابا کے جاننے والوں کے جو رشتے آتے ہیں

نا! تو وہ مجھے کوئی ہمدرد اور ساتھ تو نہ دے سکیں گے بلکہ ندگی کا درد اور بڑھا دیں گے اس لیے میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، پھر مجھے شادی وای میں کوئی انٹریسٹ بھی نہیں ہے۔

ہوں۔۔ میں نے لمبی سانس کھینچ کر کہا، تمہاری بات بھی اپنی جگہ درست ہے اور میری بات بھی، کیونکہ دیکھونا، شادی مجبوری ہے، سچ جب میں اکیلی باہر جاتی ہونا تو بڑا ڈر لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے چاروں طرف سے لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں خوف محسوس ہوتا ہے لوگوں سے جیسے ہر طرف بھیڑیئے منہ کھولے کھڑے ہوں تو کیا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم ان سے بچنے کے لیے کسی کی پناہ میں آجائیں۔

"مہومنہ "ماہین بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولیں "اچھی منطق ہے تمہاری، لیکن یہ تو بتاؤ، کہ تم شادی ہی کو زندگی کی معراج کیوں سمجھتی ہو۔۔۔۔ پڑھو لکھو، او سنو! اپنا ایک اسٹیٹس ہونا چاہیے۔ سنان کا اور اس طرح رہو کہ کوئی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے، اتنی مضبوط بن جاؤ کہ کوئی تمہیں توڑ نہ سکے، ضروری تو نہیں کہ شدی ہی کی جائے۔

"وہ بھی منطق تو آپ کی بھی اچھی ہے "میں ہنستے ہوئے بولی چھوٹے بھائی رضوان کرکے میں داخل ہوئے اور بسین کو چائے بنانے کو کہا تو وہ فوراً بولی۔

"دیکھو رضوان (بسین رضوان سے ایک سال چھوٹی تھی)

"جب دو فلاسف آپس میں گفت وشہید کر دیے ہوں نا تو عام لوگوں کو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے او سنو! دو گھنٹے پہلے تو میں سب کو چائے دے چکی ہوں پھر۔۔۔ پھر چاہیے تمہیں۔

ویسے بھی امی نے پابندی لگا دی ہے بار بار چائے بنانے پر۔

رضوان نے منہ بنا کر بسین کو دیکھا،

"یوں کہونا کہ نہیں بنانی یہ بہانے تو نہ بناؤ"

اس دوران بی ہم دونوں کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی، بی سب سے بڑی تھیں سوائے عمران بھائی کے۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے عمران بھائی تو مستقل لاہور جا کر بس گئے وہ بہن بھائی اور ماں باپ کو لاہور بلانے کی بات شاید وہ بھول بھال گئے امی اس بات کا اکثر احساس کرتیں لیکن ہم امی کو تسلی دے دیتے۔

ابھی عمران بھائی کی بے رخی کا غم تازہ ہی تھا کہ چھوٹے بھائی رضوان نے اپنی شادی کا غل مچادیا۔ کہ اسی سال شادی کرنی ہے۔

امی نے بہتر سمجھایا کہ پہلے بسین کی بات طے ہو جائے پھر تمہارا سوچیں گے تمہاری نئی نئی جاب ہے کچھ جمع جوڑ تو لو، فی الحال تو بسین کے لیے ہی مشکل ہو رہی ہے۔ (بغیر جواب دیئے رضوان باہر نکل گیا)

"اور کہا"۔۔۔ماہین بولیں، لیکن امی آپ پریشان نہ ہوں، کچھ پیسے میں نے جمع کیے ہوئے ہیں اور کچھ بسین کے پاس بھی ہیں۔

پھر بسین کے سسرال والے پہلے ہی منع کر چکے ہیں ہمارا حال تو انہوں نے دیکھ ہی لیا ہے۔

لیکن بیٹا کچھ نہ کچھ تیاری تو کرنی ہی ہو گی۔ امی پریشانی سے بولیں، اس نامعقول رضوان کو کون سمجھائے کہ بہنوں کے ہوتے ہوئے اسکی ابھی شادی کریں کیسے، میرا تو خیال تھا کہ تمہاری بھی کہیں ہو جاتی تو پھر رضوان کی کرتے۔

لیکن ہونی کو کون روک سکا ہے، آخر کو ہوا وہی جو رضوان نے چاہا اور یوں ہمارے گھر میں ایک فرد کا اضافہ اور ہو گیا اور ابا حسب معمول خاموش تماشائی بنے رہے۔

رضوان کی شادی کو تین ماہ گزر گئے۔ چھوٹی شادی کا تو مزاج ہی ہمارے سمجھ میں نہیں آرہا تھا گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، سبھی تو امی کی ہر بات بے چھوں وچراں مان لیتی کبھی سارہ یس کہی ہوئی بات کا بھی بتنگڑ بن جاتا پھر ہوتا ہی جو عموماً ایسے گھروں میں ہوا کرتا ہے۔

میں شام کا کھانا پکا رہی تھی کہ بھابی کچن میں آئیں کہ لاؤ میں پکاوں گی؟

"ارے بہن بھابی بس پک گیا" تم تو مہمان ہو اس گھر میں آج نہیں تو کل دونوں چلی جاؤ گی آخر کار گھر تو میرا ہی ہے۔ نا جی بالکل آپ ہے۔ میں نے آہنگی سے جواب دیا۔

"ماہین باجی کی شادی کب ہو گی" بھابی نے استہفامیہ انداز میں پوچھا۔

دیکھیں بھابی جب کوئی اچھا رشتہ مل جائے گا۔

بھابی نہیں کر بولیں مجھے تو کوئی آس امید نہیں لگ رہی کہ ماہین باجی اس گھر سے جائیں گی۔

"کیوں آپ نکالنا چاہ ہی ہیں کیا" میں بھی ہنس کر بولی۔

بھابی کا آخری جملہ ماہین نے اندر آتے آتے سن لیا تھا اور ا نہیں اچھی طرح احساس تھا کہ اب اس گھر میں ان کا رہنا مشکل ہو جائے گا۔

یہ اور اسی طرح کی سنکڑوں باتیں بھابی کرتی رہتی تھیں میں اور بی حیرت سے سوچتے تو بھئی ہم اپنے ہی گھر میں اجنبی بنتے جا رہے ہیں۔

اور واقعی بی اجنبی بن کے ہی رہ گئیں۔ امی، بیٹا بہو اور شوہر کے ناز اٹھانے کے لیے ہی رہ گئیں تھیں جیسے۔۔۔

گھر میں ہر وقت بھابی کی پھیلائی ہوئی ہٹنشن امی اور بھابی کی ہر وقت کی چپلقش، بھائی او بھابی کی طنزیہ باتیں، ابا کی وہی لا پرواہی اور غصیلا رویہ۔۔۔

پل پل مجھے سہارا دیتنے والی بی، خاموش خاموش رہنے لگیں۔

وہ چاہتی تھیں کہ کم از کم میری تو شادی ہو جائے اور میں اس پریشان کن ماحول سے چلی جاؤں اور یوں رضوان کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد میری شادی بھی ہو گئی بڑی سادگی سے جس میں کوئی شور شرابہ نہیں تھا۔ بس قریب قریب کی چند رشتہ دار اور عمران بھائی فیملی اور یوں میں اپنے گھر کی ہو گی۔

عمران بھائی تو لاہور جا کر ایسے بسے تھے کہ پلٹ کر چھوٹے بھائی بہن اور ماں باپ کی خبر لینے کی انہیں فرصت ہی نہ تھی، کبھی کبھی خیریت کا فون آجاتا تھا وہ بھی رسمی انداز میں۔

میں جب بھی میکے آتی واپسی پر میری آنکھوں میں آنسو

ہوتے جو میرے شوہر کو اچھی طرح محسوس ہو جاتے تھے۔
وہ پوچھتے تھے تو بھلا بتاتی کبھی کیا؟ گھر میں کچھ بھی صحیح نہیں تھا، جب بھی میکے سے واپس آتی تھی ساس میری خاموشی اور اداسی کو اور ہی رنگ دیتیں، اور یہی سوچتیں کہ ماں نے کچھ سنکھا کر بھیجا ہو گا، کہ ساس کے ساتھ ایسا رویہ رکھا کرو،
اپنی اس سوچ کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً باتوں باتوں میں مجھ سے کر ہی دیتی تھیں اور فوراً تصدیق کرتی کہ نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں، امی تو آپ کی خیریت پوچھتی رہتی ہیں، پھر وہ مجھے کبھی غلط بات پر نہیں آسائیں گی۔
"آپ ایسا سوچ بھی کیوں رہی ہیں"
اب میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ میں تو اپنے گھر کیکبھی نہ ختم ہونے والے مسائل میں الجھ کی ایسی ہو جاتی ہوں اگر انہیں کچھ بتاتی بھی تو کوئی فائدہ نہ ہوتا بلکہ اُلٹا مجھے ہی طفے سننے کو ملتے کہ تمہارے گھر میں تو ایسا ہوتا ہے بہن ایسی ہے بھائی ویسا ہے، بس یہی سوچ کے چپ ہو جاتی کہ کچھ نہ ہی بتاؤں تو اچھ اہے اسی میں میری عزت ہے اور جو کچھ ساس کو نظر آتا تھا، وہ عمران بھائی کی لاتلقی اور ماہین کی شادی نہ ہونا، یہی مصالحہ ان کے لیے بہتتھا نہیں باتوں پر میر سر جھک جاتا تھا۔ سسر تو حیات نہیں تھے۔ ذیشان (میرے شوہر) کی تین بہنیں تھیں شادی شدہ ہر وہک اہنڈ پر وہ گھر آتی تھیں اپنے ساس تو صدقے واری جاتی تھیں تو اسہ نواسیوں کے ذیشان بھی بہنوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بہنوں کے ساتھ ان کا ہمدردانہ رویہ اور پیار و خلوص میرے لیئے بڑے حیران کن ہوتے تھے کہ دیکھوں بھائی ایسے ہوتے ہیں۔
اس پر بھی میری نندوں کو شکوہ تھ اکہ ان کا بھائی شادی کے بعد بہت بدل گیا ہے۔، ایسے ہی ایک ویک اینڈ پر سب آئے ہوئے تھے۔
بھای یہ بھائی کہاں ہیں، جب بھی ہم گھر آتے ہیں بھائی کو کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا ہے اور ہماری واپسی کے وقت آرہے ہوتے ہیں (سمیرا امنہ بنابنا کر بول رہی تھی۔)
ارے نہیں سمیرا ایسی کوئی بات نہیں تمہارے بھاء تو بہت اچھے ہیں۔ مجھے تم لوگوں کا خیال رکھنے کو کہتے ہیں شاید کسی کام سے چلے گئے ہونگے (میں نے عام سے انداز میں کہا)۔
ہمارا بھائی تو لاکھوں میں ایک تھا، اب پتا نہیں کیسے ہو گئے ہیں (حمیرا نے کندھے اچکا کر کہا)
"اتنا تو خیال رکھتے ہیں تم لوگوں کا" میں نے آہستگی سے کہا۔
"تو۔۔۔ نہ رکھیں خیال آپ تو یہی چاہیں گی۔
نہیں نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں، میرا مطلب ہے بہت سے بھائیوں سے اچھے ہیں
ہاں اسکے بھائی تو واسے پلٹ کر نہیں پوچھتے (ساس منہ میں پان رکھتے ہوئے بولیں)
نہ ماں باپ پوچھیں، ہاں بڑی بہن کا فون آجاتا ہے کبھی کبھی۔
اور میں شرمندہ شرمندہ سی سب کو دیکھنے لگی پھر ساس سے بولی۔
امی کھانا لگادوں۔

ہاں بھئی کافی ٹائم ہو گیا ہمیں جانا بھی ہے۔

نند اٹھتے ہوئے بولی اور میں آہستہ قدموں سے کچن کی طرف چلی گئی۔

ابا غصے میں بھرے گھر میں داخل ہوتے ہیں

رکھنا اب ساری عمر بیٹی کو بیٹھا کے۔ پہلے ہ کہا تھا نہ پڑھاو اتنا مگر تم۔۔۔ تم تو جیسے بیٹی کو عالم فاضل بنانا چاہتی تھیں۔۔۔۔

ہو منہ۔

تو بھلا میں کیا کرتی، وہ کوئی تمہاری بیٹی کے لائق تھے، کوئی ڈھنگ کا رشتہ آتا تو سوچتے بھی۔ (امی نے دکھ سے کہا)

نئ کوئی آسمان سے اترے گا رشتہ، کوئی ڈاکٹر، انجینئر آنے والا نہیں اس گھر میں جو ہماری حیثیت ہے ویسا ہی رشتہ آئے گا۔

پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے اسکا۔ (ابا کی تو یوں کا رخ ماہین کی طرف ہو گیا)

ماہین اندر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یہ ان پڑی دکاندار ابا کو کوئی اور نہیں ملا میرے لیئے۔

ابا بدستور بولے جا رہے تھے۔

"اب میں کیا کر سکتا ہوں، پہلے جو لوگ آتے تھے انہوں نے کہوا دیا کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہے، پھر پلٹ کے آتے ہی نہیں، یہ لوگ کم از کم شادی پہ راضی تو ہیں۔

امی نے ہمت کر کے آہستہ سے کہا، اتنی بڑی عمر کا تو تھا، مجھے تو دیکھتے ہی عجیب سا لگا، اب ایسی بھی عمر نہیں نکل گئی بڈھے سے شادی کر دوں اپنی بیٹھی کی۔

تم نے ہی بگاڑا ہے اپنی اولادوں کو، تمہاری کسی اولاد کی طرف سے مجھے سکھ نہیں ملا۔

دن اسی طرح گزرتے گزرتے تین سال گزر گئے، میرا بیٹا دو سال کا ہو گیا۔

بی آگے پڑھنا چاہتی تھیں لیکن ابا نے ان پر سختی سے پابندی لگا دی تھی، لوگوں کے کہنے میں آ کے ماہین کی جاب بھی چھڑا دی۔

عجیب بے مقصد سی زندگی ہو گئی تھی ماہین کی جس گھر میں وہ پیار اور محبت دیکھنا چاہتی تھیں اب اسی گھر میں وہ بیزار بیزار سی نظر آتی تھیں۔

میں بی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک ان کا فون آ گیا۔ کہ ابا کی طبعیت بہت خراب ہو گئی، رضوان کو آفس فون کیا تو وہ آفس میں نہیں تھا۔ اسکے دوست کو فون کر کے رضوان سے رابطہ ہوا وہ ایک گھنٹے بعد پہنچا ابا کو فوراً اسپتال لے گئے ہیں تم آجاؤ امی بھی ابا کے ساتھ گئیں ہیں۔

یہ سننا تھا کہ میں نے اپنی ساس کو بتایا اور فرحان (بچہ) کو لے کر سیدھی گھر پہنچی۔

دوران اسپتال میں رہ کر ابا گھر آئے تو بڑے کمزور کمزور لگے پرھ ایسا بستر کو لگے کہ اٹھ ہی نہ سکے۔ ایک مہنے کے اندر اندر ابا اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ابا کے انتقال کے بعد بھی بھائیوں کی وہی بے نیازی تھی۔

مجال ہے جو انکی زندگیوں میں کوئی فرق آیا ہوں ہاں۔۔۔

فرق آیا تو امی کی زندگی میں، فرق آیا تو ماہین کی زندگی میں، تھے تو آخر باپ، جب سایہ سر سے اٹھا تو اکیلا پن اور بڑی

گیا۔

ابا کے انتقال کو سال گزر گیا، امی شکل سے بدسوں کی مریض لگنے لگی تھی۔

میں اتوار کو گھر آئی تو بی حسب معمول خاموش خاموش امی گھر کے کاموں میں مصروف بھابی کا اپنا ایک روٹین تھا، وہی دیر سے اٹھنا، پھر بچوں کے کاموں میں لگ جانا اور ماہین کا تو وجود ہی بھابی کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا، آج بھی شاید کوئی بات ہوئی تھی جبھی بھابی کا منہ ونا ہوا تھا۔

میں کمرے میں گئی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی کو میرے آنے یا نہ آنے سے کوئی سروکار ہے، اگر میں مہنوں نہ آؤں تو شاید کوئی مجھے نہ بلائے۔ کچھ رہے ہی احساسات کے ساتھ میں کمرے میں داخل ہوئی بی لیٹی ہوئیں تھیں، مجھے مضبوطی کا درس دینے والی بی خود ایسا ٹوٹیں کہ اندر ہی اندر ریزہ ریزہ ہونے لگیں۔ کیسی ہو "بی"؟ گویا میں نے اپنے آنے کی اطلاع دی۔

ٹھیک ہوں، کیسی ہو نگی؟ عجیب اکھڑے اکھڑے انداز میں بی نے جواب دیا۔

بھابی نے کچھ کہا ہے، میں نے آہستہ سے پوچھا،

ان کا کہا ہوا پتا تھوڑی چلتا ہے، ڈائریکٹ تھوڑی ہم سے کہتیں ہیں وہ تو رضوان کا رویہ بتا دیتا ہے کہ انہوں نے ہمارے بارے میں رضوان سے کچھ الٹا سیدھا بولا ہو گا۔ وہی زور زور سے غصہ کر رہا تھا۔ امی ہی جواب دے رہی تھیں، مجھے کچھ پتا نہیں؟

"میں تو جانتی ہوں بھابی کو اچھی طرح، کہو کچھ مطلب کچھ اور ہی نکالتی ہیں۔ میں تو ان سے اسی لیئے زیادہ بات ہیں نہیں کرتی۔

یہی بات تو انہیں بڑی لگتی ہے کہ تم ہمارے اس بیٹھ کر چلتی جاتی ہوں۔ دو چار ان کی تھی کھری کھری سنا کرو۔ (آخری جملہ بی نے ہنس کر کہا)

صحیح کرتی ہوں میں ایسے انسان سے بات کرنے کا کیا فائدہ انہیں کوئی نہ کوئی ایشو چاہیے بس۔

بی نے اکتاہٹ سے کہا۔

گھر کا ماحول گھٹا گھٹا سا تھا۔ شام ہوتے ہی میں نے گھر جانیکی رٹ لگا دی۔ امی نے روکا بھی لیکن میرا دل نہیں لگا۔ جی بھی بہت بدل گئیں تھیں زیادہ باتیں بھی نہیں کرتی تھیں جب بات کرو تو کھوئی کھوئی سی جواب دیتی تھیں، الٹا انہیں مجھ سے گلہ تھا کہ میں بدل گئی ہوں۔

امی اکثر بیمار رہنے لگی تھیں، شوگر اور ہائی بلڈ پریشر نے امی کو ایک دم نڈھال سا کر دیا تھا، مجھ سے کئی بار بڑے بھائی کو فون کر ولیا کہ کچھ پیسے بھیج دیا کریں امی کے لیئے چھوٹے بھائی کے اپنے بیوی بچوں ے اتنے خرچے تھے کہ کچھ بچتا ہی نہیں تھا، اسطرح بڑے بھائی کبھی کبھار امی کو کچھ رقم بھیج دیا کرتے تھے۔

گرمی کے تپتے ہوئے دن تھے، ابا کے انتقال کے بعد بی کبھی کبھی اپنی دوستوں سے ملنے چلی جایا کرتی تھیں۔ امی جانے دیتی تھیں کہ چلو اچھا ہے دل لگ گا ان کا میں اھی ابھی نہا کر

نکلی تھی کہ امی کا فون آ گیا۔

"جی امی"

امی وہ بیٹا ماہین ابھی تک گھر نہیں آئی، پتا تو کرو اس کی دوستوں سے، شام ہونے کو آئی، اس کے فون پر کیا تو بند جا رہا ہے۔

میں نے امی کو تسلی دی ارے امی کیوں پریشان ہو رہی ہیں، آجائیں گی۔ ویسے میں پتا کرتی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔

"ارے کیسے پریشان نہ ہوں، رضوان آ گیا تو سو باتیں سنائے گا۔

میں نے بی کی دوست سمعیہ کو فون کیا۔

"ماہین تمہارے یہاں ہیں کیا۔ یا معلوم ہے کس دوست کے ہاں گئی ہو نگی، کہیں بازار تو نہیں گئیں، میں نے گھبراہٹ میں ایک ساتھ کئی سوالات کر ڈالے۔

سمیعہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ

"نہیں یہاں تو نہیں آئی کیوں؟ خیریت، کہیں گئی تھی کیا۔

نہیں! اسطرح بغیر بتائے کہیں جاتی تو نہیں، سنو تمہاری کسی اور دوست سے پتا کرو شاید وہاں گئی ہوں۔

"ہاں، اچھا میں پوچھتی ہوں"

تھوڑی، دیر بعد انکی دوست فرحانہ کا فون آیا کہ ماہین دوپہر کو یہیں تھیں لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کی فیملی سی ویو گئی ہے لہذا میں نے ان کو سی ویو کی بس تک چھوڑا رہا تھا، کیا تم لوگ وہاں نہیں گئے۔

میں ایک دم گڑبڑا سی گئی، ہاں جانا تو تھا، اچھا ٹھیک ہے میں گھر کی طرف جا رہی ہوں پہنچ گئی ہو نگی۔

میں فوراً امی کی طرف آئی، رات ہو چکی تھی، گھر پہنچی تو گھر میں عجیب موت کا سا ماحول تھا، امی رو رہی تھیں، میں پہلی بار اس طرح امی کو آنسوؤں سے روتے دیکھا، بھابی کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں، رضوان بھائی عجیب سے انداز میں ٹہل رہے تھے۔

"کیا ہوا امی، بی کہاں ہیں، کچھ پتا چلا"

رضوان تم جاؤ نا، کچھ کرو، میرے بھی آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور جب میں نے رضوان کو روتے دیکھا تو پھٹ پڑی، خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے۔ کیوں رو رہے ہو۔۔۔

بھابی بولیں۔۔۔ سب طرف پتا کروایا، محلے کے کچھ لڑکے سی ویو سے آئے تھے جب انہیں پتا چلا کہ ماہین کو ڈھونڈ رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ ماہین باجی تو سی ویو پر تھیں، ہم سمجھے اپنی دوستوں کے ساتھ آئی ہو نگی، کیا ابھی تک نہیں پہنچی یہ سننا تھا کہ رضوان فوراً سی ویو کیطرف دوڑے، بائیک بھگاتے ہوئے وہاں پہنچے تو ایک طرف لوگوں کا جم غفیر تھا، بھیڑ کو چیرتے ہوئے رضوان آگے بڑھے تو ایک آدمی کے ہاتھ میں ماہین کا بیگ دیکھ رضوان نے فوراً چھینا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو میری بہن کا ہے۔

ہاں ہاں بھائی ایک بڑی لہر آئی اور لڑکی کو بہا کر لے گئی، کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر پانی میں گئی، ڈوبنے کوئی کچھ اور

کوئی کچھ۔

غوطہ خور گہرائی تک اندر گئے لیکن ماہین کو کہیں سراغ نہ ملا۔

میں نے آنسوؤں سے بھیگی دھندلی، آنکھوں سے راضوان کی طرف دیکھا اور زندگی میں پہلی بار، ہاں پہلی بار رضوان مجھے اور امی کو گلے لگائے رو رہا تھا، ہم تینوں بے تحاشہ آنسو بہارے تھے، رضوان نے پہلی بار میرا ماتھا چوما، اور۔۔۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ محبتوں کو پانے کے لیے کیا جانوں کا نذرانہ ضروری ہوتا ہے، کیا کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھونا ضروری ہوتا ہے۔؟؟؟؟؟۔۔۔۔ کیوں؟

اس بات کو ایک ماہ گزر چکا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے بی یہیں کہیں ہیں اور آجائیں گی، لیکن نہیں ایسا نہیں ہو رہا، بسین کی آنکھوں میں جان ہونے لگی ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ابھرتا ہوا سورج اپنی گرم گرم کرنیں اسکی آنکھوں میں بھر رہا ہے پھر اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر ہتھیلیاں دیکھ لیں، کھڑکی کے پاس سے اٹھی اور باتھ روم جا کر ٹھنڈے پانی کے چھنٹے آنکھوں پر مارے صبح ہو چکی تھی۔ لیکن بسین اور اسکے گھر والوں کا سورج شاید ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا تھا کبھی نہ طلوع ہونے کے لیے بسین کے بھائیوں کے لیے پچھتاوں کے اندھیرے۔۔۔

آج چھٹی کا دن تھا، بسین کے شوہر نے اسکا دل بہلانے کے لے امی کے گھر جانے کے بارے میں پوچھا۔۔۔

"امی کے گھر جانا ہے"

"نہیں" بسین کھوئے کھوئے انداز میں بولی مجھے آج سی ویو لے چلیں۔

"چلو" اور وہ واقعی مجھے لے آئے تھے۔

ہر طرف خاموشی تھی، یہاں نسبتاً لوگ کم تھے۔ پتا نہیں ایک دم بسین کو کیا ہوا، چیخ چیخ رو پڑی بی وہ ی ی۔۔۔۔ آ جاؤ بی

کہاں ہو تم، کیوں کیا تم نے ایسا، کیوں؟؟؟؟

کیوں انتقام لیا سب سے زندگی بھر رلانے کا

آ جاؤ آ جاؤ بی، تمہارے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔

بسین کے شوہر نے بازو سے پکڑ کر بسین کو اٹھایا۔

"چپ ہو جاؤ چلو اب یہاں سے

لیکن میرے اور میرے گھر والوں کے آنسو اب شاید زندگی بھر خشک نہ ہوں

امی بھی جیسے کچھ ڈھونڈتی رہتی تھیں رضوان بھی بے چین بے چین پھرا کرتا، او بسین، بسین کو ایسا لگتا کہ جیسے اسکا کچھ کھو گیا ہے۔ کبھی نہ ملنے کے لیئے۔

لال گلاب

راحیلہ منظر

آج مجھے گھر جلدی پہنچنا تھا کیونکہ میرے بیٹے کا برتھ ڈے تھا۔ میرا بیٹا کئی بار کال کر کے مجھے یاد دلا چکا تھا۔ لیکن آج کلینک پر مریضوں کا زیادہ ہی رش تھا میں ایک ڈاکٹر تھا اور سرکاری ہوس پیٹل میں ڈیوٹی کرتا تھا آف ڈیوٹی میں اپنے کلینک پر ہوتا تھا میرا کلینک ایک پسماندہ علاقے میں تھا جہاں آس پاس زیادہ تر غریب لوگ آباد تھے جو محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے تھے میں سب کا فری چیک اپ کرتا تھا اور میڈیسن بھی دیتا جس کے بدلے میں مجھے بہت سی دعائیں ملتی میں عموماً شام 6 بجے کلینک سے چھٹی کر لیتا تھا میرے بعد ایک ورکر کلینک سنبھالتا تھا لیکن آج 6 سے اوپر ٹائم ہو گیا تھا میں ابھی تک کلینک سے نہیں نکلا تھا اللہ اللہ کر کے مریضوں کا چیک اپ ہوا اور میں نے گاڑی کی چابی اٹھائے کلینک کے دروازے سے پہلا قدم باہر رکھا ہی تھا کہ سامنے ایک عورت اپنے بچے کو لئے کھڑی تھی بچے کے سر سے کافی خون بہہ رہا تھا یوں بہتے خون کو دیکھ کر ایک پل کو میری آنکھوں سے سامنے 5 سال پہلے کا واقعہ گھوم گیا لیکن یہ وقت بیتی باتوں کو یاد کرنے کا نہیں تھا اس وقت بچے کو میری ضرورت تھی میں بچے کو اٹھا کر اندر لا یا۔ بچہ مکمل بے ہوش تھا زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے۔ عورت سے پوچھنے پر پتہ چلا بچے کو چوٹ اسکی غیر موجودگی میں آئی ہے۔ میں نے عورت کو آئندہ احتیاط کی تلقین کی اور بوجھل قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اپنی گاڑی تک آیا میری ساری شرٹ خون سے بھر گئی تھی 5 سال پہلے بھی تو کچھ ایسا واقعہ ہی رونما ہوا تھا تب بھی میری ساری شرٹ خون سے بھری تھی جب اس نازک سی جان کو میں نے ہوس پیٹل کے بیڈ پر لٹایا تھا وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا میں خیالوں میں گم تھا جب مجھے اچانک گاڑی کو بریک لگا پڑی آگے گاڑیوں کی لمبی قطار جمع تھی میری ذراسی کوتاہی بہت بُرے نقصان کا سبب بن سکتی تھی۔

سب گرین بتی کے جلنے کے انتظار میں تھے گاڑیوں کے ہارن
کی آوازیں یوں لگ رہا تھا جیسے سر پر کوئی ہتھوڑے برسا رہا
ہوں شام کا وقت تھا سب کو اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی
جس کا ثبوت سب ہارن بجا بجا کر دے رہے یقیناً مجھے بھی
جلدی تھی سو عادتاً میں نے بھی دو تین با ہارن بجا دیا۔ اور
آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔ میں نے یک
دم آنکھیں کھولی جب میرے کانوں میں آواز پڑی۔۔
صاحب لال گلاب لے لو۔ ایک دم تازے ہیں باہر ایک بچہ
گلاب لئے کھڑا تھا وہ میری طرف بہت مصومیت سے دیکھ کر
مسکرا رہا تھا یہ بچہ روز اسی اسٹاپ پر گلاب بیچتا تھا ساتھ میں
اسکا باپ بھی ہوتا میں اکثر اس بچے سے گلاب خرید لیتا کبھی
صبح کو کبھی شام کے وقت بھی صبح کو خریدے گلاب ہوس
پیٹل میں جب کسی مریض کو دیتا وہ بہت خوش ہو جاتا
ڈھیروں دعائیں دیتا شام کو خریدے گئے گلاب میری بیوی
اور بچے کے لیے ہوتے۔ میں جب بھی اس گلاب فروش بچے
کو دیکھتا تھا نا چاہتے ہوئے بھی پانچ سال کا واقعہ میرے ذہین
میں تازہ ہو جاتا یوں لگتا جیسے یہ کل کا واقعہ ہو بتی گرین ہوئی
ساری گاڑیاں چلنے لگی میں نے جلد سے بچے کے ہاتھ سے لال
گلابوں کا بوکے لیا اور اسے سو کا نوٹ دیتے ہوئے گاڑی
اسٹاپ کرنے لگا بچہ بولا صاحب بقایا نہیں لینا۔ بدلے میں میں
بچے کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا بچہ سمجھ گیا میں آج بقایا

نہیں لونگا ایک بس روپے واپس لے کر کونسا میں نے محل بنا
لینا تھا۔ لیکن گلاب فروش بچہ بھاگتا ہوا میری گاڑی کے پیچھے
آیا۔ چند گلاب اور دیتے ہوئے بولا صاحب یہ میری طرف
سے آپکے بیٹے کے لیے آپ نے کل بتایا تھا نا آج اس کا پیدا
ہونے والا دن ہے مجھے یاد ہے میں بھولا نہیں ہوں۔ میں بہت
حیران ہوا بچے کے منہ سے یہ سب سن کر میں نے تو کل یونہی
کہہ دیا تھا۔ میں کل کو زیادہ گلاب لونگا کیونکہ میرے بیٹے کا
برتھ ڈے ہے۔ جیسے وہ سمجھ نہیں بایا تھا پھر میں نے کہا تھا
جس دن میرا بیٹا ہوا کل وہ دن ہے آج یہ سب کر کے بچے نے
مجھے حیران کر دیا تھا میں اکثر بچے کو زیادہ پیسے دیتا تھا کبھی وہ
رکھ لیتا کبھی وہ واپس کر دیتا اور کبھی ہاتھ میں پکڑے گلاب کی
ٹہنیوں میں سے چند ٹہنیاں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہتا
صاحب میں اپنے بابا کے ساتھ مل کر محنت مزدوری کرتا
ہوں پر میں بھکاری نہیں ہوں۔ اکثر یہ ایک جملہ میری
آنکھوں میں آنسو لے آتا سوچتا شاید اس دن میں نے اس
بچے کے ہاتھوں سے گلاب لے لیتا تو اسکی ماں زندہ ہوتی آج
پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی میں اپنے آپ کو معاف
نہیں کر پایا تھا یہاں تک کہ میں نے اپنی غلطی کا ازلہ بھی کیا
تھا اس بچے سے معافی بھی مانگی تھی لیکن پھر بھی میں اپنی
زندگی میں رونما ہونے والے اس واقع کو بھول نہیں پایا تھا
آج سے پانچ سال پہلے بات ہے جیسے ہی میری بیوی کی

میڈیکل رپورس میرے ہاتھوں میں آئی تھی میرا سر چکرا کر رہ گیا تھا میرے ساتھی ڈاکٹر نے مجھے سہارا دیا تھا میری شادی کو دو سال ہوئے تھے میں اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا میری بیوی نے ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا تھا شدی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔ اپنے گھر والوں کے خلاف جا کر مجھ سے شادی کی تھی ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقص کرنے لگی تھی جب کچھ ماہ بعد میری بیوی کے گھر والوں اس شادی کو مان لیا تھا یونہی ہنستے مسکراتے دو سال کا عرصہ بیت گیا پتہ ہی نہیں چلا تھا اس دو سال کے عرصے میں ابھی تک ہمیں وہ خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جسکی سب کو امید ہوتی ہے میں اپنی بیوی کا بارہا سمجھاتا پریشان نہیں ہوا کرو یہ سب تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جیسے چاہیے عطا کر دے اور جیسے چاہے نہ کرئے۔ اور پھر ابھی ہماری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے لیکن میری بیوی نا جانے کیا سوچ کر پریشان رہنے لگی تھی وہ اکثر کہنے لگی اگر میں آپکو اولاد کا سکھ نہ دے پائی تو کیا آپ مجھے چھوڑ دیں گے اور میں ہر بار اپنی بیوی سے کہتا ایسا کبھی سوچنا بھی مت تم میری زندگی ہو بھلا کیا کوئی اپنی زندگی سے منہ موڑ کر زندہ رہ پایا ہے یہ سن کر میری بیوی مسکرا دیتی۔ اور کہتی آپکو پتہ ہے مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن میری دوست کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ پھر میرے پوچھنے پر میری بیوی نے بتایا تھا اسکی دوست کو اسکے شوہر نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا ہے صرف اس لئے کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی یہ سن کر مجھے بھی بہت دکھ ہوا تھا شاید میری بیوی کی ساری پریشانی کی وجہ یہی تھی جو وہ کچھ دنوں سے زیادہ پریشان رہنے لگی تھی پھر میں نے بیوی کے بار بار ضد کرنے پر اسکا میڈیکل چیک اپ کروایا تھا میں خود بھیکر سکتا تھا لیکن مجھ میں خود کرنے کی ہمت نہیں تھی جس دن رپورٹس آنا تھی اس دن گھر سے نکلتے وقت میری بیوی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا میں اس کے کچھ نہیں چھپاؤں گا اور میں انے بھی بہت سی امیدوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا لیکن میری ہر امید ٹوٹ گئی تھی جب رپورٹس میرے ہاتھوں میں آئی تھی پہلا خیال یہی ذہین میں آیا تھا اب میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا بو جھل قدموں سے چلتے ہوئے میں گھر کے لیے نکلا تھا ان دنوں میرا ذاتی کلینک نہیں ہوا کرتا تھا ہوس پیٹل ڈیوٹی دے کر گھر چلا آتا تھا مجھے نا چاہتے ہوئے بھی گاڑی روکنا پڑی تھی جب آگے گاڑیوں کی لمبی قطار جمع دیکھی تھی جن میں موٹر سائیکل رکشے چھوٹی بڑی گاڑیوں سب شامل تھے سب کے سوارے بے چین نظر آرہے تھے موٹر سائیکلوں کی آوازیں رکشوں کا شور گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں۔۔۔ یوں لگ رہا تھا سر پھٹ جائے گا۔۔۔ اتنے میں پسینے سے شرابور بچہ میری گاڑی کے پاس آیا تھا اور بولا

تھا۔ صاحب یہ لال گلاب لے لو اور مجھے کچھ پیسے دے دو
میری ماں بہت بیمار ہے ماں کی دوائی لینی ہے۔ میں نے بچے کی
طرف دیکھا جو آنکھوں میں بے پناہ امید لئے کھڑا تھا اور پھر
میں نے بچے کے ہاتھوں میں پکڑے گلابوں کو دیکھا تھا جو
پوری طرح مرجھا گئے تھے خریدنے کے قابل نہ تھے لیکن
پھر میں نے بچے کی معصومیت کو دیکھتے ہوئے سو کا نوٹ پرس
سے نکالا تھا اور بچے دینا چاہا تھا بچے سے سو کا نوٹ پکڑ لیا او بولا
تھا صاحب یہ گلاب! نہیں گلاب نہیں چاہتے میں نے بچے کی
طرف بنا دیکھے جواب دیا تھا۔ نہیں صاحب اگر آپ یہ گلاب
نہیں لیں گے تو میں یہ پیسے بھی نہیں رکھ سکتا کیونکہ میں
بھکاری نہیں ہوں۔ پریشان تو میں پہلے بہت تھا بچے کی یہ
حرکت مجھے بہت ناگوار گزری تھی اور میں نے بچے کو بُری
طرح ڈانٹ دیا تھا میری ڈانٹ سننے کے بعد بچہ بھیگی آنکھوں
کے ساتھ شیشے کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔۔ اتنے میں بتی
گرین ہو چکی تھی مجھے ناچاہتے ہوئے بھی گاڑی آگے بڑھانا
تھی پر میں بچے کو کہنا چاہتا تھا وہ اپنی ماں کو ہوس پیٹل لے
آئے لیکن میں کہہ نہیں پایا تھ اپھر سوچا چلوں کل کو کہہ
دوں گا۔ گھر آ کر میں نے اپنی بیوی سے کیا وعدہ پورا کیا تھا سچ
جاننے کے بعد وہ تھوڑا روئی تھی پر ھ اس نے یہ کہہ کر خود کو
سنبھال لیا تھا شاید اس میں خداوند کریم کی کوئی مصحت چھپی
ہو۔۔ اُس دن کے بعد ایک دن دو دن پورے پانچ دن گزر
گئے تھے لیکن مجھے اس اسٹاپ پر وہ بچہ نظر نہیں آیا تھا میں
چند دوسرے گلاب فروش بچوں سے پوچھا بھی تھا سب نے لا
علمی کا اظہار کیا تھا ان میں سے ایک بوا تھا صاحب ہم دو بچے
چھٹی کر کے گھر چلے جاتے ہیں اسی وقت کوی بچہ گلاب بیچنے
آیا ہو گا۔ پانچ دن اور پھر پانچ دن ار گزر گئے ہر دن میری
نگاہیں اس بچے کو تلاش کرتی تھی۔ جیسے اس سے میرا کوئی
ناطہ جڑنے والا ہو مگر وہ مجھے کہی بھی نظر نہیں آتا تھا اس بات
کا ذکر میں نے اپنی بیوی سے بھی کیا تھا وہ بولی تھی آپکو بچے کو
یوں ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا کیا پتہ اسے سچ میں پیسوں کی
ضرورت ہو۔۔ آج بیسواں دن تھا سڑک کے درمیان میں
مجھے گاڑی روکنا پڑی تھی کیونکہ سڑک پر چند لوگوں کا ہجوم
جمع تھا پہلے میں کچھ دیر گاڑی میں بیٹھا رہا تھا پھر میں ناچاہتے
ہوئے بھی گاڑی سے باہر نکلا تھا میرے قدم خود بخود ہجوم کی
طرف بڑھنے لگے تے جب میں ہجوم کے پاس پہنچا تھا میرے
کانوں میں آواز پڑی تھی۔ کوئی لاوارث بچہ ہے سڑک
کراس کرتے ہوئے گاڑی سے ٹکرا گیا ہے یہ سنتے ہی میں جلد
ی سے آگے بڑھا تھا میں ڈاکٹر تھا دیکھنا میرا فرض تھا مجھے سر
پر آسمان گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا جب میں نے دیکھا تھا یہ تو
وہی گلاب والا بچہ ہے جیسے میں اتنے دنوں سے تلاش کر رہا تھا
میں نے جلدی سے بچے کی نبض چیک کی تھی جس کا چلنا اس
بات کا ثبوت تھا بچہ زندہ ہے میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا

تھاہوس پیٹل آنے کے بعد پورے ایک دن بعد بچے کو ہوس آیا تھاہوس میں آنے کے بعد بچے کے منہ سے پہلا جملہ ہی نکلا تھاماں تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہو۔ مکمل ہوس میں آنے کے بعد جب بچے کی پہلی نظر مجھے پر پڑی تھی اس پہلی نظر میں مجھے اپنے لئے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں نے بچے کو پکارا تھا بچے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا تھا اس 8 سال کے بچے نے پل بھر میں مجھے اپنی غلطی کا احساس دلایا تھا۔ پھر میں نے اپنی بیوی کو بچے کے بارے میں بتایا تھا وہ دوڑی دوڑی ہوس پیٹل آئی تھی اور ایک ماں کی طرح بچے کا خیال رکھا تھا تین دن گزر جانے کے بعد بھی مجھ میں اتنی ہمیت نہیں تھی کہ میں اس چھوٹے سے بچے سے اسکی ماں کے بارے میں پوچھتا کیونکہ بے ہوشی کی حالت میں بچے کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سے میں اندازہ لگا چکا تھا لیکن میں چاہتا تھا میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو جاے اسی لئے میں نے اپنی بیوی سے سب معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا لیکن میری بیوی جھٹ سے بولی تھی کیا آپکو نہیں معلوم، اسکی ماں مر چکی ہے میں تو سمجھی تھی آپکو سب پتہ ہے اسی لئے میں نے آپکو کچھ نہیں بتایا۔ یہ سب سن کر میں نے خود کو زمین میں گڑھتا ہوا محسوس کیا تھا ندامت سے میری آنکھیں جھک گئی تھی سوچا کاش میں اس دن مرجھائے لال گلاب، تروتازہ لال گلاب سمجھ کر خرید لیتا تو شاید اسکی ماں زندہ ہوتی کیا ساری غلطی میری ہی تھی اس دن کیا اس دن سب بڑی بڑی گلاڑیوں والے پریشان تھے جو کسی نے اس بچے سے گلاب نہیں خریدے تھے یاسب نے مرجھائے لال گلاب کہہ کر چھوڑ دیا تھا۔

موبائل کی بیل بجی۔ ماضی سے حال میں پہنچنے میں ایل پل نہیں لگا تھا میرا بیٹا پھر سے کال کر رہا تھا میں نے موبائل کو سپیکر پر ڈال دیا۔

میرا بیٹا کہہ رہا تھا بابا آپ ابھی تک گھر نہیں پہنچے میں کب سے آپکا انتظار کر رہا ہوں۔ اور بابا آپ میرا گفٹ تو لا رہے ہیں نا۔ آپکو پتہ ہے نا۔ آپکے زین کو کتنے پسند ہیں۔ جی بابا کی جان میں لا رہا ہوں بہت سے میں ساتھ سیٹ پر رکھے لا گلابوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جن میں میرے زین کی جان بستی تھی۔

آج میں دل سے خوش تھا۔ کیونکہ اب مجھے یقین تھا زین کے دل میں میرے لئے کوئی گلہ نہیں ہے زین نے مجھے دل سے اپنالیا ہے ورنہ زین نے کئی مہینوں تک مجھ سے بات نہیں کی تھی جب میں اور میری بیوی اسے ہوس پیٹل سے اپنا بیٹا بنا کر گھر لائے تھے۔

اٹھ بھی جاؤ کہ کہیں دیر نہ ہو جائے

محسن عتیق

کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ والدین کا غم آنکھوں میں اُتارے وہ بستر پر لیٹے چھت کو دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک اُسے سسکیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

وہ پھر سے آگے تھے۔ وہ چونکا۔

اُن آوازوں میں ایک درد تھا۔ وہ اُسے کچھ بتانا چاہتے تھے لیکن وہ سمجھ نہیں پاتا تھا۔ جب سے اُس کے خاندان کو انڈین آرمی نے بربریت کا نشانہ بنایا تھا اُس دن سے لے کر آج تک وہ ان سسکیوں اور آوازوں کو سنا کرتا تھا۔ اپنے خاندان میں زندہ بچ جانے والا وہ اکیلا تھا۔ نیند آنکھوں سے خفا ہو کر بہت دور جا چکی تھی اور بھوک؟؟؟ یہ بات سچ تھی کہ اُس نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن جتنے جنازے وہ اب تک اُٹھا چکا تھا اب بھوک بھی جیسے روٹھ سی گئی تھی۔

کشمیر (پریوں کی وادی)۔۔۔! پریوں کی وادی میں یہ قتل و غارت؟؟؟ جب کوئی آپ کے گھر پر قبضہ کر لے اور آپ کچھ نہ کر سکیں تو دماغ کس طرح ماؤف سا ہو جاتا ہے وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ جہاں کرفیو لگا کر لوگوں کو اُن کی کھانے پینے کی چیزیں خریدنے سے روکا جائے۔ پریوں کا دیس ایسا تو نہیں ہوتا۔ وہاں تو ہر طرف امن ہوتا ہے۔ اُن پریوں کے سنہرے لباسوں کو خون کے رنگ میں نہیں رنگا جاتا۔ اُن پریوں کی آنکھوں سے نکلتے موتیوں کی قدر و قیمت میں یوں کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیا ہو گیا ہے اس وادی کو؟؟؟ کیا پریاں اپنے دیس کو چھوڑ کر جا چکی ہیں؟؟؟ نہیں وہ ایسے نہیں جا سکتیں۔ اپنے دیس کو بھلا کون چھوڑتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے

ہی سوال کر کے اپنے آپ کو ہی جواب دے رہا تھا

۔کیوں؟؟؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔

وہ بستر سے اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ سامنے گیسٹ روم کے دروازے سے ہلکی سی روشنی باہر آ رہی تھی اور ساتھ میں لوگوں کے بات کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھی۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح اُس کے ذہن میں لپکا۔ وہ دن جب انڈین آرمی نے اس کے گھر والوں کو اسی گھر سے باہر نکال کر شہید کیا تھا۔ وہ اپنے بستر کے نیچے چھپ گیا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ انڈین آرمی کے کسی فوجی کی نظر اُس پر نہیں پڑی۔ اُس کے چاچو بازار میں تھے سو وہ بھی بچ گئے تھے۔ لیکن وہ مہمان جو اُس وقت بھی گیسٹ روم میں تھا اُسے کسی نے کیوں کچھ نہیں کہا؟؟؟ کیا وہ بھی بستر تلے چھپ گیا تھا کیونکہ اُس کے بقول تو وہ پاکستان سے اُن کی مدد کیلئے آیا تھا۔ اُس کا ذہن اُلجھ سا گیا۔

ان خیالات کو جھٹک کر وہ گیسٹ روم کی طرف بڑھنے لگا۔ لوگ اب باہر نکل رہے تھے یہاں تک کہ کمرا خالی ہو گیا۔ اب اُس کے اور ولید لغاری کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ولید لغاری ہاں یہی تو نام تھا اُس کا۔ پتہ نہیں اصلی نام تھا یہ نہیں کیونکہ اُس کہ مطابق وہ آئی ایس آئی کا ایجنٹ تھا اور ایجنٹ کبھی اپنا اصلی نام نہیں بتاتے۔ وہ اُن کے گھر پچھلے ایک ماہ سے رہ رہا تھا لیکن وہ اس کے کمرے میں کبھی نہیں گیا تھا۔ بڑی آنکھیں، گندمی رنگ اور بال ہلکے سے چہرے پر آئے ہوئے جنہیں وہ بار بار پیچھے کر رہا تھا۔ وہ اب اس کی طرف متوجہ تھا۔

تمہارا نام کیا ہے؟؟؟ ولید نے پوچھا

جواب میں وہ خاموش رہا۔ وہ ولید کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہو۔ ایک ایک لفظ چہرے پر ایاں تھا جو شاید صرف اُسی کو نظر آ رہا تھا اور پھر وہ اپنی سوچوں میں کہیں اور چلا گیا جب وہ پہلی بار موت کے بہت قریب سے گزرا تھا۔ وہ بازار کی طرف جا رہا تھا جب اُسے انڈین آرمی کے اہلکاروں میں سے کسی ایک نے روکا۔ سڑک کے ساتھ ایک کچا رستہ گھنے درختوں اور پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ فوجی اُسے اپنے ساتھ چلنے کو کہ رہا تھا۔ وہ اب اُس فوجی کے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔ وہ سچ میں چہرے پڑھنا جانتا تھا۔

"وہاں لے جا کر مارنے سے بہتر ہے یہیں مار دو"۔ اُسنے بڑے آرام سے کہا۔

فوجی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ جس علاقے کی طرف اُسے لے کر جانا چاہتا تھا وہاں وہ اکثر لوگوں کو لے جا کر بہت بے دردی سے قتل کر دیا کرتے تھے لیکن یہ بات صرف انڈین آرمی کو پتہ تھی کیونکے وہاں جانے والا زندہ لوٹ کر کبھی واپس نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ لڑکا یہ کیسے جانتا تھا وہ

پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

چہرے کھلی کتابوں کی طرح ہوتے ہیں بس اُنہیں پڑھنا آنا چاہیے۔ وہ بہت اطمنان سے بولا۔

وہ جانتا تھا کہ اُس نے فوجی کو لاجواب کر دیا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ فوجی نے اُس کی جان بخش دی۔ الفاظ میں بہت طاقت ہوتی ہے اچانک اُسے اپنے ابو کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی جو اکثر وہ اُسے کہتے رہتے تھے لیکن اُن الفاظ کا حقیقی مطلب وہ آج جانا تھا۔

وہ بغیر کسی بات کا جواب دیے ولید کے کمرے سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کھڑکی سے چاند کی روشنی چھن چھن کر در آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے چاند کو دیکھنے لگا۔ سرخ چاند۔۔۔! خون میں نہلایا ہوا۔۔۔ جیسے اسے بھی کسی بندوق سے نکلی ہوئی گولیوں نے چھلنی کیا ہو۔ کافی دیر وہ اور چاند ایک دوسرے کو اپنے دکھڑے سناتے رہے۔ اچانک ایک ہیولا کھڑکی کے سامنے سے گزرا۔ بے شک وہ اُسے جانتا تھا۔ اُسنے گھر میں پڑا ہوا ایک تیز دھار چاکو اُٹھایا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ چلتا جا رہا تھا اچانک ایک گلی کے کونے پر اُس کے قدم منجمد ہو گے۔ وہ اُس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔۔ ولید لغاری کی آواز کو۔۔۔! وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

یہ لوگ پھر سے آزادی کی تحریک نکالنے کی سوچ رہے ہیں۔ بہت ڈھیٹ لوگ ہیں یہ۔ پورے خاندان کو کتے کی موت مارا ہم نے لیکن اب یہ پھر سر اُٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مرنے کا بہت شوق ہے انہیں۔ آپریشن کی تیاری کرو ایک بار پھر خون کی ہولی کھیلنی ہے۔

اُس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ اچھا تو یہ تھا اُس کے خاندان کا قاتل۔۔۔! وہ آئی ایس آئی کا نہیں را کا ایجنٹ تھا۔ اپنی صفحوں میں پاے جانے والے دشمنوں سے وہ نفرت کرتا تھا۔ چاقو پے اُس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ولید اب واپس آ رہا تھا۔ اس چاندنی رات میں وہ نہ صرف اُسے دیکھ سکتا تھا بلکے اُس کے قدموں کی چاپ بھی با آسانی سن سکتا تھا۔ قدموں کی چاپ قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ وادی دشمن کی چیخوں سے لرز پڑی۔ وہ پے در پے ولید پر چاکو کے وار کر رہا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اُس نے اُفق پر چمکتے چاند کو دیکھا جس کی سرخ رنگت اب پہلے سے کم ہو چکی تھی جیسے کسی نے اُس کے زخموں پر مرہم رکھا ہو۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

اچانک بندوق نے ایک شولا اگلا اور اگلے ہی لمحے گولی اُس کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گ ء۔ وہ زمین پر ایسے گرا جیسے کسی نے اُسے اُٹھا کر زمین پر پٹخا ہو۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ایک بار پھر سسکیوں کی آواز اُسے

سنائی دینے لگی۔ وہ اُسے واپس لے جانے آے تھے۔ گولی کی آواز نے ہوا میں ایک ارتعاش پیدا کیا تھا۔ ایک خوف کی لہر پرندوں میں بھی پھیل چکی تھی۔ وہ بھی اپنے گھونسلوں سے باہر نکل آے تھے۔ یہ منظر اُن کیلیے عام تھا لیکن آج اُن کی بے چینی کچھ زیادہ ہی تھی۔ شاید اُنہیں بھی اس لڑکے سے اُنس ہو گیا تھا۔ ان فرشتہ صفت لوگوں پر ڈھاے جانے والے ظلم کے گواہ وہ بھی تھے جو اپنی ہی بولی میں کیے جانے والے ظلم کی گواہی دے رہے تھے۔ اگر کوئ اُن کی بولی کو سمجھ پاتا تو کچھ الفاظ تھے جو وہ بار بار دہرا رہے تھے۔

وہ تم سے مخاطب تھے پاکستانیوں۔۔۔! وہ کہہ رہے تھے اُٹھ بھی جاؤ کہ کہیں دیر نہ ہو جاے۔ آآج کل جنگ سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ دشمن کے پاس کتنا اصلحہ ہے۔۔۔ کتنی فوج ہے؟؟؟ ہم شاید غزوہ بدر کو بھول چکے ہیں جہاں ۳۱۳ کا مقابلہ ۱۰۰۰ سے تھا۔ جنگ اصلحے کے دم پر جیتی جاتی ہے نہ ہی زیادہ فوج کے دم پر۔ یہ مغرب کی سوچ ہے۔ جنگ صرف خدا پر توکل کر کے جیتی جاتی ہے۔ ایک کامل مسلمان بن کر جیتی جاتی ہے۔ ٹھیک ہے ہم میں کوی عمر نہیں، کوئ ابو بکر نہیں، کوی علی نہیں لیکن اُن کی تعلیمات تو ہیں۔ اُس راہ پے چلنے کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ کافروں کے مقابلے میں خدا تمہارا ساتھ چھوڑ دے گا؟؟؟ ارے وہ اگر چھوڑ بھی دے تو ایک ذات ہے جو تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑ سکتی اور وہ ہمارے نبی کی ذات ہے۔ فتح تمہاری ہو گی بس ایک قدم تو بڑھاؤ۔۔ا

کشمیر تمہارا منتظر ہے۔۔۔!

علی، احمد اور داستانِ دل

علی: داستانِ دل کب تک ڈائجسٹ کی شکل میں آئے گا؟

احمد: یار سب کچھ تیار ہے بس قانونی کاروائی رہتی ہے جب تک گورنمنٹ اجازت نہیں دیتی اور ہمارے داستانِ دل کو رجسٹرڈ نہیں کرتی تب تک یہ آن لائن پاک سوسائٹی پر شائع ہو رہا ہے۔

علی: اچھا۔۔۔!! تو پھر یہ بتا کہ اس میں کتنا وقت لگے گا؟

احمد: بے فکر رہ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تب تک اس طرح کر تُو کچھ لکھ کر بھیج ہی دے تا کہ تیری تحریر اولین شمارے کی زینت بنے۔

علی: یہ تو تُو نے بہت خوب کہا، میں ابھی ایک تحریر لکھ کر بھیج دیتا ہوں۔

ساری کائنات میں آگ لگی ہوئی تھی آسمان سے پھوار کی مانند آگ برس رہی تھی آگ کے پھول اس کے جسم پر رہ رہ کر گر رہے تھے اور جسم داغ داغ کیے دے رہے تھے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ عافیت کا کوئی ایسا کنج نہ تھا جہاں وہ چھپ سکتی وہ چیخنا چاہتی تھی۔ چلانا چاہتی تھی۔ مگر دھوئیں میں اس کی آواز تحلیل ہو کر رہ گئی تھی چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور ایسے میں نہ جانے کہاں سے یادوں کا ایک سیلاب سا اُوڑ آیا تھا۔ اُسے اپنی گزری زندگی کا ایک ایک لمحہ صاف اور روشن نظر آ رہا تھا۔ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اس وقت یہ سب کیسے یاد آ گیا یا شاید ہم کنار شخص کو گزری زندگی بہت صاف نظر آتی تھی۔ "خدا جانے سکون کی تلاش کون لوگ کیا کرتے ہوں گے۔" ایان نے جھجلا کر سوچا۔ بھیا اور بھابی اپنی دو عدد صاحبزادیوں کے ساتھ ایک شادی میں گئے ہوئے تھے اور اس خاموشی کو توڑنے کے لیے ایان سارے ممکن اقدامات کر کے دیکھ چکی تھی۔ چائے، کافی، شکنجویں سب کچھ پی لیا اب کیا جائے۔" اس سوال نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ برآمدے میں آ گئی سامنے لان میں ہری بھری گھاس بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کا اثر بڑا دل خوش کُن سا تھا واقعی انسان اگر فطرت کا عاشق ہے تو غلط تو نہیں۔ کس قدر حُسن ہے کاش میں ایک پھول ہوتی شاخ پر مچل مچل کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی اور خوب اتراتی اور پھر خزاں کے ہاتھوں زمین کی پینائی میں اُتر جاتی۔

"میں یقیناً قنوطی ہوتی جا رہی ہوں" اُس نے بڑے افسوس سے سوچا" شاید یہ تنہائی کا اثر ہے ظاہر ہے کوئی اتنے بڑے

دھنڈار گھر میں اکیلا پڑا ہو تو خوبصورت سوچیں تو آنے سے رہیں۔" اچانک لان کے پچھلے حصے کے گیٹ کو حرکت ہوئی اور پھر ایک سایہ سا اندر داخل ہو گیا آنے والا نہایت تند ہی سے برآمدے کی جانب آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر خون خشک ہو گیا تھا ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے نگاہوں میں اشتہارت کی موٹی موٹی سرخیاں گھومنے لگیں "ڈاکو نے ہلاک کر دیا۔"

"خیر مشہور تو ہو جاؤں گی "اُس نے اس عالم میں بھی دل کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ خانساماں بھی گھر میں نہیں یہ خیال آتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکلنے لگیں۔ لیکن جب اس نے اپنے سامنے ایک اچھے خاصے معقل شخص کو حیران و پریشان کھڑا دیکھا تو شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ اجنبی بڑی حیرانی سے خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا یہ اسرار حسین کا گھر نہیں ہے؟ بلآخر اس نے بدلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں مسز اسرار کا کزن زمان امجد ہوں آنا مجھ کل تھا۔ مگر آج آ گیا ہوں شاید اس وجہ سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے"

اس کا اشارہ شاید چیخ و پکار کی طرف تھا۔

"نہیں وہ دراصل"

ایان کافی دیر تک اسے یقین دلاتی رہی کہ وہ ایسے ہی بس چیخ پڑی تھی اور زمان بڑی سنجیدگی سے یہی کہتے رہے کہ کوئی بات نہیں ایسا ہوتا ہے۔ دن انتہائی بور گزر رہے تھی امتحان کے بعد رزلٹ کا انتظار دنیا کا سب سے بور ترین کام ہے۔

ایان کا یہ دعوی تھا تو ویسے بھی بہت پریشان کُن ہوتا ہے۔ مگر ایان کے لیے یہ کچھ زیادہ ہی مشکل تھا۔ بچے اسکول چلے جاتے بھابی گھر کے کام کاج میں الجھی رہتیں اور زمان احمد وہ صبح دفتر جاتے اور شام کو واپس آکر خاموش بیٹھے رہتے ایان کا خیال تھا کہ وہ یقیناً مُنہ پر تالا لگا کر چابی بڑی احتیاط سے کہیں چھپا کر آتے ہیں۔ یہ خاموش ماحول اسے سخت کھلتا۔

"آپ کا یہ کزن سخت گھنا قسم کا آدمی ہے۔" وہ بڑی بھابی سے کہہ رہی تھی۔

" بھی تم کیوں پریشان ہوتی ہو جیسا بھی ہو۔" بھابی ہنس کر بولیں۔

"یا تو یہ شخص ہمیں اس لائق نہیں سمجھتا کہ بات کرے یا پھر اس میں کوئی خرابی ہے۔" وہ اصرار کیے گئی۔ " مگر مسلہ یہ ہے کہ تمہیں کیا؟"

"واہ ہمیں کیسے نہیں مجھ سے کوئی غلط چیز برداشت نہیں ہوتی اور یہ آدمی تو پورا کا پورا غلط ہے ہمارا فرض ہے کہ غلط چیزوں کو صیح کریں۔"

"اسے صیح کرنے کو کوشش نہ کرو تو بہتر ہے یاد نہیں ہے اس دن گاڑی کا پہیہ پنکچر ہو گیا تھا تو کیا صیح کیا تھا تم نے دو میل پیدل چلنا پڑا تھا۔" بھابی مسکرائیں اس میں اور بھابی میں بہت بے تکلفی تھی۔

" نہیں بھابی اب کل کی بات لے لیں اتنا اچھا موسم تھا پھوار پڑ رہی تھی اور وہ آپ کے کزن صاحب مجھے ریاضی کے اصولوں کے بارے میں بتا رہے تھے بھئی آدمی کم از کم موسم

کا ہی خیال کر لے۔"
"تو تم کیا چاہ رہی تھیں رومانٹک باتیں کرتے۔" بھابی نے چھیڑا۔
"اللہ توبہ میری قسمت میں ایسا بھیانک رومانس رہ گیا ہے۔ ریاضی کے سوالوں جیسا مشکل اور پیچیدہ۔ آپ مانیں نہ مانیں مگر اس آدمی میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے جیسے دیکھ کر میرا بلڈ پریشر بڑھنے لگتا ہے۔ وہ اُسی طرح سر ہلا ہلا کر بول رہی تھی۔
"بس ایک بات کا خیال رکھا کہ اُسے صیح صیح کرتے خود غلط نہ ہو جانا۔" بھابی شرارت سے مسکرائیں "ویسے زمان بہت اچھا لڑکا ہے مجھے تو بہت پسند ہے خاموش طبعیت کا مالک۔ بھابی کہہ کر چلی گئیں۔
وہ حیرت سے بھابی کو جاتے دیکھتی رہی "توبہ ہے بھابی تو بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں میں اور محبت" وہ سر جھٹک کر ہنس پڑی جن لوگوں کو سر اونچا کر کے چلنے کی عادت ہو اور عزت کو بڑی چیز سمجھتے ہوں ان کے محبت کرنا ویسے بھی بہت مشکل کام ہے اور یہ محبت تو انسان کو ذلیل کروا دیتی ہے۔ اسے ہمیشہ سے روتی بسورتی گڑگڑاتی محبت سے بڑی چیڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ محبت بہت عظیم جذبہ ہے۔ پوری دنیا سے بڑا جذبہ ساری خدائی اس میں سما جاتی ہے۔ خیر بھئی جو بھی ہو محبت مجھے کیا۔
میں کس چکر میں پڑ گئی۔"
وہ سر جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

پچھلے ایک ہفتے سے ایان سخت پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں اا رہا تھا معاملہ کوئی ایسا سخت تو نہ تھا اگر رشتے داری نہ ہوتی ابھی آٹھ روز قبل وہ اچھی بھلی بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی کہ حیدر نے اسے اگر بتایا کہ ماموں جان نے اسے بلایا ہے۔ پہلے تو وہ حیران ہوئی۔ پھر بھابی کو بتا کر حیدر کے ساتھ اس کے گھر جانے کو تیار ہو گئی۔ معاملہ تو تب کھلا جب حیدر نے گاڑی برگر پوائنٹ کے سامنے روک لی اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی اب تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید حیدر کو کوئی کام ہے جب چند لمحے یونہی گزر گئے تو اس سے نہ رہا گیا۔
"کیا بات ہے حیدر یہاں کیوں رُک گئے؟"
"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" حیدر نے سیٹ پر ٹیک لگا کر کہا۔
"یعنی تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا ماموں جان کے بلانے کے بارے میں" اسے شدید دکھ پہنچا تھا۔ "تم میرے کزن ہو اگر بغیر بہانے کے بھی مجھ سے یہ کہہ دیتے کہ تمہیں مجھ سے کوئی بات کرنی ہے تو میں منع کر دیتی اور اس صورت حال میں میں کوئی بات نہیں سن سکتی مجھے گھر چھوڑ آؤ۔"
"بات تو تمہیں سُننی پڑے گی۔" حیدر سٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں خود گھر نہیں جا سکتی؟" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔
"جا سکتی ہو مگر، اگر میری بات سن لو گی تو کیا حرج ہو جائے

گا۔ یہ بتادو یہاں سڑک پر تماشا بنوانا اچھا لگ رہا ہے تمہیں؟" وہ حیدر کے جملوں سے اس کا مطلب سمجھ گئی۔

"تم اتنا گر جاؤ گے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ خیر بولو کیا کہنا ہے تمہیں؟"

"بات اتنی خوبصورت ہے اور مُنہ تم نے ایسا بنایا ہوا ہے ایان پرسوں جب تم ہمارے گھر آئی تھیں اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے تم سے اب بات کر ہی لینی چاہیے۔"

جیسے اس کے بغیر تو آپ مر ہی جاتے۔

"ایان تم نے کبھی محبت کے بارے میں سوچا ہے؟"

"میں دراصل مصروف زیادہ رہتی ہوں گھر میں ویسے بھی ڈاکٹر نے مجھے سوچنے سے منع کیا ہوا ہے۔"

"میر طرف دیکھو۔"

"میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں اس لیے میں کسی کی طرف نہیں دیکھتی۔تکلیف ہونے لگتی ہے آنکھوں میں۔"

"مذاق چھوڑو، یہ بتاؤ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔"

"جیسے سب بھائی لگتے ہیں۔" وہ آرام سے بولی۔

"آخر کیوں مسترد کر رہی ہو تم مجھے؟" وہ یکدم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"تم لڑکے سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ دس فلرٹ کرتے ہو اور پھو معصوم بن کر محبت کا ڈھونگ رچانے چلے آتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے محبت کتنی شدت پسند ہوتی ہے۔ سچی محبت کرنے والے یہی چاہتے ہیں کہ ان کا محبوب صرف ان ہی کا محبوب ہو، صرف انہیں دیکھے، انہیں سراہے، اس پر وہ اعتماد کر سکے۔ یہ یقین ہو کہ ہر مشکل سے یہ شخص ہمیں بچالے گا۔ چھپالے گا۔ جس شخص پر یقین ہی نہ ہو۔ جس کی محبتیں مشکوک ہوں۔ جس کے نام کے ساتھ سونا وابستہ رہ چکے ہوں، کیا اس پر یقین ہو سکتا ہے میں کسی ایسے شخص کا تصور بھی نہیں کر سکتی سمجھے تم۔"

"مجھے کوئی واضح جواب چاہیے، میں کسی صورت میں انکار نہیں سننا چاہتا، نہ مجھے اس کی عادت ہے،" حیدر ضد سے بولا۔"

"کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟"

یہ سوال ایان کے دماغ کو ہلا گیا۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ صاف صاف سنادے۔ مگر پھر ذہن نے مشورہ دیا کہ اگر بات اس طریقے سے بن سکتی ہو تو اسے بگاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ حیدر ان معاملات میں خاصا بدنام ہے۔ اگر کوئی مشکل کھڑی کر دی تو کیا ہو گا۔ پھر خاندان کا معاملہ ہے۔ اور بھائی جان ویسے بھی غصے کے بہت تیز ہیں سو اس نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

"ہاں"!

"کون ہے وہ؟"

"جو بھی ہے تمہیں اس سے کیا، تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے جو میں نے بتا دیا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"بتاؤ کون؟"

اور جانے بے اختیاری میں اس کے لبوں سے زمان احمد پھسل گیا۔ وہ ابھی اپنی اس حرکت پر حیران ہو رہی تھی کہ حیدر کی

آواز اس کانوں میں پڑی۔

"جبھی وہ یہاں آ کر رہ رہا ہے۔"

پھر راستے بھر دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی، یہ بات اتنی کم اہم بھی نہیں تھی کہ وہ پی جاتی اور ایسی بھی نہ تھی کہ گھر میں بتائی جا سکتی اس لیے وہ شہنا کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ شہنا کے آتے ہی وہ اُسے اپنے کمرے میں لے گئی اور ساری تفصیل اُسے بتائی۔

"حیدر تو اس معاملے میں بہت ہی گری ہوئی نیچر کا آدمی ہے تم نے زمان بھائی کا نام لے کر اچھا نہیں کیا۔" وہ فکر مندی سے بولی۔

"پھر میں کیا کرتی؟" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"دیکھو نا وہ یہاں نئے ہیں، پھر اتنے سیدھے سارے ہیں اگر حیدر اپنے دوستوں سے اُن پر حملہ کروا دے تو؟" اوہ یہ خیال تو اسے آیا ہی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہو گیا تو، اس خیال نے اسے دہلا دیا۔ پہلی بار زندگی میں کسی کے لیے محبت کا ایسا جذبہ اس کے اندر جاگا تھا کہ ایک خیال اسے سر تا پا وہلا جائے۔ آنکھوں سے آنسو بن کر رواں ہو جائے۔ انگ انگ میں ناچتا پھرے۔ شہنا اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

"شہنا! اگر ایسا ہو گیا تو مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ حیدر سے کہہ دوں کہ میں نے جھوٹ کہا تھا۔"

"اس طرح تو تم اپنے لیے اور مشکلات پیدا کر لو گی۔ ایسا کرو کسی طرح زمان بھائی کو بتا دو کہ یہ معاملہ ہے تا کہ وہ ہوشیار رہیں اور کوئی بات غلط نہ ہو۔"

نظم (پہلا حصہ)

ہم لوٹ کر نہیں آئے گے
سنوں تم سے ایک بات کہنی ہے
جاناں
اب ہم لوٹ کر نہیں آئے گے
بس اتنا یاد رکھنا تم
اب بھول جاؤ ہمیں جاناں
کسی گماں میں بھی مت رہنا تم
کہ اب ہم تمہارا در کھٹکھانے گے
اب وہ دن ماہ و سال گزر گے
جاناں
جب ہم محبت کا کشکول لے آتے تھے
در پر تمہارے بار بار جاناں
آنسوؤں بھری فریاد لے کر جاناں
تم ہمیشہ اپنی فرعونیت کے نشے میں
اپنی ذات کے غرور میں جاناں
تم نے کبھی یہ سوچا ہے جاناں
خود مھبت تم سے اک دن اپنا انتقام لے گی
اپنا آپ منوالے گی جاناں
ہمیں یہ یقین ہے محبت پر جاناں
محبت کی ناقدری کر کے جاناں

(جاری ہے یہ خوبصورت نظم، باقی پڑھیں اگلے صفحے پر)

"مگر میں کس طرح بتاؤں گی۔" وہ پریشان ہو گئی۔
"اب یہ تو تمہاری ذمہ داری ہے اتنا ذرا سا کام نہیں کر سکتیں تم؟"
"ٹھیک ہے بتا دوں گی۔" اب بات انا پر آ گئی تھی۔
شام کو جب اُس نے رُکتے رُکتے زمان کو ساری بات بتائی تو وہ اپنی نرم اور خاموش نظروں سے اسے تکتے رہ گئے لبوں سے انہوں نے اتنا ہی کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ مگر ان کی آنکھیں ایان سے مختلف سوالات کر رہی تھیں۔ ایان حد سے زیادہ پریشان تھی۔ شہنا اسے ڈرانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔
"اگر اُس نے آپ کو پریشان کیا تو؟"
"کچھ نہیں ہوتا آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ دھیرے سے بولے۔ "مگر یہ کہ آپ کا پریشان ہونا مجھے بھلا لگ رہا ہے۔
"یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلے گئے۔ ایان سوچتی رہ گئی۔ کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا وہ۔۔؟ نہیں ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا مگر پھر اس کا خیال کیوں۔ اس کے قدم پکڑے ہوئے ہے جو اس کی سانسوں میں بس گیا ہے۔ اس کا جی زمان سے گفتگو کرنے کو کیوں مچلتا ہے اس کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں سے آ گیا جو وہ زمان کی یادوں میں ضائع کر دیتی ہے۔ اور ان تمام سوچوں کا اختتام یہاں ہوتا تھا کہ زمان بھی اُسے پسند کریں گے؟ کیا کبھی وہ سب کچھ ہو سکے گا جو اس نے چاہا ہے وہ انہی خیالوں میں گم برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو زمان سامنے کھڑے تھے۔

(بقیہ: دوسرا حصہ)
بھلا کون خوش رہا ہے کبھی
تو ہم یہ کیسے مان لیں جاناں
تم خوش ہو بہت
تم سکون میں نہیں ہو جاناں
ہمارا دل پل پل یہ گواہی دیتا ہے
تم چاہے لاکھ تاویلیں دو خود کو
سب کو جھٹلا سکتے ہو جاناں
مجھے کیسے جھٹلاؤ گے جاناں
خود سے کیسے بچو گے جاناں
جس دن تمہاری ذات کا پندار جاناں
تمہارا غرور ٹوٹ کر چکنا چور ہو گا
جاناں
کیسے میں تمہیں دیکھ پاؤں گی
خود کیسے روگ پاؤ گی جاناں
لیکن یہ دستور ہے محبت کا جاناں
محبت خود اپنا انتقام لیتی ہے
مھبت میں ظلم کرنے پر
سزا سے جاناں کب کون بچا ہے
تم بھی مان لو ناں جاناں
(یہ طویل نظم ابھی ختم نہیں ہوئی تیسرا حصہ اگلے صفے پر)

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُم مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

"اس محویت سے کیا سوچا جا رہا ہے۔"

"کچھ بھی تو نہیں۔" وہ گڑبڑا گئی۔

"پھر بھی۔" وہ ہنس پڑے ان کی آنکھیں صاف کہے دے رہی تھیں کہ ہمیں معلوم ہے تم کیا سوچ رہی تھیں، تم کیا سوچتی ہو۔

"ایان! کیا زندگی میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو چاہا جائے؟" وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ہاں اگر انسان میں سچی طلب ہو۔ یقین کامل ہو تو ضرور مل جاتا ہے۔" وہ یقین سے بولی۔

"سچ کہہ رہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ حوصلہ دے کر تم راستہ بدل جاؤ۔" وہ دھیرے سے بولے۔

ایان خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

"مجھے خبر ہے تم سچی لڑکی ہو۔ جھوٹ نہیں بولو گی اور اگر بولو گی بھی تو تمہاری آنکھیں تمہارے راز عیاں کر کے رکھ دیں گی۔"

ایان سر جھکا کر ہنس پڑی۔ دل تو بہت چاہا کہ یہ بتا دے کہ جتنی سچی وہ خود ہے اتنے ہی سچ کی توقع بھی کرتی ہے۔ جس چاہ سے محبت کی وادیوں کی جانب قدم اس نے بڑھائے ہیں اسی چاہ کو ان کی آنکھوں میں بھی دیکھنا چاہتی ہے۔ اور بیگانگی کا ایک لمحہ، نظر انداز کیے جانے کا ایک احساس بھی اسے توڑ کر رکھ دے گا۔ ختم کر دے گا۔ مگر لبوں سے کچھ نہ کہہ سکی بس خاموشی سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

وہ آدھے گھنٹے سے اپنے کمرے میں بند تھی۔ غصے کی شدید

(بقیہ تیسرا حصہ)

تم بھی مجرم ہو میری محبت کے
میری وفاؤں کے جزیوں کے قاتل ہو
کچی عمر میں آنکھوں میں بستے خوابوں کے
محبت مر گئی جاناں
جسکی موت کا ماتم جاناں
ہم ہر رات مناتے ہیں
جسکی لاش کی جاناں
ہم تڑپتے ہیں نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
جسکی ہو ہمارے اطراف میں پھیلی ہوئی ہے جاناں
تو اب تمہی کہوں جاناں
اب ہم کیسے لوٹ کر آئے
محبت تو مان تھی جاناں
اس پاگل لڑکی کی زندگی کا کل اثاثہ
محبت تو غرور تھی جاناں
جو تم نے توڑ دیا کب کا
تو وہ مر چکی اب جاناں
اب ہو لو جاناں
ہم کیسے لوٹ کر آئے

از قلم شازیہ کریم

☆ ☆ ☆

کیفیت طاری تھی۔ دو گھنٹے سے زمان کا انتظار کر رہی تھی اور وہ آئے بھی تو کتاب لے کر بیٹھ گئے تھے۔ غصے اور بوریت نے مل جل کر اس پر بیزاری طاری کر دی تھی۔ آخر کار اس نے یہی سوچا کہ شہنا کے گھر چل کر کوئی پیکچر دیکھی جائے۔ کچھ تو دل پسلے۔ یہ سوچ کر گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل کھڑی ہوئی۔ گاڑی باہر نکالتے ہوئے اسے زمان نظر آئے جو اس کے قریب آ گئے تھے۔

"کہاں جا رہی ہیں؟"

"پیکچر دیکھنے۔" اس نے نہایت کم گوئی کا مظاہرہ کیا۔

اگلا دروازہ لاک تھا۔ زمان پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو فلموں کا اتنا شوق ہے۔

خاموش رہنا ایان کے بس کی بات نہیں تھی۔

"مجھے فلموں کا شوق نہیں۔ بس آپ کے ساتھ آنے کا شوق تھا۔" زمان دھیرے سے بولے۔ ہونٹوں پر مذاق اڑانے والی مسکراہٹ تھی۔

ایان ابھی اس مسکراہٹ پر غور کر کے جواب دینے والی ہی تھی کہ اسے سڑک پر کوئی چیز پڑی نظر آئی۔ اس نے اچانک بریک پر پاؤں رکھا۔ چند لمحوں کو ایسا لگا جیسے گاڑی زمین کے اندر چلی جائے گی۔ زمان جو اطمینان سے پیچھے بیٹھے تھے اچانک اچھل کر اگلی دو سیٹوں کے درمیان پھنس گئے۔ ایان جلدی سے گاڑی سے اتری اور دوڑتی ہوئی سڑک پر پڑی چیز کے پاس جا پہنچی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔

"اُف! یہ کون ہے یہاں کیوں پڑی ہے؟" ایان سخت حیران تھی۔

"اسے یہاں سے لے چلیے ورنہ کچھ دیر بعد یہ ماضی بن جائے گی۔" زمان دھیرے سے بولے۔

"تو اٹھایئے اسپتال لے کر چلیے۔" اسپتال پہنچ کر ایان نے فی البدیہہ جھوٹ بول کر ڈاکٹروں کو مطمئن کیا کہ میری کزن ہے گاڑی کے سامنے آ گئی ہے۔ جب ڈاکٹر مطمئن ہو گئے تو وہ اسے گھر لے آئے۔ ابھی اسے ہوش نہیں آیا تھا مگر لگتا تھا کہ کسی بہت بڑے صدمے سے گزری ہے ہوش میں آنے پر اس فقط اتنا بتایا کہ اس کا نام زرقا ہے اور کچھ اسے یاد نہیں۔ ایان کو یہ خوبصورت سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ گڑیا جیسی وہ اس کے بولوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

"زرقا! تم کتنی اچھی ہو یاد رکھو دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اچھے بھی اور بُرے بھی، خوشی بھی ملتی ہے اور غم بھی۔ غم کے دن تو تم نے گزار دیے اب خوشیوں کی باری ہے کچھ دن بعد تم خود سوچو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ تم نے اتنی خوبصورت زندگی کا خاتمہ کرنا چاہا تھا پھر تم جینا چاہو گی، خوش رہو گی۔"

زرقا آہستہ آہستہ پُرسکون ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ اس کی گود میں سر رکھ کر سو گئی۔

وقت کے تھال میں سکے گرتے رہے۔ زرقا اب بالکل نارمل ہو گئی تھی۔ بھائی جان نے اسے بہن بنا لیا تھا دن بہت اچھے گزر رہے تھے ہنستے کھیلتے دن۔ کبھی کبھی اس لگتا کہ زمان زرقا

کے سامنے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں مگر وہ اسے اپناو ہم سمجھ کر ٹال جاتی وہ لوگ کو بھی سیریں کرتے۔ زر قا روز بروز نکھرتی جارہی تھی اور ایان وہ پلی پلائی بہن پا کر بہت خوش تھی۔

آج وہ شام سے بہت خوش تھی۔ آج زمان کی سالگرہ تھی وہ سجی بنی زمان کو حیران کر دینا چاہتی تھی اسے بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ کمرے کے قریب پہنچ کر چند آوازوں نے اس کے قدم تھام لیے۔

"مگر زمان کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے؟ بولو جواب دو، یا تم مجھے بے سہارا سمجھ نہیں اپنانا چاہتے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں پسندیدگی پڑھی ہے۔ تبھی یہ سب کچھ کیا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے زرقا تم مجھے اچھی لگتی ہو بلکہ تم تو سب کو اچھی لگو گی کیا نہیں ہے تمہارے پاس۔"

"پھر زمان؟"

"مجھے دفتر کی طرف سے مکان ملنے والا ہے اس کے بعد میں باجی سے بات کروں گا تم بے فکر رہو۔"

یہ الفاظ نہیں تیر تھے جو ایان کے جسم میں اُتر رہے تھے آج اعتماد اور بھروسے کی چادر جو اس نے ٹانکہ ٹانکہ کر کے بنی تھی۔ تار تار ہو گئی تھی۔ اس کی محبت اس کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ ایان آنسوؤں کو روکنے پر قادر نہیں تھی اور نہ ہونا چاہتی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی ایک ہی خیال بار بار اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔

کیسے ہو گیا ہے سب کچھ محبت کی وادیوں میں اتنی جلد آگ کیسے لگ گئی۔ سب کچھ خاکستر ہو گیا۔ ضرور یہ جذبوں کا قصور ہے ورنہ جذبہ سچا ہو تو آگ بھی گلشن بن جاتی ہے یہی سوچتے سوچتے اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ جانے کتنی صدیاں اسے اس آگ کے دریا کو پار کرنے میں لگیں۔ بار بار وہ ہوش کی سرحد پر آتی اور پھر اندھیرے میں ڈوب جاتی۔ دو مہینے وہ بیمار رہی اور ان دو مہنیوں میں اس نے صرف ایک بار آنکھیں کھول کر اپنے آپ کو دیکھا۔ ہوش اور بے ہوشی کے مابین درد کی لیریں بہت بلند تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے زمین آسمان ایک پھر دھیرے دھیرے شعلے کم ہوتے ہو گئے۔

آہستہ آہستہ اس سب کچھ یاد آنے لگا اپنا آپ بھی اور دوسرے بھی ڈاکٹرز نے اسے زبردستی آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ وہ سمجھاتے کہ تکلیف کم ہوتی جائے گی۔ مگر وہ کیسے سمجھاتی کہ تکلیف کم نہیں ہو رہی بڑھ رہی ہے۔ ایسے میں اچانک زمان سامنے آ گئے۔ لٹے لٹے سے شرمندہ سے۔ شہنا ان کے ساتھ تھی۔ ان کو دیکھتے ہی ایان کو ایسے لگا جیسے زندگی کہ آس ختم ہو گئی ہو وہ ہار گئی ہو۔ زمان کچھ کہنا چاہتے تھے مگر ایان نے انہیں روک دیا۔ اور شہنا کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"شہنا محبت آسمان سے اُترا ہوا تحفہ ہوتی ہے۔ بہت بلند بہت مقدس جیسے ہاتھوں میں بھر لینے کو دل میں بسا لینے کو جی چاہتا ہے۔ محبت کوئی گری پڑی چیز نہیں نہ ہی اگر پڑ کر محبت کی جاتی ہے۔ آدمی کتنی منتیں کر لے۔ نخرے کر لے مگر اگر دل میں

محبت کے ہونے کا احساس ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ یہ روشنی کی مانند سب کچھ جگمگائے رکھتی ہے مگر جو محبت گر جائے اسے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کیچڑ سے نکالنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ رشتوں کی ڈوریوں کو گرہیں باندہ باندہ کر رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کو توڑ دیا جائے۔ اور یہہ میں نے کیا ہے۔"

وہ تھک گئی تھی۔ زمان ایک لمحے کھڑے رہے اور پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور ایان یہی سوچ رہی تھی کہ محبت وہ ہے نہ ملے تو زندگی بھر کسک اور اس کی خلش رہتی ہے جو جینے دیتی اور نہ مرنے دیتی ہے۔ اور یہی سوچتے ہوئے ایان نے آنکھیں موندلیں جیسے سوگئی ہو ایان محبت میں بے وفائی سہہ نہ سکی اور محبت کی کسک اور خلش لیے گہری نیند سو گئی تھی اس دنیا سے منہ موڑ گئی تھی اور پُر سکون ہر دُکھ، غم سے آزاد۔۔۔۔ اپنی محبت کو امر کر گئی۔

☆ ☆ ختم شد ☆ ☆

فیس بک انچارج داستانِ دل

عمران رضا بٹ، نوشین اقبال نوشی

مہوش ملک، اسماء منیر، اریشہ فاروق

منظور اکبر تبسم، مون کنول، محمد شعیب

پہلے اس کی آنکھوں کو تصویر کیا
اور پھر سارے خوابوں کو تعبیر کیا

دکھ سے میا سینہ شل ہو سکتا تھا
رفتہ رفتہ شعروں میں تحریر کیا

روز و شب جنات سے لڑنا پڑتا ہے
ایک پری کے دل کو تھا تسخیر کیا

اس نے پیار کو کتنا ارزاں سمجھا تھا
زر سے جس نے تاج محل تعمیر کیا

ڈوب گیا تھا ہر منظر تاریکی میں
ایک دیے کی لو نے سب تنویر کیا

آج پرانا البم کھول کے بیٹھا تھا
بھولی بسری یادوں نے دلگیر کیا

ارشد دل کی الجھ بڑھتی جاتی ے
چھوٹی چھوٹی باتوں کو گھمبیر کیا

ارشد محمود ارشد

☆ ☆ ☆

ماں

ذیشان زاہد

ماں کتنی ٹھنڈک ہے تیرے نام۔

آتے ہی تپتی دھوپ بھی گھنی چھاؤں لگنے لگتی ہے تیرا سایہ رہے مجھے پر میری زندگی کی آخری حد تک ماں تجھے اک دن نہ دیکھوں تو زندگی بُری لگنے لگتی ہے اے میری پیاری ماں تو کیا جانے تیری دعا میں کیا اثر ہے ادھر تو ہاتھ اٹھائے اُدھر ہر مشکل مجھے آسان لگنے لگتی ہے ایک تجھے راضی رکھنے سے یرا دامن بھر گیا خوشیوں سے تیری محبت کے سامنے دنیا کی ہر محبت جھوٹی لگنے لگتی ہے جو ہو میرے بس میں نثار کر دوں میں جہاں بھر کی نعمتیں دنیا کی ہر نعمت تیرے رتجگوں سامنے ہیچ لگنے لگتی ہے ماں تو کہتی ہے میں تیری ہستی کا مان ہوں، غرور ہوں یہ سوچ کے مجھے یہ زندگی کچھ اور بھی اچھی لگنے لگتی ہے میں وہ لفظ کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں، جو تیری شان میں ہوں ادا ماں میری محبت، تیری محبت کے سامنے شرمندہ سای لگنے لگتی ہے ماں بہت اونچی شان والی ہستی ہے ماں کی شان کا اندازہ حضور ﷺ کی حدیث مبارک سے لگا سکتے ہیں

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ماں والدہ حیات ہوتیں میں عشاء

کی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ماں کی آواز آتی کہ "محمد" میرے پاس آؤ تو میرا سر اگر سجدہ میں بھی ہوتا تو میں اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ آج کل ہم سال میں ایک مرتبہ کارڈ اور پھول دے کر مدر ڈے سلیبریٹ کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کوئی بہت بڑا کام کر لیا ہوں۔ ماں باپ کی حقیقی محبت ادب و احترام ہی دنیا میں کامیابی و آخرت میں نجات کی ضمانت ہے ماں کی عظمت اور بڑائی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا خداوند کریم جب انسان سے اپنی محبت کا دعوی کرتا ہے تو اس کے لیے ماں کو مثال بناتا ہے۔ جس کو ایک نظر پیار سے دیکھ لینے سے ہی ایک حج کا ثواب مل جاتا ہے۔ جب بچہ ماں کے پاس ہوتا ہے تو ہر غم سے دور ہوتا ہے ماں خود بھوکا رہ لے گی مگر اپنے بچوں کو حضرت موسیٰؑ نے ایک دفعہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا جنت میں میرے ساتھ کون ہو گا؟ اللہ پیٹ بھر کر کھانا کھلائے گی اللہ تعالیٰ نے فرمایا فلاں

قصاب ہو گیا آپ کچھ حیران ہوئے اور اس قصاب کی تلاش
میں چل پڑے وہاں دیکھا تو ایک قصاب گوشت بیچنے میں
مصروف تھا اپنا کاروبار ختم کر کے اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا
کپڑے میں لپیٹا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ
بطور مہمان اس کے گھر چلے گئے گھر پہنچ کر اس قصائی نے
گوشت پکایا پھر روٹی پکا کر اس کے ٹکڑے شوربے میں نرم
کیے قصاب نے اس بمشکل سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے
کمرے میں چلا گیا۔ جہاں ایک نہایت کمزور بڑھیا پلنگ پر لیٹی
ہوئی تھی ایک ایک لقمہ کر کے کھانا کھلایا اور اپنی ماں کا منہ
صاف کیا ماں نے قصاب کے کان میں کچھ کہا جس سے قصاب
مسکرایا۔ حضرت موسیٰؑ جو یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے آپ
نے قصاب سے پوچھا یہ عورت کون ہے اور اس نے تیرے
کان میں کیا کہا ہے عورت میری ماں ہے گھر پر آنے کے بعد
سب سے پہلے ماں کے کام کرتا ہوں جس پر تو مسکرایا؟
قصاب بولا ارے! اجنبی سے وہ خوش ہو کر مجھے دُعا دیتی ہے
اللہ تجھے حضرت موسیٰ کے ساتھ رکھے گا جس پر میں مسکرا
دیتا ہوں میں کہاں اور ماں ایک مہتاب کی مانند ہے ماں کبھی
کسی کو بددعا نہیں دیتی۔ جس نے ماں کا دل دکھایا اس کو اس کی
سزا دینا؟ موسی کلیم اللہ کہا میں ہی مل جاتی ہے اللہ رب
العزت سے دعا ہے کہ اپنے پیارے حبیب ﷺ کے
صدقے ہمیں اپنے والدین کی خدمت کرنے کی ہمت اور
توفیق عطا فرما آمین۔

نصیب قیس کا ادارک مجھ میں
اتارے درد کے افلاک مجھ میں

ترے دم سے بے رونق جسم و جاں کی
وگرنہ اڑ رہی تھی خاک مجھ میں

کسی کی جھیل آنکھیں کہہ رہی تھیں
کئی گم ہو گئے پیراک مجھ میں

درندے غم کے دل کو نوچتے ہیں
عجب رکھی گئی خوراک مجھ میں

مکان جسم تو اجڑا ہوا ہے
مگر یادوں سے ہے املاک مجھ میں

نمی پلکوں سے جائے بھی تو کیسے
ہے ارشد روز و شب غمناک مجھ میں

ارشد محمود ارشد

زندگی کے متلاشی لوگ، کہیں زندگی کی امید اور کہیں

آزادی بنامِ قربانی

محمد جواد خان

0307/0315/03325124125

ماہِ اگست عہد وپیماں کا موسم۔۔۔ ہر طرف ہریالی وسبزہ زار کا موسم۔۔۔۔ یہ وہ موسم ہے جو اس لمحہ کی یاد کرواتا ہے جب وقت کے سورج نے اپنی سنہری کرنوں سے اس نیلے آسمان کے نیچے ہماری مقدس دھرتی پر لفظ " آزادی " لکھا تھا۔ اور جسے اس دھرتی کے باسیوں نے اپنے سینوں میں پروتے ہوئے اپنی سانسوں میں ایسا سمویا کہ ہر طرف ان کے خون کی ہولی کھیلی گئی، ان کے بے سروپاہ لاشوں کو بے گوروکفن سڑکوں پر گھسیٹا گیا، کہیں پر عزت وعصمت کو پامال کیا گیا تو کہیں سرعام انسانیت کو روندا گیا، کہیں خون سے لت لاشے اور کہیں بے گوروکفن جنازے، کہیں یتیم وبے سہارا مخلوق، اور کہیں شفاف فلک کے سائے میں پلتے بچے، کہیں عورتوں کی لٹی عصمتیں اور کہیں بچوں کا بھوک وپیاس سے تڑپایا گیا، کہیں چوروں کی عیاشیاں اور کہیں مظلوموں کی سسکیاں، کہیں اپنوں کی تلاش میں تڑپتے انسان اور کہیں اپنوں کی

اور کہیں ان کے لاشے، عرضیکہ ہر طرف موت ہی موت تھی۔۔۔ مگر سلام پیش کیا جائے ان ہستیوں کو جو خود قربانیوں کی مثالیں تو بن گئے مگر ہم کو آزادی کا لفظ لگا کر " پاکستان " جیسا عظیم ملکِ پاک دے گئے۔

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی دل کے لُٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

تاریخ کے تلخ اوراق جو خون کے آنسوؤں سے لکھے گئے ان کو اگر پلٹ کر دیکھا جائے تو انسان انتہائی قرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان ہی اوراق میں لفظِ آزادی موجود ہے جس کو پاکستان میں آج صرف محض ایک لفظ سمجھا جارہا ہے حالانکہ آزدی ۔۔۔ صرف الفاظ تک محدود رہنے والی چیز کا نام نہیں اور نہ ہی ایسا لقمہ کہ جو تیار کر کے ہمارے سامنے رکھ دیا گیا بلکہ اس کی بنیادیں قربانیوں سے بنائی گئی ہیں، کہیں اعضاءِ انسانی سے مصالہ اور کہیں خون وآنسوؤں سے ان بنیادوں کو تر کیا گیا تو

تب جا کر آزادی ملی۔۔۔ آزادی کی قدر جاننی ہے تو جا کر کشمیر میں دیکھو کہ کیسے وہ ہر روز اپنوں کے لاشوں کو اُٹھاتے ہیں۔۔۔شام میں بچوں کے بے گور و کفن لاشوں کو دیکھو۔۔۔ فلسطین میں سر کٹی لاشوں کی طرف نظر ڈالو تو آزادی کی قدر و قیمت کا احساس ہو گا۔ اور ادھر ہم آزادی کو مذاق بنائے بیٹھے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی
موجوں میں اضطراب نہیں

آج ہم سٹیج پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ آزادی کو موضوعِ تقریر بنا کر جوش و جذبہ دیکھاتے تو ہیں مگر صرف اتنی قربانی دینی پڑ جائے کہ اردو زبان میں تقریر کر دو تو ہماری بات نہیں نکلتی کیوں کہ ہم آزاد تو ہیں مگر ذہنی طور پر انگریز کے غلام ۔۔۔ مردِ قلندر علامہ محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے جس عرضِ پاک کا خواب دیکھا اور جس مرد مجاد قائد اعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ نے اس خواب کو حقیقت کا روپ دیا کیا ہمارے پاس کل کو ان کے صرف ایک سوال کا جواب ہو گا کہ ہم نے ان گزرے 66 سالوں میں پاکستان کو کیا دیا۔۔۔؟؟؟

اے مردِ خدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل جا بیٹھ کسی غار میں
اللہ کو کر یاد

آج ہمارے ملک کی عوام سیاست دانوں کو طنزیہ لہجے میں بولتے ہیں کہ "کہ جی یہ ہمارے ساتھ سیاست کھیلتے ہیں" خیر بولتے تو وہ بھی ٹھیک ہیں کیا دیا ہم کو انھوں نے۔۔۔ اگر ان 66 سالوں میں اس قوم کو ایک بھی مخلص لیڈر مل جاتا تو یہ قوم اپنے اندر ایسے جذبات، حوصلے، ہمت، لگن، جستجو، عقل اور شعور رکھتی ہے کہ دنیا میں انقلابی لہر کو سونامی بنا کر رکھ دیتی اور ہر زبان پر صرف عرضِ پاک کے نوجوانوں کا نام ہوتا۔۔۔ ہم کو دیوار کے ساتھ لگانے والے اپنے ہی نہیں بلکہ ہماری صلاحیتوں اور قابلیتوں کو غیر جانتے تھے تب ہی ہر لمحہ وہ ہمارے خلاف محاذ سجائے کھڑے رہتے ہیں۔ تا کہ یہ اسلامی ملک آگے نہ بڑھ سکے اس لیے آج ہماری نوجوان نسل کو چاہیے

کہ وہ دو قدم آگے بڑھ کر ملک و قوم کی بھاگ دوڑ کو اپنے ہاتھوں میں لیں۔۔۔ مگر ہماری نوجوان نسل کو سوشل میڈیا پر فیس بک اور موبائل سے فرصت ملے گئ تو وہ کچھ کر پائیں گئے نہ۔۔۔

جوان ہے عزم تو پھر ظلم کی بربادی باقی ہے اندھیری رات
ہے اب تک، ابھی آزادی باقی ہے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

آج ہم نے پاکستان کو ان تمام مسائل سے دوچار کر رکھا ہے جو کہ ایک پسماندہ معاشرے کے اندر موجود ہوں تو وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے مگر ہمارے ملک کی سلامتی کا دآر و مدار ہماری فوج کے سر جاتا ہے کہ انھوں نے شہدائے آزادیِ پاکستان کے لگائے ہوئے اس پاکستان کے درخت کو ہر لمحہ، ہر قدم پر اپنے خون سے ترو تازہ رکھ کر ہمیں ٹھنڈی چھائیں میسر کر رکھی ہیں تا کہ ہم سکون سے اپنے گھروں میں رہ سکیں اور خود ہر لمحہ بارود و آگ کے سامنے سینہ تھانے

کھڑے رہتے ہیں۔

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند کون کر سکتا ہے

اس نخلِ کہن کو سرنگوں!

کیا وجہ ہے کہ شمالی کوریا جو کل کل آزاد ہوا ہم سے کئی گناہ ترقی کر کے کہاں جا کھڑے ہوا، وہ جاپان جس پر ایٹم بم کی بارش تو کی گئی مگر آج وہ بھی ہم سے آگے ہے۔ وہ چین جو کل تک نشے میں مست رہتے تھے آج دنیا کو معاشی و اقتصادی بنیادوں پر اس قدر دھچکا دے دیا کہ ہر ملک میں استعمال ہونے والی ہر چیز چین بنا رہا ہے اور تو اور وہ ملک بنگلہ دیش جو کل تک ہمارے جسم کا ایک حصہ تھا آج جسم تو خشک ہو رہا ہے مگر وہ حصہ ترقی کر کہ کہاں کھڑا ہو گیا۔۔۔

تیری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن

کہ تو بدل جائے

ملکِ پاکستان کو ترقی کی راہوں پر چلانے کے لیے عملی اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہے جو ہنگامی بنیادوں پر کریں گئے تو کامیابی ہمارے دامن میں خود چل کر آئے گی۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر تو شاہین ہے بسیرا کر

پہاڑوں کی چٹانوں پر

اسلام : مسلمان ہونے کے ناطے آج تک ہم کبھی رسوا نہیں ہوئے جتنے آج ہو رہے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری مرکز اور دینِ اسلام سے دوری ہے، آج ہم صبح بہت جلد اُٹھیں بھی تو 7 بجے سے قبل نہیں اُٹھتے اور جاگتے ہی موبائل کو پہلے چیک کرتے ہیں، نہ کوئی نماز اور نہ کوئی عبادت ۔۔۔۔جب کہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جس دن صبح کی نماز میں مسلمانوں کی تعداد جمعہ کے نمازیوں جتنی ہو گی تو مسلمان دنیا پر چھا جائیں گئے مگر ہم ہیں کہ۔۔۔۔نہ پوچھو۔۔۔

یہ فقر مردِ مسلمان نے کھو دیا جب سے رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی

چونکہ اس ملکِ پاکستان کی بنیاد لا الہ الا اللہ پر رکھی گئی تھی اور مذہبِ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس لیے ہمیں اپنی زندگی کو اسلام کے قوانین و ضوابط کے مطابق گزارنی ہو گی اور ملک پاکستان کے اندر اسلام کو نافذ العمل کرنا ہو گا۔ تمام قوانین کو اسلام کی بنیادوں پر مرتب کرنے ہونگے، عرضیکہ تمام مسائل و حالات میں ہمیں اول ترجیحات اسلام کو دینی ہو گی۔

سیاست : ملک کی ترقی کا دآر و مدار ملک کی سیاسی حالات پر بھی ہوتا ہے مگر اسکا مطلب یہ تو نہیں کہ سیاست کو بچانے کے لیے انسانی اقدار کو پاؤں تلے روندا جائے، آج اگر ہمارے سیاستدانوں کی صف ٹھیک ہو جائے، آج یہ لوگ اپنا سرمایا پاکستان کے لیے وقف کر دیں، ساری دولت باہر کے بینکوں سے نکال کر پاکستان لے آئیں، اپنے حصے کے کمیشن کو ختم کر دیں، تو ملک کی آدھے سے زیادہ پریشانیوں کا خاتمہ یہاں پر ہی ممکن ہو جاتا ہے۔

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ارشاد نبوت میں وطن

اور ہی کچھ ہے

ایسا نظام متعارف ہو کہ ہر سیاست دان کا بچہ پاکستان میں تعلیم حاصل کرے، سب کا روپیہ پیسہ پاکستان کے بینکوں میں ہو ، پڑھے لکھے نوجوان قوم کے ہاتھوں میں اقتدار کی سیڑھی آئے جو بغیر کسی دھاندلی، کرپشن، رشوت و سفارش کے بغیر کامیاب ہو کر سامنے آجائیں۔ وی آئی پی کلچر، اور سیاسی اخراجات کو کم سے کم کرنا ہو گا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو خیال جس کو اپنی حالت کے بدلنے کا۔

تعلیم و تربیت ہمارے ملک کا سب سے بڑا امسلۂ جہالت ہے، بے تعلیمی و جہالت نے ملک کو بیشتر مسائل سے دوچار کرر کھا ہے، ہر ایک کا اپنا تعلیمی نظام ہے،

اور جن لوگوں کے پاس تعلیم ہو بھی تو اس کو بہترین روزگار کے مواقع فراہم نہیں کیے جاتے، فنی ہنر والوں کے پاس سرمایہ نہیں کہ وہ صرف کر سکیں۔

روزگار کے مواقع: با مقصد تعلیم کو عام کر کے جہالت کا خاتمہ کرنا ہو گا، جس طرح انسان کے لیے ہوا، پانی، لباس اور خوراک سے انسان توانا اور صحت مند ہوتے ہیں اس طرح تعلیم کے حصول سے انسانی دماغی لحاظ سے ترقی کر کے اپنے ملک کو ترقی دینے کے قابل بناتا ہے، اس لیے ہر شہری کے لئے تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دینا ہو گا۔ تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلیاں لانی ہونگی، سائنس و ٹیکنالوجی کے علوم کو وسیع پیمانے پر حاصل کرنا ہو گا۔

وسائل و ہنر : کسی بھی ملک کے وسائل اور اس قوم کا ہنر ہی اُس ملک کا اصل زرِ مبادلہ ہوتے ہیں، ہمارا ملک قدرتی وسائل سے بھی مالا مال ہے اور باہنر لوگوں کی قوم ہے مگر ہم ان سے استفادہ حاصل کرنے سے ابھی تک قاصر اس لیے ہیں کہ ہم میرٹ کو موقع ہی نہیں دے رہے، جہاں جتنے زیادہ وسائل ہوں وہاں اسقدر سستی کی جاتی ہے، جس کے پاس جتنا زیادہ ہنر ہو اس کو اتنا زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ملک کی ترقی کے لیے ہمیں میرٹ کو ترجیحات دینی ہو گی، وہاں اثر و رسوخ یا رشوت و سفارش کا منتظر رہنے کے بجائے میرٹ کو دیکھنا ہو گا۔

صوبوں کا قیام : قیام پاکستان کے وقت بنائے گئے صوبے اس وقت کی آبادی و وسائل اور ضرورتوں کے حساب سے ٹھیک تھے مگر اب رفتہ رفتہ بڑھتی آبادی، مسائل اور لاقانونیت کی سب سے بڑی وجہ آبادی و علاقہ کا زیادہ ہونا اور وسائل کا کم ہونا ہے۔

اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انتظامی بنیادوں پر پورے ملک کے اندر جہاں جہاں ممکن ہو وہاں صوبوں کا قیام کرتے ہوئے وسائل کی یکساں سہولیات میسر کی جائیں تا کہ زیادہ آبادی کے ہوتے ہوئے بھی مسائل کا حل با آسانی نکل سکے۔

جذبہ اخوت : سارے مسائل کی وجہ ہمارے سیاست دان یا اعلیٰ حکام ہی نہیں ہوتے، ہم (عوام) کون سے دودھ کے دھلے ہوتے ہیں بہت سے مسائل تو ہم خود پیدا کر دیتے ہیں

اور بعد میں ذمہ داری حکام پر ڈال کر خود سفید پوش اور حب الوطنی کا لبادہ اُوڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

بہت سے ایسے مسائل ہوتے ہیں جن کو ہم (عوام) خود آپس میں جذبہ محبت اور عجز و انکساری کے ساتھ بیٹھ کر با آسانی حل کر سکتے ہیں مگر ہم ہیں کہ ایک دوسرے کو نیچا دیکھانے میں مصروفِ عمل۔۔۔

قومیں ایسے نہیں بنتی، قومیں قربانیاں مانگتی ہیں

قومیں بدلے نہیں، احساسات مانگتی ہیں

ہم ہیں [illegible]

قر [illegible]

مجھ سے دانہ چنگا سیکھ رہی تھی

میرے پروں پہ اڑنا سیکھ رہی رہی

میری چڑیا بھولی چڑیا

دانہ چگنا سیکھ گئی تو

مانو جینا سیکھ گئی تو

پھر سے اڑی

اور کسی اور کی ڈال پہ جا بیٹھی

میری چڑیا

بھولی چڑیا

از قلم پیا سحر

مختصر اشتہارات

قارئین کے نام

زندگی بھر اور باوفا دوستی کے لیے رابطہ کریں۔ انشااللہ مایوسی نہیں ہو گی۔ چوبس گھنٹے کسی وقت کبھی کا یا ایس ایم ایس پہ بات کر سکتے ہیں۔ (منظور اکبر اداس جھگوی۔ جھنگ)

قارئین کے نام

ان تمام دوستوں سے عرض ہے جو جواب عرض پڑھتے ہیں۔ شہزاد عالمگیر کے حق میں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ان کے لیے لازمی قرآن مجید پڑھ کر دعا کرتے رہیں اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں رکھے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (محمد اسحاق انجم۔ کنگن پور)

ایڈیٹر کے نام

اگر مختصر اشتہار کی تحریریں شائع نہیں کرنی تو اس کا کوپن بھی بند کر دیں۔ کیا فائدہ اس میں لکھنے کا اگر شائع نہیں ہونا؟ تو شائع بھی کیا کریں ورنہ بند کر دیں۔ (پرنس عبدالرحمن گجر۔ نین لانجھ)

بے یقینی سی بے یقینی

فاطمہ ایم اے خان

دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے لوگ مجھ سے مصافحہ کرتے، گلے ملتے واپس ہو گئے مگر میں اب بھی یہیں کھڑا ہوں، سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں، کہاں جاؤں۔ مڑ کر دیکھا کہ ہو سکتا ہے کوئی مجھے یہیں کھڑا دیکھ کر رک گیا ہو، مگر نہیں بابا بھی نہیں تھے۔

شہر خموشاں کی خاموشی دھیرے دھیرے میرے اندر اترنے لگی۔۔ میں 16 سالہ، نعمان حیدر انڈسٹریلسٹ ریحان حیدر کا چھوٹا بیٹا جس نے آج سے پہلے نہ کوئی میت دیکھی تھی اور نہ ہی کسی جنازہ میں شرکت کی تھی، میں جو قبرستان کے قریب سے گذرنے میں بھی ڈرتا تھا آج پچھلے ایک گھنٹہ سے تنہا ان ان گنت قبروں کے درمیان کھڑا ہوں۔ پتا نہیں میں تنہا ہوں بھی یا نہیں۔۔۔ کیونکہ میرا بڑا بھائی شہزان حیدر جو مجھ سے پانچ سال بڑا ہے وہ بھی یہیں ہے۔ مگر وہ میرے ساتھ کھڑا نہیں بلکہ سامنے بنی تازہ قبر میں سویا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ جب کوئی اپنا مر جائے تو قبرستان سے ڈر نہیں لگتا، وہی حال اب میرا ہے۔

میں اور شہزان زیادہ قریب نہیں تھے مگر اس کی اچانک علالت نے نہ صرف مجھے اس سے قریب کیا بلکہ اس کی اچانک موت نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بارے میں جو باتیں مجھے اس کے آخری ایام میں پتا چلیں ان پر میں جتنا افسوس کروں کم ہے، مجھے بہت پچھتاوا ہوا کہ میں اس سے اتنا دور کیوں رہتا تھا۔ مگر اب جو کچھ ہو چکا ہے میں اسے تبدیل نہیں کر سکتا مگر جو ہونے والا ہے اسے روکنے، اسے بدلنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں نا۔۔۔ ہاں مجھے ایک بڑی تبدیلی لانی ہے تا کہ پھر کسی نعمان حیدر سے کوئی شہزان حیدر یوں جدا نہ ہو۔

میں سوچوں میں گھرا کھڑا تھا جبھی وہ میرے برابر آ کر کھڑا ہو گیا، وہ ماما کے کزن کا بیٹا اور شہزان کا جگری دوست سنان تھا۔

وہ اب شہزان کی قبر کے سامنے کھڑا ہو گیا، اس کے ہاتھ دعا کیلئے اٹھے اور لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ وہ شاید شہزان کی مغفرت کی دعا کرنے لگا، آنسوں اس کے گال کو بھگونا شروع ہو گئے۔ میں پچھلے دو ماہ میں اتنا رو چکا تھا کہ اب اور رونا نہیں چاہتا تھا، میں خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور قبرستان کے باہر ایک بڑے پتھر پر آ بیٹھا۔

وہ تھوڑی دیر میں باہر نکلا، مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہو نعمان، گھر جاؤ مغرب کا وقت ہو چلا ہے۔" وہ میری پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوا، اور میں خالی خالی نظروں سے اسکی اور دیکھنے لگا، اسکی آنکھیں سخت سرخ ہو رہی تھیں۔۔۔۔شاید وہ شہزان کی موت کی خبر ملنے کے بعد سے مسلسل رویا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ میرے یک ٹک دیکھنے سے پریشان ہو گیا۔

"کچھ نہیں، تمھاری سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر کچھ یاد آ گیا تھا۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے شہزان کی یادوں کو پرے دھکیلنے کی کوشش کی۔سنان میرے پاس آ بیٹھا۔

سنوں جاناں
اک بات کہنی ہے تم سے
مجھے کئی دنوں سے اک وہم ستاتا ہے
کہ تمہیں لگتا ہے
ہم تمہیں بھول گئے ہیں
کہ تمہاری یاد اب ہمیں کسک نہیں دیتی
تو سنوں جاناں
اک پل بھی ایسا نہیں گزرا
جب ہم تمہیں یاد نہیں کرتے
اپنی باتوں میں اپنی دعاؤں میں
ہماری معصوم اداؤں میں
ہمارے خیالوں میں
ہمارے خوابوں
میری شاعری کے ہر لفظ میں
ذکر تمہارا رہتا ہے
ہم جب بھی کوئی شاعری نظم تحریر کرتے ہیں
خیال تمہارا ہی رہتا ہے
میرے ہر اک لفظ میں عکس تمہارا جھلملاتا ہے
میرے ہر اک لفظ میں مہک ہے تمہاری محبت کی
کبھی وقت ملے تو پڑھنا میرے اک اک حرف کو
صرف ذکر تمہارا رہتا ہے
ہم تمہیں بھولے نہیں ہیں جاناں

(جاری ہے: پڑھیں اگلے صفحہ پر)

"نعمان میں جانتا ہوں تم شہزان سے کتنی محبت کرتے تھے، مجھے اندازہ ہے کہ اس کی موت تمھارے لئے کسی ناگہانی حادثہ سے کم نہیں ہے، مگر مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں کرتے نا۔۔۔ انکل- آنٹی کا اب واحد سہارا تم ہو نعمان، تمھیں ہمّت سے کام لینا ہو گا، صبر کرنا ہو گا۔" وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے صبر آ گیا۔"

"کیا؟" وہ میری بات سمجھ نہیں پایا۔

"میں نے کہا کہ مجھے صبر آ گیا۔" میں نے اپنی بات دہرائی۔

"اچھا ٹھیک ہے، پھر گھر چلو۔" اسنے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ حیرت سے میری اور دیکھنے لگا، میں نظریں چرا گیا۔

"تم شہزان کی موت کی وجہ نہیں پوچھوگے؟" میں قبرستان کے گیٹ کے اس پار نظر آتی شہزان کی قبر پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔

"وجہ کیا پوچھنی ہے نعمان، آنٹی نے مجھے بتایا تھا کہ شہزان کی آنکھوں میں انفیکشن ہو گیا تھا اور وہی اس کی موت کا بہانا بنا۔" وہ اس وجہ سے واقف تھا جو دنیا اور شہزان- نعمان کی ماں جانتی تھیں۔

(بقیہ: حصہ)

کہ ہماری شاعری کا عنوان ہو تم
ہمارے لفظوں کی پہچان ہو تم
میری جان ہو تم
میری مھبت کی پہچان ہو تم
میرے لفظوں کی صداقت ہو تم
تمہارے نام کے بغیر ہر لفظ ادھورا لگتا ہے
بس اب ہم نے بتانا چھوڑ دیا تم کو
جتانا چھوڑ دیا تم کو
ہم تم کو یاد کرتے
جاناں بے حد کرتے ہیں
تمہاری یاد میں اکثر خود کو بھول جاتے ہیں
پل پل ٹوٹ کر بکھرتے ہیں
نہ ہنستے ہیں نہ بولتے ہیں
بس اب اکثر خاموش رہتے ہیں
تمہاری جدائی میں اکثر نڈھال لیتے ہیں
آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں
مجھے ابھی بھی محبت ہے جاناں
تمہیں ہم یاد کرتے ہیں
بے تحاشہ کرتے ہیں
دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے ہیں
تمہارا بھی نام ہوتا ہے
یہ سوچنا چھوڑ دو جاناں
کہ ہمیں محبت نہیں تم سے

از قلم شازیہ کریم

"اور اگر میں کہوں کہ یہ اصل وجہ نہیں ہے تو؟ اگر میں کہوں کہ ماما شہزان کی موت کی اصل وجہ سے نابلد ہیں تو؟"

"سوری، مگر نعمان مگر آنٹی تم سے کہیں زیادہ محبت شہزان سے کرتی تھیں، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنٹی اسکی موت کے سبب سے ناواقف ہوں۔" اسکا لہجہ ہتک آمیز تھا۔

"بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔ جانتے ہو شہزان وہ طوطا تھا جس میں ماما کی جان بستی تھی، اور یہی وجہ تھی کہ میں نے اور بابا نے شہزان کی بیماری کو ماما سے بھی چھپایا۔۔۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ماما کی نظروں میں شہزان حیدر کی اچھائی اور معصومیت کا جو بت ہے وہ نیست و نابود ہو جائے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔" سنان میری باتوں میں الجھ گیا۔

"اسے پہچانتے ہو؟" میں نے شہزان کا موبائل اس کے سامنے رکھ دیا۔ یک لخت سنان کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"کیا ہوا سنان؟"

"کچھ نہیں، اسکا موبائل دیکھ کر اسکی یاد آ گئی۔" اسنے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"نہیں سنان۔۔۔ تمھارے چہرے پر پھیلے رنگ کسی یاد کے نہیں، بلکہ ڈر اور خوف کے ہیں۔۔۔ ڈر اس بات کا کہ کیا ہو گا اگر مجھے شہزان کے موبائل کا پاسورڈ پتا چل گیا تو؟" میں ہر طنز، ہر دھمکی سے عاری لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو نعمان؟"

"ایسا کیا کیا ہے تم نے سنان جو میں تمھیں بلیک میل کرنے لگا۔" اب میری برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔

"سنان میں تمھیں بلیک میل نہیں کر رہا، میں تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، میں جانتا ہوں کہ کسی اپنے کو کھونے کی اذیّت کیا ہوتی ہے، میں نے ماما-بابا کی تکلیف دیکھی ہے، میں نہیں چاہتا کہ وہ تکلیف و اذیّت تمھارے والدین کو ہو۔ تم تو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہو سنان، ماما-بابا کے پاس شہزان کے بعد میں ہوں، مگر تمھیں کچھ ہو گیا تو تمھارے ماما-بابا کا کون ہو گا، وہ تو اکیلے ہو جائیں گے۔۔۔ کبھی سوچا ہے اس بارے میں؟"

"نعمان تم نے شہزان کی موت کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے۔ تمھاری سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو، مجھے بھلا کیا ہو گا۔" وہ میری ذہنی حالت پر شبہ کر رہا تھا۔

"شہزان کی آنکھوں میں کینسر ہوا تھا سنان۔۔۔" میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا، سنان کو بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"آنکھوں میں کینسر۔۔۔۔ وہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا، تم لوگ گناہ پر گناہ کرتے رہو، اللہ سبحانہ وتعالٰی کے قہر کو للکارتے رہو تو لعنت تو برسے گی نا، عذاب تو آئے گا نا۔" میری آواز بھرّا گئی۔

"گناہ۔۔۔۔ عذاب۔۔۔" وہ سوال کر رہا تھا۔

"ہاں عذاب۔۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ ایک بیماری ہے، میں نہیں مانتا۔ میں نے شہزان کی حالت دیکھی تھی، صرف دو ماہ۔۔۔ دو ماہ میں وہ لحد میں جا سویا، کیوں۔۔۔ اس عذاب کی بناء پر۔۔۔ اسکی آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا سنان۔۔۔ میں نے ان دو ماہ میں دن-رات اس کی آنکھوں سے بہنے والے خون کو اپنے ہاتھوں سے پونچھا ہے، میں نے اسے ناقابلِ برداشت تکلیف میں دیکھا ہے۔

وہ شہزان حیدر جس پر ایک زمانہ رشک کرتا تھا، لڑکیاں جس کے نام پر آہیں بھرتی، جس کے خواب بنتی تھیں، اسے آخری ایّام میں اگر یہی زمانہ دیکھتا تو نظرِ ثانی کا بھی حق دار نہ سمجھتا۔ وہ شہزان حیدر جو اپنی ماں کی جان، اپنے باپ کا مان تھا، جس پر اس کے اساتذہ فخر کرتے تھے، وہ اندر سے ایک انتہائی گھٹیا شخصیت کا حامل انسان نکلا۔۔ اور یہ سب میں نہیں کہہ رہا، یہ شہزان کے اپنے الفاظ ہیں۔" لاکھ کوشش کے باوجود آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے، مگر پھر بھی میں ایک سانس میں بولے گیا، کیونکہ اگر میں وقفہ لیتا تو شاید اپنی بات پوری نہیں کر پاتا۔

"شہزان کے الفاظ؟" سنان کی حالت غیر تھی۔

"ہاں۔۔۔ شہزان کی جب طبیعت خراب رہنے لگی تب ماما نے مجھے بتایا، میں پڑھائی چھوڑ کر فوراً گھر آ گیا۔ میں نے پچھلے دو ماہ میں ہر لمحہ اسکے ساتھ گذارا ہے، جب اسکے آنکھوں کی روشنی چلی گئی تب وہ اپنے موبائل اور لیپ ٹاپ کیلئے سخت پریشان رہنے لگا، اس کی پریشانی میرے لیے حیران کن تھی۔۔۔ میں نے اس کا موبائل اور لیپ ٹاپ دیکھا مگر اس میں سیکیوریٹی کورڈ تھا۔

وہ اپنی بیماری کے دنوں میں بار بار کہتا رہا کہ میں اسکے ٹیکنیشین سے اسکی بات کرادوں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر وہ موبائل اور لیپ ٹاپ کو لے کر اتنا پریشان کیوں ہے۔۔۔ میں نے اسکی کوئی بات نہیں مانی، میرا ارادہ تھا کہ میں خود اسکے ٹیکنیشین سے بات کروں گا مگر اسکی طبیعت بہت خراب ہو گئی تو میں نے اسکی بیماری میں یہ باتیں پسِ پشت ڈال دی۔۔۔۔ مگر جب اسکا آخری وقت قریب ہوا، جب اسے

اندازہ ہوا کہ وہ اب نہیں بچے گا تب اس نے مجھ سے ایک بات کی۔۔۔"

میں سانس لینے کیلئے رکا مگر سنان اب بھی سانس روکے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"جانتے ہو اس نے مجھ سے کیا کہا؟"

"کیا؟" وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

"اس نے مجھ سے کہا کہ۔۔۔ نعمان تم سنان سے کہنا کہ **چھوڑ دے۔** " میں نے اسے شہزان کا پیغام دیتے ہوئے کہا۔

"کیا چھوڑ دوں؟" سنان سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔

"یہی سوال میرے بھی دماغ میں آیا تھا، مگر شہزان کی اگلی بات نے سارے سوال دور کر دیئے۔۔۔ اس نے مجھے اپنے پاسورڈز بتا دیئے۔" یہ بات سنان کیلئے کسی نیوکلئیر بم سے کم نہیں تھی۔

"سنان، شہزان نے وہاٹس ایپ پر ایک گروپ بنایا تھا جس میں تم اور اسکے کوئی اور چار دوست بھی ہیں، وہ گروپ اب بھی موبائل میں ہے، جس میں تم لوگ آپس میں برہنہ تصاویر، فحش فلمیں، باتیں، اور بھی بہت کچھ شئیر کیا کرتے تھے۔ شہزان کا لیپ ٹاپ اور موبائل ان چیزوں سے بھرا پڑا ہے اور اس گروپ میں تمھاری موجودگی بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ تمھارا حال بھی اس سے کوئی الگ نہیں ہے۔۔۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہی گناہ شہزان کی اس بیماری کا سبب بنے ہیں سنان، اور افسوس کہ شہزان کی اچانک بیماری نے اسے اپنے گناہوں کے ثبوتوں کو مٹانے کا موقع بھی نہیں دیا۔" میں نے بغیر کسی لحاظ کے کہا۔

"تم لوگ زنا جیسا کریہہ گناہ کروگے تو اللہ تمھارے آنکھوں میں نور کیونکر دیں گے۔۔۔" میں اپنے آپ کو تلخ ہونے سے روک نہیں پایا۔

"زنا؟" وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ زنا، یہ زنا ہی تو ہے، آنکھوں کا زنا۔۔۔ اور اسی کی سزا میں اللہ نے شہزان کی آنکھوں کا نور چھین لیا، مگر تمھارے پاس وقت ہے، اللہ نے اب بھی تمھیں ڈھیل دے رکھی ہے، شہزان کو تمھارے سامنے عبرت بنایا ہے، اگر تم اسکی حالت سے سبق حاصل کرو، اپنے گناہوں کی معافی مانگو تو اللہ عزوجل تمھیں معاف کر دیں گے کہ انکی ذات غفور ہے، رحیم ہے۔" میں ان حالات کو سنوارنے کی کوشش کرنے لگا جنہیں شہزان بگاڑ کر گیا تھا۔

"زنا تو بہت بڑا گناہ ہوتا ہے نعمان، کیا اللہ اتنا بڑا گناہ معاف کر دے گا؟" وہ سراپا شرمندگی میں ڈوبا تھا۔

"سنان ہم ایسی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں جہاں والدین بچپن میں ایک بار قران ختم کروا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں تمام دین سکھا دیا، اگر وہ ہمیں اسلام کی چند چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی آگاہ کرتے تو شہزان، تم اور ایسے ہی لاکھوں نوجوان ان چیزوں کو تفریح سمجھ کر یوں بڑے بڑے گناہوں میں ملوث نہ ہوتے۔ مگر وہ تو ہمیں خدا کا صحیح تعارف بھی نہیں کرواتے۔ افسوس کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اللہ کی ذات معاف کرنے والی ہے، وہ معافی کو پسند کرتے ہیں۔

تم اللہ سے سچے دل سے معافی مانگو، ان کے سامنے گڑگڑاؤ، ان سے وعدا کرو کہ تم یہ کام پھر نہیں کرو گے۔ اور پھر تاحیات اس وعدہ پر قائم رہو تو دیکھنا کہ اللہ تمھیں روزِ محشر اس صبر کا اجر دیں گے۔" میں نے اپنی بات ختم کر کے اسکی اور دیکھا۔

اسکا چہرہ آنسو سے تر تھا، میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا ۔"تم نہیں جانتے نعمان آج تم نے کیا کیا ہے، تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے جسے میں ساری عمر نہیں اتار سکتا"۔ وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ میں کچھ دیر اسے گلے لگائے تسلی دیتا رہا، قریب مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔

"چلو مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔" میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"تم چلو میں آتا ہوں۔" اس نے آنسو سے تر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" میں اسکی پیٹھ تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا، ابھی میں چند قدم ہی چلا تھا کہ سڑک کے کنارے بنے تالاب میں کچھ گرنے کی آواز آئی، پانی میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ میں نے مڑ کر تالاب کی طرف دیکھا، کوئی چیز تالاب کی تہہ میں جا رہی تھی۔۔۔ وہ کچھ اور نہیں سنان کی گناہوں کی جڑ، اسکا موبائل تھا۔

عشق زادے

علی حسنین تابش
03053621382

میرے قدم رُک سے گئے سینکڑوں لوگوں میں سے وہ ایک چہرہ میری نگاہوں کے محور میں سما گیا۔ عجب سی کیفیت لیے دل میں میرا وجود کسی انجانی قوت سے اُس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔۔ رستے میں بہت سے لوگ مجھ سے ٹکڑائے مگر میری نگاہیں ہوش و خرد اس چہرے کا طواف کر رہی تھے۔ میں اُس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور ایسے دیکھنے لگا کہ یہ کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق ہو۔۔۔

کچھ عرصہ پہلے اجمیر شریف جانے کا اتفاق ہوا، بزرگانِ دین کے مزاروں پر جا کر ایک عجب سا سکونِ قلب ملتا ہے۔ وہ میرے ساتھ بیٹھی دودھیا ہاتھوں کا کشکول بنائے اپنے رب سے کچھ مانگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسو بمثلِ الماس چمک رہے تھے۔ اُس کے آنسوؤں کی چمک میں یہ بات واضح تھی کہ اس لڑکی کو کوئی ایسا صدمہ ہے جس کی وجہ سے یہ سچے من سے اپنے رب سے دُعا گو ہے۔ اُس کے شبنمی آنسوؤں میں یہ بات واضح تھی کہ اُسے سچا عشق ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کی معصومیت، جھیل سی گہری آنکھوں سے بہتا پانی، لبوّں پہ کسی کو پانے کی آرزو، چہرہ ایسا کہ چودھویں کا چاند ہو۔

مجھ پہ ایک عجیب سا سکتہ طاری تھا۔ عمر میں وہ شاید بیس یا بائیس برس کی رہی ہو گی۔ میرے من میں بہت سے سوالات جنم لیتے اور کافور ہوتے رہے۔ کچھ دیر کے سکوت نے اِک ایسا سماں بنا رکھا تھا کہ جیسے صدیوں سے وقت یہیں تھم چکا ہو۔ آبشاروں کا پانی ٹھہر چکا ہو۔ اس قدر سکوت کہ اپنے بدن میں ہوتے ارمانوں کے قتل کی آہ و پکار سنائی دے۔ اس قدر ہولناک چیخیں کہ ساعتیں پھٹ جائیں۔

وہ اپنی دُعا مکمل کر چکی تھی۔ اُس کو دیکھ کر یوں لگا کہ وہ جانے کس جہاں سے لوٹ کر واپس اِس دُنیا میں آئی ہو۔ دُوران دُعا اُسے یہاں تک معلوم نہ تھا کہ وہ خود کہاں موجود ہے۔ اُس کے دائیں پہلو میں بیٹھا، میں اُس کی ہر اِک ادا میں محو تھا۔ میرے لب حرکت میں آئے اور بے ساختہ میں نے کہا۔

”کون ہیں آپ“؟ کیا پریشانی ہے۔؟

میرے اِن الفاظ کو سنتے ہی اُس نے چہرہ میری طرف پھیرا اور پلکیں اُٹھائیں۔ اُس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ نگاہوں میں میری ذات کو لے کر سینکڑوں سوالات تھے۔ اُس کی

بھیگی پلکوں میں اپنا عکس واضح دیکھ رہا تھا۔۔۔چند لمحوں کا سکوت ہم دونوں میں دیوار ئی کی طرح حائل ہو گیا۔ آخر اُس کے شربتی لب ہلے۔

"م۔۔۔۔۔می۔۔۔۔۔م۔۔۔میں اِسی مزار پر رہتی ہوں۔۔۔اُس کے بھیگے لہجے میں الفاظ مجھے اور تشویش زدہ کر چکے تھے۔ میرے بدن میں اک عجب سا دھماکا ہوا۔ یہ حُسن پری مزار پر۔۔۔۔۔؟اور وہ بھی مستقل رہتی ہے۔۔بات حیران کُن تھی۔ میرے من میں اُس کے بارے میں جاننے کی اِک ننھی کونپل نے جنم لیا۔ بے ساختہ میں نے کہا۔۔۔

"کیا آپ مجھے اپنے بارے کچھ بتائیں گی۔؟ جھکی پلکیں ایک بار پھر سے اُٹھیں اور اُس نے مجھے دیکھا۔ اشکوں کا سیلاب تھا جو شاید بہنے کو جانے کب سے منتظر تھا۔۔۔وہ زاروقطار رونے لگی۔ اُس کے بھیگے لہجے میں درد تھا۔ ایسا درد جسے کوئی اہلِ دِل ہی محسوس کر سکتا ہو گا ورنہ آنسو تو خوشی میں بھی نکلتے ہیں۔ بے زبان آنسو دل کی آنکھ رکھنے والوں کے لئے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ اِن سنہری موتیوں کی پہچان ہر کوئی نہیں بلکہ جوہر درد شناش ہی کر سکتا ہے۔۔بھیگے لہجے میں اُس نے کہا۔ آپ میں مجھے کچھ اپنا پن دیکھائی دیتا ہے ایک ایسی کشش محسوس ہوتی ہے جس کو اپنے پن کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔ شاید اِک رمز شناش آپ سا ہی ہوتا ہے۔۔۔

میں اُس کے الفاظ سن کر ششدر سا رہ گیا تھا۔ ہم دونوں مزار کے صحن میں آ کر بیٹھ گئے۔ دُنیا سے بے خبر میں اُس کے دلکش سراپے میں کھو چکا تھا۔۔۔اُس نے اپنی کہانی شروع کی۔۔۔میری سماعتیں اُس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

میرا نام تانیہ ہے۔ پیار سے سب تانی کہا کرتے تھے۔ میرا تعلق کوئٹہ سے ہے۔ پاکستان کا خوبصورت ترین شہر۔۔۔

بچپن سے ہی والدین کا بے حساب لاڈ پیار ملا۔ میں دو بھائیوں سے چھوٹی اور والدین کی لاڈلی تھی۔ بھائیوں نے تو بچپن سے ہی پڑھائی کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ اب زمینوں کی تمام ذمہ داری اُن کے سپرد تھی۔

میرے ابو جبران خان اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ سیاست سے ہی اُن کو فرصت نہ ملی تھی۔ مجھے پڑھائی کا بے حد شوق تھا۔ ابو کے دِل میں یہ افسوس گھر کر چکا تھا کہ اُن کے بیٹے پڑھائی سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں۔ اب ابو کو مجھ سے ہی سب اُمیدیں وابستہ تھیں۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔

میری بھی شاید یہی ننھی سی خواہش تھی۔ جسے پروان چڑھانے میں ابو نے میرا بہت ساتھ دیا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے ہائی اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میری ذہانت اور تعلیمی قابلیت سے ابو بہت مطمئن تھے۔ وہ مجھے ہر رزلٹ میں اوّل آنے پر انعام اور ڈھیروں دعائیں دیتے تھے۔

ڈاکٹر بننے کا خواب دن بدن مجھ میں کرٹوٹیں بدلتا رہا۔ ایک ننھا پودا رفتہ رفتہ جڑیں مضبوط کرتے ہوئے شجر بن رہا تھا۔ دل لگا کر پڑھائی کرتی۔ میرے بھائی میری تعلیم کے خلاف تھے لیکن ابو کی ڈانٹ کی وجہ سے وہ مجھ سے کوئی بات نہ کہہ پاتے۔ بس اندر ہی اندر بھڑکتے رہتے۔

میٹرک میں اوّل پوزیشن پر مجھے ابو نے موبائل فون کا گفٹ لے کر دیا۔ میں بہت خوش تھی۔ ابو خوشی سے کہنے لگے۔
"جاؤ بیٹا! بلندیوں کو چھولو، چاند کو چھونے کا وقت آ چکا ہے۔" مجھے چاند کو چُھونا تھا۔۔۔ مجھے بہت آگے تک جانا تھا۔
بچپن میں جب رات کو میں چاند سے بہت سی باتیں کرتی تب ابّو آکر مجھے کہتے۔ "بیٹا! اک دن ضرور تم بھی اس چاند کی طرح بلند مقام حاصل کرو گی اور اپنے باپ کا نام روشن کرو گی۔" آج وہ بے حد خوش تھے۔ کالج میں داخلہ ہو گیا اور میں کالج جانے لگی۔ پہلے تو کالج وین ہی مجھے لے جاتی۔ پھر ابّو نے مجھے گاڑی خرید کر دی۔ اب گاڑی پر کالج جاتی تھی۔
وقت بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑتا چلا گیا۔۔۔ F.S C. کب ہوئی۔ کچھ خبر نہ ہوئی۔۔ میرے ابو میری کامیابی پر بے حد خوش تھے۔ F.S.C کرنے کے بعد اب ڈاکٹر بننے کا سپنا پورا ہونے والا تھا۔ اُنہی دنوں کالج کا ٹرپ تیار ہوا۔ ابو نے مجھے جانے کی بھی اجازت دے دی۔ ہمارا ٹرپ بہاول پور جانا تھا۔ میں اپنی دوستوں کے ساتھ تیار ہو گئی۔۔۔ بہاول پور پہنچے۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔۔ صحرائی اور نوابی علاقہ تھا۔ بہت سی مشہور جگہوں کی سیر کی۔ بہاول پور کے بارے میں پڑھ چکی تھی۔ قیام پاکستان میں، اس شہر کا بڑا کردار ہے۔ ہم سب صحرا میں نکل گئے۔۔۔ گرم ہوا تھی اور ریت روئی کی طرح اڑتی ہوئی ہمارے چہروں کو چُھوتی تھی۔ صحرائی علاقے میں گھومنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ میں اپنی سہلیوں کے ساتھ چل رہی تھی کہ دُور سے آتے ہوئے چند صحرائی جہاز (اونٹ) دِکھائی دیئے۔۔ میرا من اُن کے پاس جانے کو مچل رہا تھا۔ وہ ہم سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ میں نے آج تک حقیقت میں اونٹ نہیں دیکھے تھے۔ بس تصاویر ہی دیکھی تھیں۔ میں دوڑ کر ان کے پاس چلی گئی۔۔
ایک لڑکا اونٹوں کے آگے چھڑی ہاتھ میں تھامے چل راہ تھا۔ اونٹوں پر سامان لدا ہوا تھا۔ ڈھلتی شام میں اونٹوں کے چلنے کا منظر میری نگاہوں کو بے حد بھایا۔۔۔ بے ساختہ ہی مسکراہٹ نے میرے لبوں پر قبضہ جمالیا۔۔۔ میں خوشی سے مچلنے لگی۔ اس لڑکے سے میں نے نام پوچھا۔ شاید مجھے دیکھ کر وہ چونک سا گیا تھا۔ دِکھنے میں بنجارا لگتا تھا۔۔۔ اُس نے اپنا نام ابراہیم بتایا۔۔۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ فی الحال اِسی صحرا میں رہتا ہے۔۔۔ جانے کب وہ یہاں سے چلا جائے۔ کچھ معلوم نہیں۔۔۔ اپنی سہلیوں اور اساتذہ کے بلانے پر مجھے واپس گروپ میں لوٹنا پڑا۔ ہماری بات اُدھوری رہ گئی تھی۔۔۔ اُس کی میٹھی میٹھی بولی میرے کانوں میں دیر تک رس گھولتی رہی۔۔۔ شاید مجھے پہلی ہی نظر میں وہ پسند آگیا تھا۔ رات کے کھانے کی تیاری شروع تھی۔۔۔ کیمپ میں لوٹتے ہی یہ معلوم ہوا کہ کھانا کھا کر واپس چلنا ہے۔۔۔
میری بات ادھوری رہ گئی تھی اس بات کو لے کر میرے دل میں بہت سے سوال تھے۔۔ وہ کون تھا۔؟ دِکھنے میں شہزادہ سا لگتا تھا مگر لباس میں فقیری تھی۔۔۔ مگر یہ اونٹ اور اُس کی زندگی کچھ عجیب سی بات لگی تھی۔ اُس کو اس حال میں نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ تو شہزادہ ہے، شہزادے اِس روپ

میں تھوڑے ہوتے ہیں۔ میں سوچوں میں ڈوبی اپنا بے جان بدن لے کر واپسی کوئٹہ آ گئی۔۔۔

میری سوچوں کا محور وہی تھا، میرا دِل، میرے خیال سب وہیں رہ گئے تھے۔۔۔ چند دن بعد بے چینی حد سے بڑھنے لگی اور میں پھر سے واپس اپنی کار پر اکیلی وہاں چلی گئی۔ ابو سے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا تھا کہ میں اپنی سہیلی کی شادی پر جا رہی ہوں۔ تین دن تک لوٹوں گی۔۔۔ خیر سفر لمبا تھا۔ اُس کی کشش میں کیسے طے ہوا، خبر تک نہ ہوئی۔

اُسی صحرا میں پہنچ کر میں چہار اطراف نظریں دوڑانے لگی ۔ ہر طرف ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔۔۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ دِل تڑپ اُٹھا۔۔۔ مجھے تو صرف اُس کا نام ہی معلوم تھا ۔ وہ اس جگہ پہ کہاں رہتا ہے کچھ خبر نہ تھی۔۔۔ مجھ پہ اضطراب کا موسم طاری تھا۔ مایوسی کے سیاہ بادل مجھ پہ چھا گئے۔۔۔ بے جان بدن گاڑی کی ٹیک لگا کر دُور تک خالی آنکھوں سے اُسے تلاش کرتی رہی۔ اونٹ تھے اور نہ وہ شہزادہ۔ بے چینی، بے قراری حد سے بڑھ گئی تھی۔

کہتے ہیں عشق سچا ہو تو رب بھی اہل عشق والوں کی مدد کرتا ہے۔ دُور سے ریت اُڑتی نظر آئی۔۔۔ میرے بدن میں خوشی کی اِک برقی لہر دوڑ گئی۔۔۔ بے ساختہ ہی رب کا شکرانہ ادا گیا۔ وہ۔۔ وہ وہی تھا۔ میرا شہزادہ۔ میرے قلب و جاں کا مالک۔ مجھ سے انتظار نہ ہو سکا اور صحرا میں بنے رستے پپ میں گاڑی بھگاتی ہوئی۔۔۔ اُس کے پاس جا پہنچی۔ وہ دُور سے آتی گاڑی دیکھ کر سست رفتا ہو گیا۔۔۔ گاڑی اُس کے پاس جا کر روک لی۔۔۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ آپ یہاں ۔۔۔۔؟۔۔ اکیلی۔۔۔۔۔؟ اُس کی حیرانگی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔۔۔ میں مسکرائی۔۔۔۔

ہاں میں اکیلی۔۔ مگر اب نہیں۔۔۔۔ کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔۔۔ میں نے اُس سے اونٹ کی سواری کی فرمائش کی۔۔۔ اُس نے مجھے اونٹ پر بٹھا لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔۔۔ باتوں باتوں میں اُس سے میں نے اُس کے بارے میں سب پوچھ لیا۔۔۔۔ وہ در حقیقت بنجارانہ تھا۔ باپ کے قتل کے بعد اُس کے خاندان نے اُس کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ وہ اپنی ماں کو لے کر یہاں آ گیا تھا۔ یہ اونٹ اُس کے والد کے تھے۔ وہ شوق سے اُنہیں پالا کرتے تھے۔۔ والد کی دُشمنی میں قتل ہونے کے بعد ابراہیم کی والدہ نے یہ دس اونٹ لے کر وہاں سے ہجرت کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اب ایک جگہ سے دوسری جگہ لوگوں کا سامان پہنچا کر اپنی روزی روٹی کما رہا تھا۔۔ دولت کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ خونی رشتے داؤ پر لگ جاتے ہیں۔۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔۔ دولت کے پجاریوں نے رشتوں کی دیوار گرا دی تھی۔ اب بس دو افراد تھے جن کا گزر بسر اچھا گزر رہا تھا۔ اُس کے چچا اُس کے خون کے پیاسے تھے۔ اب یہاں بہت دُور آ کر وہ محفوظ تھے۔

میں نے اُس سے اپنے دِل کا حال کہہ دیا۔۔ وہ میرے دِل کی بات سُن کر حیران رہ گیا تھا۔ اب اکثر میں مہینے میں دوبار یہاں آیا کرتی تھی۔ میں نے ابراہیم کو موبائل لے کر

دیا۔۔ہم روز بہت سی باتیں کرتے،اپنے مستقبل کی باتیں
،میں بے دھڑک اُس سے شیئر کرتی تھی۔۔۔
ابراہیم بھی مجھ سے اظہار محبت کر چکا تھا۔۔مجھے اونٹ کی
سواری میں مزہ آتا۔۔میں اُس کے اونٹ پر بیٹھ جاتی اور وہ
ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔۔۔ہم بہت سی باتیں کرتے تھے اور
سیر ہوتی رہتی۔۔۔
وقت بہتی ندیا کی مانند بہتا رہا۔اور عشق کا پردہ اُٹھ
گیا۔۔۔پھر مشہور کہاوت بھی ہے کہ عشق اور مُشک
چھپائے نہیں چھپتے۔۔میرے بھائیوں نے مجھ پر شک کیا کہ
میں ہر بار دو دن کے لئے کس کس کی شادی پہ جاتی ہوں۔ابو
سے اُنہیں ڈانٹ پڑی۔۔مگر وہ دِل ہی دِل میں کچھ اور سوچ
چکے تھے۔۔۔فی الحال تو وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے۔ابو
نے مجھے تسلی دی اور کہا۔"اُن کی باتوں کا بُرا نہ منایا کر،جھلے
ہیں دونوں۔۔"
کچھ دِنوں بعد پھر میں نے ابراہیم کو ملنے جانا تھا۔میرے
بہانوں کا سلسلہ اب بڑھتا جا رہا تھا۔میں ابو سے اجازت لے
کر نکلی۔مجھے خبر نہ ہوئی مگر کوئی میرا پیچھا کر رہا تھا۔۔۔۔اور
یہ کام میرے بھائیوں کے علاوہ کون کر سکتا تھا۔۔۔اُنہوں
نے میرے پیچھے اپنے کارندے لگا دیئے۔۔۔وہ پل پل کی خبر
میرے بھائیوں تک پہنچاتے رہے۔جہاں میں اور ابراہیم
ملتے تھے۔وہ کچھ دُور سے ہی میرے تعاقب میں رہتے
۔۔۔اُن کی نظریں مجھ پر تھیں۔۔
ابراہیم نے مجھے اونٹ پر بیٹھایا اور ہم صحرا کی سیر کرنے
لگے۔۔۔ہمیں معلوم نہ تھا کہ کوئی ہمیں فالو کر رہا ہے
۔بھائیوں کے آدمیوں نے میری اونٹ پر بیٹھی کی تصویریں
لے لی۔دو دن بعد جب میں گھر پہنچی تو اک قیامت برپا
تھی۔۔۔
میں نے اپنے ابو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔بھائیوں نے
مجھ پہ تشدد بھی کیا۔۔میری تصویریں امی اور ابو کو دِکھا چکے
تھے۔جس میں ابراہیم بھی واضح نظر آرہا تھا۔۔پوچھنے پر
میں نے ابو کو سچ بتا دیا۔۔کہ میں اُس سے پیار کرتی ہوں اور
اُسی سے شادی کروں گی۔۔۔اِس بات پر بھائیوں کے ساتھ
ساتھ ابو بھی بھڑک اُٹھے۔کافی ڈانٹ اور مار کھا کر مجھے ایک
کمرے میں بند کر دیا گیا۔۔۔موبائل بھی لے لیا
تھا۔۔۔صرف ایک نوکرانی ہی مجھ سے مل سکتی تھی۔جس
کی ڈیوٹی مجھے کھانا دینے تک محدود تھی۔باقی گھر والوں نے
مجھ سے ناتا توڑ رکھا تھا۔۔نازوں پلی نازک حالات میں
تھی۔۔
بھائیوں نے ابراہیم کا پتا لگا لیا۔۔وہ اُسے ایک بنجارا سمجھتے
رہے۔مسئلہ ذات پات کا آرہا تھا۔ہم پٹھان اور وہ ایک بنجارا
تھا۔۔۔حقیقت تو صرف میں ہی جانتی تھی۔میرا دَم گھٹنے لگا
تھا۔سارا دن ایک ہی کمرے میں بند رہنے سے کوفت ہوتی
۔۔۔ایک ٹی وی کا ہی آسرا تھا۔بس سارا دن کبھی کوئی چینل
دیکھتی تو کبھی کوئی۔۔۔۔
اسکرین پر آنے والی تصویر ابراہیم کی تھی اور پٹی میں لکھا آرہا
تھا۔"ایک بنجارے کا بے رحمی سے تشدد کے بعد

اغواء، پولیس تفتیش کر رہی ہے۔"

مجھے فوراًاپنے بھائیوں کا خیال آیا۔۔۔اُنہوں نے ابراہیم کو اغواء کروایا تھا۔۔۔میں نے غصے میں آکر کمرے میں پڑے کچھ شو پیس توڑ ڈالے۔۔۔بہت روئی مگر میری آہ و پکار سننے والا کوئی نہ تھا۔۔۔جانے ابراہیم کے ساتھ میرے بھائیوں نے کیا سلوک کیا ہو گا۔۔۔اک ڈر میرے دِل میں بیٹھ چکا تھا۔۔۔

ابراہیم کو لاہور میں پرانی حویلی کے اک کمرے میں بند کر دیا گیا لیکن قسمت اچھی تھی کہ وہ وہاں سے بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اپنی والدہ کو لے کر جانے کہاں چلا گیا۔۔۔

یہ خبر مجھے نوکرانی نے بتائی کہ بڑے صاحب آج بہت پریشان اور غصے میں لگ رہے تھے۔۔۔جس لڑکے کو قید کیا تھا وہ فرار ہو گیا ہے۔وہ فرار کیسے ہوا،؟یہ میں نہیں جانتی۔میں نے شکر ادا کیا کہ چلو میرے وحشی بھائیوں کے چنگل سے آزاد تو ہوا۔۔۔اِسی فکر میں اب میرے بھائی اور ابو گھر سے نکلے اور اپنے بندوں کے ساتھ ابراہیم کو ڈھونڈنے چلے گئے۔۔۔

موقع اچھا تھا۔میں نے نوکرانی سے کہہ کر پلان بنایا۔رات کو ہم دونوں وہاں سے فرار ہوئیں۔نوکرانی نے ہی مجھے میرا موبائل ATM کارڈز اور میرا پاسپورٹ لا کر دے دیا۔ہم دونوں نے کراچی جانا تھا۔۔میری اک سہیلی کراچی میں حبیب بینک میں مینجر تھی۔ہم اُس کے پاس چلی گئیں۔۔

سکینہ کا کوئی نہ تھا۔وہ کافی عرصے سے ہمارے گھر میں کام

جو تو میرا نصیب ہو جائے
ہم کتنے امیر ہو جائے
دنیا لگے غریب مجھکو
ناشاد سے ہم شاد ہو جائے
پھر مل کر کبھی ہم جدا نہ ہوں
کاش میری یہ دعا قبول ہو جائے
تو جو رہے ساتھ ہمارے
خزاں میں بھی بہار ہو جائے
میرے چہرے پہ جو یہ پھیلے ہیں اداسی کے رنگ
ہنسی کے رنگوں کی دلکشی میں ڈھل جائے
جو تو میرا نصیب ہو جائے
ہم کتنے امیر ہو جائے
از شازیہ کریم

☆ ☆ ☆

نوٹ

داستانِ دل میں اپنی تحاریر آپ ہمیں بذریعہ ڈاک یا بذریعہ ای میل دونوں طریقے سے بھیج سکتے ہیں۔ ای میل کی صورت میں آپ کی تحریر اردو فونٹ میں ہونا ضروری ہے۔اس کے علاوہ آپ اپنی تحاریر ہمیں وٹس ایپ بھی کر سکتے ہیں۔

کرتی اور یہیں رہا کرتی تھی۔۔۔اپنی سہیلی سے کہہ کر، میں نے سکینہ کو کراچی میں کام دِلوادیا۔۔بعد میں میری سہیلی نے اُسے اپنے ہاں رکھ لیا۔۔عینی کا شوہر بہت اچھے اِنسان تھے۔اُس نے معلوم کیا کہ اب ابراہیم کہاں ہے۔؟یہ تو معلوم نہ ہو سکا مگر یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ اپنی ماں سمیت غائب ہو چکا ہے۔اس کے گھر گیا۔گھر کیا تھا اک جھونپڑی ہی تھی۔۔ابراہیم کے گھر کا پتا میں نے بتایا تھا۔۔۔یہ خبر پا کر میں پُر سکون سی ہوگئی لیکن دل میں کسک سی تھی۔کاش میں ابراہیم سے مل سکوں۔۔۔

ہمیں یہاں بھی خطرہ تھا۔خاص طور پر مجھے زیادہ خطرہ تھا۔سکینہ تو گھر میں رہا کرتی تھی۔میں گھر سے باہر نکلتی تھی ۔کبھی عینی کے ساتھ بینک چلی جاتی اور کبھی بازار۔۔۔۔

ایک دن عینی نے میری یہ مشکل بھی آسان کر دی۔میری خالہ انڈیا میں رہتی ہے تم وہاں چلی جاؤ۔۔۔عینی نے کہا۔۔۔سلیمان بھائی(عینی کا شوہر)نے کاغذائی کاروائی مکمل کروائی اور میں انڈیا روانہ ہوگئی۔۔۔جتنے دن یہاں رہی ابراہیم کی تلاش جاری رکھی۔۔۔ابراہیم کا نمبر بند جا رہا تھا۔۔عینی کی خالہ نے شروع شروع میں تو مجھے اپنی بیٹیوں جیسا ہی سمجھا اور پیار دیا۔۔۔

مجھے کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔۔یہاں تک کہ کچن کے سب کام میرے لیے نئے تھے۔۔۔باقی کاموں میں خالہ کا ہاتھ بٹاتی تھی۔پھر جانے کیا ہوا خالہ کا رویہ مجھ سے بدلنے لگا۔عینی نے بھی مجھ سے رابطہ ختم کر لیا۔۔اُس کی خالہ نے پتا نہیں اُسے میرے بارے میں کیا بتایا تھا۔۔۔جب خالہ کا رویہ وحشیانہ ہو گیا تو میں اُن کا گھر چھوڑ کر یہاں اجمیر شریف آ گئی اور اب تین سال سے یہیں اس مزار پہ رہتی ہوں۔۔۔ابراہیم اور والدین کی یاد بہت ستاتی ہے تو جی بھر کے رو لیتی ہوں۔۔اِس کے علاوہ بس اب صرف اور صرف رب کو ہی یاد کرتی ہوں ۔اِس اُمید پہ زندہ ہوں کہ شاید وہ دن آئے کہ ابراہیم مجھے لینے آئے۔۔

****

اُس کے آنسو بہنے لگے۔لہجہ غمگین ہو گیا۔میں نے اُس کے آنسو صاف کیے اور اُس کو تسلی دی۔

دیکھو! تانیہ! یہ زمانہ بہت ظالم ہے۔عشق ذات پات، رنگ دھنگ نہیں دیکھتا مگر یہ زمانہ تو اپنی اَنا کو سر پہ چڑھا کر رکھتا ہے۔ہر کوئی اپنی ناک ہی اونچی رکھنا چاہتا ہے۔تم نے بتایا وہ بٹ تھا۔۔ابراہیم بٹ۔۔اگر میں تمھیں اُس سے ملوا دوں تو تم خوش ہو جاؤں گی ناں۔۔۔اور تمھاری یہ کٹھن زندگی سہل ہو جائے گی۔۔

وہ میری بات پہ حیران ہوئی اور مچل اُٹھی۔ایسے جیسے کوئی چھوٹا بچہ رو کر اپنی من پسند چیز پانے کے لئے تڑپتا ہے۔میں نے تانیہ کو یقین دِلایا اور اُس سے ابراہیم کی تصویر مانگی۔اُس کے پاس تصویر تو نہ تھی مگر اُس نے جواب بہت اچھا دیا۔کہنے لگی۔

''محبوب تو دِل میں بستے ہیں، تصاویر نہ بھی ہوں تو اُن کا چہرہ ہر وقت نگاہوں میں رہتا ہے۔''

اُس کی بات نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔۔

ابراہیم بٹ کا تعلق کشمیر سے تھا اور وہ میرا اچھا دوست تھا۔ جب سے اُس کے والد کا قتل ہوا تھا، مجھ سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔۔ میں کبھی کبھی اُسے بہت یاد کیا کرتا تھا۔۔۔ اب خیال آیا کہ شاید اُس کی تصویر میری Friends photo Album میں ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں نے موبائل نکالا اور Album چیک کرنے لگا۔ کرم ایسا ہوا کہ اُس کے تصویر میرے پاس موبائل میں موجود تھی۔۔ میں نے وہ تصویر تانیہ کو دِکھائی۔۔ وہ چونک اُٹھی۔۔

"ہاں یہی ہے میرا شہزادہ"

آپ کیسے جانتے ہیں اِسے؟ وہ بے چینی میں پوچھنے لگی۔ اب تو ابراہیم کو ڈھونڈنا اور بھی ضروری ہو چکا تھا۔ دو دیوانے مل جاتے تو، مجھے بھی قرار آتا۔۔۔

ابراہیم بچپن میں کہا کرتا تھا۔ "مجھے اُس پری سے پیار ہو گا جس کی آنکھیں نیلی اور جھیل سی گہری ہوں گی۔ اُس کی زُلفیں گھنی اور لبوں پر اک مسکراہٹ اور معصومیت ٹھہری ہو گی۔" آج اس کی کہی بات مجھے بے حد یاد آئی۔ سچ میں اُس وقت قبولیت کا وقت تھا۔ ابراہیم کو چاہنے والی تانیہ بالکل اُس کے خوابوں کی شہزادی جیسی ہی تھی۔ اب ابراہیم کو ڈھونڈنا لازمی ہو گیا تھا۔۔۔ مگر کیسے تلاش کیا جائے۔؟ میں گہری سوچوں کی وادی میں غوطہ زن ہو گیا۔ تانیہ مجھے تکے جا رہی تھی۔ جیسے وہ میرے جواب کی منتظر ہو۔۔۔

ابراہیم، عمران اور میں بچپن سے کلاس فیلو رہے تھے۔۔ اب اک عمران ہی ایسا شخص تھا جو ابراہیم کا کھوج لگا سکتا تھا۔ میں نے عمران کو فون لگایا اور ابراہیم کو ڈھونڈنے کی ذمہ داری سونپ دی۔۔۔ میں کچھ دن مزار پہ ہی رُک گیا۔۔۔ جب تک ابراہیم کا سُراغ نہ مل پایا، میں نے گھر واپس جانے کا پروگرام ترک کر دیا۔

عمران C.i.D آفیسر تھا۔ اُس نے ابراہیم کا سُراغ لگا ہی لیا۔ تین دن بعد عمران کی کال آئی اور اُس نے خوش خبری دی۔۔۔ "ابراہیم مل گیا ہے۔" وہ فیصل آباد کے اک گاؤں میں رہتا ہے اور اک زمیندار کے ہاں مزارعے کے طور پر کام کرتا ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ اُس کی ماں اِس جہاں سے پردہ کر چکی ہے۔ میں نے سب کچھ تانیہ کو بتایا تو وہ خوشی سے مچلنے لگی ۔۔ اُس کی خوشی دیدنی تھی۔۔۔ اُس کو دیکھ کر میں حیران تھا۔۔۔۔ کیا عشق ایسا ہی ہوتا ہے۔؟ مجھے عشق کے رموز کا کیا پتا۔۔۔ شاید اس سچے اور پاک جذبے کو نہ سمجھ سکوں ۔۔۔ کیونکہ مجھے آج تک پیار ہوا ہی نہ تھا۔۔ وہ اک لڑکی نے میرے سب جذبات، احساسات بیدار کر دیئے تھے۔۔۔

ایک طویل عرصے بعد آج پھر سے تانیہ کو دیکھ کر مجھے اپنا عشق یاد آ گیا تھا۔ جسے بڑی مشکل سے بھلایا تھا۔۔۔ اور بس یہی کہہ کر دل کو سمجھایا تھا کہ مجھے عشق ہوا ہی نہیں تھا۔۔۔

تانیہ کو لے کر میں انڈیا سے واپس پاکستان آ گیا۔ کاغذی کاروائی میں کچھ دیر ہوئی اور دسویں دن ہم پاکستان آ گئے۔ عمران کے ساتھ ہم فیصل آباد پہنچ کر مطلوبہ جگہ پہ پہنچ گئے۔ ابراہیم زمینوں پر بیٹھا دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ ہم

تینوں کو یوں اچانک دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔۔۔اُس کے نوالہ اٹک ہی گیا تھا۔۔۔اُس کی آنکھیں حیرات کدہ تھیں۔ محوِ حیرت چند لمحے ہمیں تکتا رہا۔۔یقینی بے یقینی کی کیفیت میں اُس کی خوشی دیدنی تھی۔۔

آج دو سچے عاشقوں کا ملن ہو گیا تھا۔ آج زمین پر تو کیا اُفق پہ بسنے والی مخلوق بھی مسکرا رہی تھی۔ دونوں عاشقوں کو امبر تک رہا تھا اور رب کی رحمتوں کی برسات ہو رہی تھی۔۔۔میں اور عمران بھی ابراہیم کو مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے دونوں کو ساتھ لیا اور گھر لوٹ آیا۔۔۔دوبئی میں میرے بہت سے دوست رہتے تھے۔ میں نے ابراہیم اور تانیہ کا نکاح کروا کر اُنہیں دوبئی بھیج دیا۔ وہ دونوں میرے بہت مشکور تھے اور میں اپنے رب کا شکر گزار تھا کہ اُس نے مجھ سے وہ کام کروایا جو میری آخرت سنوارنے کا سبب بن جائے گا۔۔۔سچا عشق رب کی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ رحمتوں کی ہی برسات ہے کہ عشق زادوں کا ملن ہو جاتا ہے۔

میں بہت خوش تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے دو عاشقوں کو ملانے کا وسیلہ بنایا تھا۔۔۔ابراہیم کو فیکٹری میں نوکری مل گئی اور وہ تانیہ کے ساتھ دوبئی کی فضاؤں میں ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جب کبھی مجھ سے رابطہ ہوتا ہے تو اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں اور اپنا محسن مانتے ہیں۔۔۔

دونوں عشق زادے تو مل گئے لیکن میرے ماضی کو ایک بار پھر سے تازہ کر گئے جسے بُھلانے میں شاید صدیاں لگیں۔۔۔

☆ختم شد☆

شکستہ دل میں فرقت ناچتی ہے
سرِ مژگاں اذیت ناچتی ہے

عجب میلہ لگا ہے نفرتوں کا
جدھر دیکھو کدورت ناچتی ہے

ترے طرزِ تکلم میں نہیں وہ
جو آنکھوں میں شرارت ناچتی ہے

ابھی کچھ دن منا جائیں رہیں گی
ابھی سر مصیبت ناچتی ہے

بنا گھنگھرو تمہارے استاں پر
کسی بے کس کی حاجت ناچتی ہے

سرِ محفل ہے کوئی محوِ رقصاں
پسِ پردہ ضرورت ناچتی ہے

سبھی کردار اکتائے ہیں ارشد
کہانی کی طوالت ناچتی ہے

ارشد محمود ارشد

☆ ☆ ☆

0304-4540950

سفید خون

محسن علی طاب

اسلم کا ایک کریانہ سٹور تھا وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا اُسکی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک بیٹا تھا۔ جو کہ پڑھ رہا تھا۔ وقت نے کروٹ بدلی اسلم کا بیٹا 25 سال کا ہو گیا اسلم کے بیٹے کا نام عالم تھا۔

اسلم نے بہت ارمانوں کے ساتھ بیٹے کی شادی کی اور عالم کو دکان پر بیٹھا دیا۔ اسلم کی عمر 65 سال ہو چکی تھی۔ گزارا اچھا چل رہا تھا۔ مگر عالم کی بیوی شازیہ اُونچی اُڑان کی سوچ رکھتی تھی اس نے عالم کو اپنے ہاتھوں میں کر لیا۔ اسلم نے کچھ نا کہا صبر کیا۔ دو وقت کی روٹی مل جاتی رب کا شکر ادا کرتا۔ ایک دن عالم کو اسکے دوست مشورہ دیا کہ تم 50 ہزار کا بندوبست کر لو۔ خلاں کمپنی میں سرمایہ لگاؤ امیر ہو جاؤ گے تمہارے باپ کا گھر جو پانچ مرلے کا ہے مگر کمرشل ہے 1 کروڑ تو مل ہی جائے گا۔ عالم کو سبز باغ دکھائے۔

عالم نے اپنے باپ سے بات کی اسلم نے انکار کر دیا۔

جب شازیہ کو پتہ چلا اُس نے کہا بڈھا مرتا کیوں نہیں ہے۔

اب دونوں میاں بیوی نے اسلم کو ٹھکانے لگانے کا سوچنے لگے آخر کار انہوں نے پلاننگ کی ایک ٹارگٹ کلر کو 50 ہزار دیئے اور اسلم کا ٹاسک دے دیا۔ اندر سے خوش تھے اور سب کے سامنے مگرمچھ کے آنسو بہاتے رہے۔ وقت آگے بڑھا عالم نے مکان سودا ایک کروڑ میں کر دیا۔ اور کمپنی میں 50 لاکھ کا سرمایہ لگا دیا۔ چین کی بانسری بجانے لگے۔ جس ٹارگٹ کلر نے اسلم کو مارا تھا اُسکا نا جیریکو تھا اصل نام شاہ زیب تھا۔ شاہ زیب نے جب سے اسلم کا قتل کیا رات کی نیند یں اُڑ گئی رات کو خواب میں آ کر اسلم کہتا میرا قصور کیا تھا۔ شاہ زیب بے چین ہو جاتا اُس کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ وہ ذہنی مرض بن گیا۔

ایک دن دوپہر کو عالم اور اُسکی بیوی شاپنگ کر کے واپس جا رہے تھے۔ جب وہ ایک ویران چوک سے گزرنے لگے یک دم آگے ایک موٹر سائیکل سوار آ گیا۔ اُس نے اِن دونوں پر فائرنگ کی دونوں مارے گئے اور موٹر سائیکل دار افرار ہونے میں کامیاب ہو گیا وہ موٹر سوار شاہ زیب عرف جریکو ہی تھا۔ آج رات شاہ زیب سکون کی نیند سویا۔ یہ قدرت کے کھیل ہے جو اپنے والدین کے ساتھ بُرا کرتا ہے اُسکے ساتھ بھی بُرا ہی ہوتا ہے۔ الہ پاک کا حکم ہے جیسا تم اپنے والدین کے ساتھ کرو گئے ویسا ہی دُنیا میں بھگتو گئے۔

0313.5250706

نیلا رومال

یونس ناز

وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔ پلیز اماں بی۔۔۔۔! خاموش ہو جائیں ہم اپنی طرف سے پوری طرح چھان بین کر رہے ہیں۔ جن لوگوں نے اتنی بے رحمی سے یہ کام کیا ہے۔ وہ بچ کر کہاں جائیں گے؟ یہ ادارہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہوا ہے۔ یہاں کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو گی۔ سی آئی ڈی آفیسر ہما خان اس سے مخاطب تھی۔ آپ ہمیں یہ بتائیں۔ شازیہ نے اپنا گھر کیوں چھوڑا تھا؟ عمر رسیدہ خاتون جس کا نام زلیخا تھا۔ تمام روداد ہما خان کے روبرو من وعن کہہ دی شازیہ والدین کی محبتوں سے محروم ایک معصوم سی لڑکی تھی۔ جسکی پرورش مین نے کی تھی۔ اس لئے وہ مجھ سے بہت مانوس تھی۔ لیکن سنجیدگی ہر پل اس کے چہرے سے عیاں رہتی تھی۔ معاً ایک روز ولاور شاہ اور اسکی بیگم عذرا بتول نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا کہ ہم تمہاری شادی ناظم سے کر رہے ہیں۔ جو کہ عذرا بتول ک ابھانجا تھا۔ نہایت ہی آوارہ اور عیاش شخص تھا۔ یہ فیصلہ شازیہ کو کسی صورت میں قبول نہیں تھا۔ بچو اپنے حق کی خاطر پہلی بار صدا بلند کی۔ کہ آج تک تم نے دونوں نے کبھی بھی بھول کر میرا خیال نہیں رکھا۔ یہ یقیناً؟ میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے آن کون ہوتے ہیں؟ تھوڑی دیر کے لیے تو وہ دونوں میاں بیوی سہم گئے تھے۔ کہ جس بزدل لڑکی نے ان کے سامنے کبھی اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی۔ آج ان کے روبرو ہو کر احساس دلا رہی ہے کہ وہ اس جائیداد کی تنہا وارث ہے۔ بس اسی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر ہاسٹل اپنی دوست عینی کے ساتھ رہنے لگی تھی۔۔ سی آئی ڈی آفیسر ہما خان نے درمیان میں بات اچک کر ایک اور سوال پوچھا۔۔۔! کیا انہوں نے صلح کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟ ایسا انہوں نے کیا تھا! مگر خود شازیہ ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ کیونکہ وہ ان سے خوف زدہ تھی کہ دولت ہتھیالے کی خاطر وہ دونوں

کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ زلیخا ٹھہر ٹھہر کر اسے بتا رہی تھیں۔ لیکن ہماخان اس آخری لفظ پر چونک اٹھی۔ کیا مطلب ہے؟ دراصل شازیہ ان دونوں کی حقیقی بیٹی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی پیدائش کے چند سال بعد (جب شازیہ کی عمر کوئی آٹھ برس کے قریب تھی) اس کا والد سیٹھ احمد کمال ایک کار ایکسیڈنٹ میں چل بسا تھا۔ رابعہ بیگم بے حد خدا ترس عورت تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد اپنی فیکٹری میں اسسٹنٹ دلاور شاہ پر بے حد اعتماد کیا کرتی تھی۔ اسی بھرسہ کی بدولت دھیرے دھیرے دلاور شاہ نے رابعہ بیگم کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی بس پھر اسی اعتماد، بھروسہ اور ہمدردی نے دونوں کو رشتہ ازدواج میں باندھ لیا تھا۔ رابعہ بیگم نے یہ فیصلہ، شازیہ کی خاطر کیا تھا تاکہ اُسے ماں کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کا پیار بھی مل سکے۔ جب دن میں اور رات مہینوں اور پھر مہینے سالوں میں بدالنے لگے تو شازیہ نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ لیکن ان کی کالج میں داخلہ لینے کی خوشی بالکل ادھوری رہ گئی تھی۔ جب رابعہ بیگم اسے دلاور شاہ جیسے مکار، فریبی شخص کے سپرد کر کے چل بسی تھی۔ لیکن عذرا بتول سے اس کی شادی کب ہوئی تھی؟ چندہ ماہ قبل ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ اس عمر رسیدہ خاتون زلیخا نے مختصر سا جواب دیا! مگر عذرا تبول اسے کہاں سے ملی تھی؟ ہماخان نے اگلا سوال کیا؟ کیونکہ دلاور شاہ کی پرسنل سیکرٹری تھی۔۔۔ ہوں۔۔!!! ہماخان نے اپنے سر کو جنش دے کر گردن ہلائی۔ اس عمر بوڑھی عورت زلیخا نے اپنی رات کو جاری کیا۔ لیکن اس روز میں نے ان کے کمرے سے کچھ عجیب و غریب بات سنی تھی۔ دراصل وہ کسی رومال کا ذکر کر رہے تھے۔ اس بات کو سننے کے بعد ہماخان نے فوراً اپنی ساتھ لیڈی کانسٹیبل نادیہ کو مخاطب کر کے متعلقہ چیزیں اپنے سامنے لانے کو کہا۔۔۔ کچھ دیر بعد موقع واردات پر پائی گئی ہر شے ہماخان کے سامنے تھی بس پھر اس نے اپنے سامنے سے رومال اٹھا کر پوچھا؟؟ کیا اس رنگ کے رومال کا ذکر ہو رہا تھا؟ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد زلیخا نے کہا۔۔۔ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتی ہوں۔ مگر ہاں۔۔! ان کے الفاظ یہی تھے کہ نیلا رومال بس اس سے آگے کچھ نہیں سن سکی تھی۔۔۔ ٹھیک ہے آپ یہاں سے جائیں! مگر ذرا احتیاط سے تاکہ ان دونوں کو کسی قسم کا آپ پر شک نہ ہو۔۔۔ زلیخا خاتون اسے ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئی۔

ایک بار پھر ہماخان اس شہر کے مہنگے ترین ڈریم ریسٹورنٹ میں تفتیش کے لیے مینجر نورالدین کے سامنے ایک پر وقار انداز میں براجمان ہو کر مختلف نوعیت کے سوال کرنے لگی۔ کی آپ بتا سکتے ہیں کہ شازیہ یہاں کس کے ساتھ آیا کرتی تھی؟ میڈم! صرف ایک نوجوان ہیڈسم شخص تھا۔ مجھ اس کا نام تو معلوم نہیں ہے۔ مگر اسکی ایک عادت میرے لئے حیران کن تھی۔ ہماخان کی آنکھوں میں اس انوکھے انکشاف پر تحیر سا تھا۔ ایسی کون سی بات تھی؟ میڈم! اکثرہ وہ نیلے رنگ کا رومال استعمال کر کے پھینک دیا کرتا تھا کی اس رنگ کا رومال یہاں مل سکتا ہے؟ ہاں! میرے کاونٹر پر ایک بار اس

نے رومال سے اپنے ہاتھ صاف کیے تھے۔ کیا وہ مل سکتا ہے؟
ہماخان نے تجسس کی لے پر دوبارہ اسی سوال پر زور دے کر
اس سے کہا آف کورس میڈم! چند لمحوں بعد اس نے الماری
سے وہی نیلے رنگ ک اروما ل نکال کر دے دیا۔ جیسے سی آئی
ڈی آفیسر ہماخان نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور پھر ڈریم
ریسٹورنٹ کے مینجر نورالدین کا شکریہ ادا کر کے یہاں سے
چلی گئی۔۔۔!

اس تفتیش کے بعد ہماخان اپنے گھر میں تنہا کمرے میں اپنی
مخصوص کرسی پر براجمان اس کیس کے متعلق کافی سوچ و
بچار میں تھی کہ معائیلی فون کی گھنٹی نے اس کی گہری سوچوں
میں ارتعاش پیدا کیا۔ جب وال کلاک پر نظر دوڑائی تورات
کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ پھر ریسور اٹھا کر جیسے ہی ہیلو کہا۔ تو
دوسری جانب اک سہمی ہوئی صدا اس کے سماعتوں سے
ٹکرائی۔ یہ انسپکٹر ہماخان صاحبہ کا گھر ہے! ہاں میں سی آئی ڈی
آفیسر ہماخان بات کر رہی ہوں۔ آپ جو بات کہنا چاہتی ہیں۔
بلاخوف کہہ دیں۔ میڈم! اس روز میں نے آپ سے جانی
پہچانی اک آواز کا ذکر کیا تھا۔ وہ شخص سفیر ہی تھا۔ جسے میں
نے اکثر عذرا بتول کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔ میرے لیے
حیران کن بات یہ تھی۔ کہ اس شخص کی دوستی شازیہ بی بی
کے ساتھ بھی خوب تھی۔ جب سفیر کے مطلق بتایا تو مجھے یہ
کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ ان کی فیکٹری اکاونٹنٹ ہے اور یہ
کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایک ہی سانس میں زلیخا نے ڈھیر
ساری انفارمیشن دے کر کچھ پل کے لیے خاموش رہنے کے
بعد دوباری گویا تھا کہ میڈم! مجھے دور سے کسی کے یہاں آنے
کی آہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ اس لئے ٹیلی فون بند کرتی
ہوں۔ بس پھر فوراًدوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ اور
ہماخان کے چہرے سے طمانیت چھلک رہی تھی۔ جو اس با کا
ثبوت تھا کہ وہ اس پیچیدہ کیس کی تہہ تک پہنچ چکی ہے۔

چنانچہ اگلی صبح سی آئی ڈی افیسر ہماخان اس شہر کی سب بڑی
فیکٹری کے اندر موجود اپنے مخصوص اندار میں سب ملازمین
سے باز پُرس کر رہی تھی۔ پھر اس سمے غالباًایک وسیع و
عریض کمرے میں میٹنگ شروع تھی۔ سب لوگ جمع تھے۔
ہماخان نے دلاور شاہ کے ساتھ اُسکی بیوہ عذرا بتول اور سفید کو
گرفتار کرنے کا حکم دیا۔۔ دلاور شاہ غصے سے لا بھبھوکا ہونے
لگا۔ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ وہ زہر خند لہجے میں چلایا۔ مجرم کو سزا
ملنی چاہیے!! ہماخان نے نہایت پر سکون انداز میں جواب
دیا۔ لیکن میں نے کیا کیا ہے؟" مرڈر" اپنی بیٹی شازیہ کا قتل!
تمہارے اس مکروہ اور وحشی کھیل میں تمہاری بیگم عذرا بتول
اور بےچارہ اکاونٹٹ سفید بھی شریک تھا۔ تم جیسے سنگدل
انسان رحم کے قابل بالکل نہیں ہو۔ جو محض دولت جائیداد
کی خاطر انسان کی قیمتی جان کو اپنی وحشت اور درندگی کی نذر
کر کے آزاد گھومنا اپنی شان و شوکت سمجھ لیتے ہیں لیکن خالق
کائنات بڑی قدرت والا ہے۔ جب پکڑنے پر قادر ہوتا ہے تو
کسی کو معاف نہیں کرتا! اور تم سب معافی کے قابل بالکل
نہیں ہو۔ اور سفید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بیچارہ
اپنی خاص عادت یعنی رومال ایک ہی مکر اور ایک ہی سائز کا

استعمال کرنا پھر پھینک دینا مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو۔ اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ اور ہم سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ کیونکہ جھوٹ اور برائی کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ کیوں مسٹر سفید میں صیحح کہہ رہی ہوں؟ ہما خان نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ تو وہ ہو اس باختہ ہو کر بلبلد نے لگا میڈم! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس سازش میں میری کوئی رائے شامل نہیں تھی۔ دراصل یہ قتل دلاور شاہ اور اُسکی بیوی عذرا بتول نے مل کر کیا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے سب کچھ اگل دیا۔۔ نوکری کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ یہاں پر قسمت آزمائی کی تو انہوں نے میری مجبوری کو دیکھ کر ایک شرط رکھی کہ کسی طرح شازیہ سے جھوٹی محبت کا ڈرامہ چلا کر ،اسے اپنے اعتماد میں لیکر ان تک پہچانا ہے۔ بس پھر شروع میں ہماری دوستی تھی۔ اور اس کے بعد یہی دوستی محبت میں بدل گئی۔ شازیہ کو مجھ سے واقعی محبت ہو گئی تھی۔ وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی۔ لیکن خود کو اب بد قسمت سمجھتا ہوں کہ اس کے سچے جذبوں کی قدر نہ کر سکا۔ محض اس نوکری اور کچھ بھاری رقم حاصل کرنے کی غرض سے صراط مستقیم سے بھٹک کر کانٹوں پر سفر کرنے لگا تھا۔ دولت کے نشے میں اندھا ہو چکا تھا۔ جبھی تو انسانیت سے کافی دور جا چکا تھا۔ پھر ایک دن شازیہ کو اپنے پیار کے جال میں الجھا کر کوک میں نشہ آور گولیاں ملایں اور اسے پینے کے لیے پیش کیا تو اس نے خوشی خوشی پی لیا۔ جسے پینے کے بعد اسکی آنکھوں میں اندھیر سا چھانے لگا تھا۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو کر میری باہنوں کی پناہوں میں تھی۔ اسے بڑے محتاط انداز میں گاڑی تک لے آیا تھا۔ چونکہ یہ دونوں گاڑی میں پہلے ہی سے موجو د تھے۔ اس نے دلاور شاہ اور عذرا بتول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ شازیہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ بس پھر ان دونوں نے سب سے پہلے اس کا گلہ دبا کر نہایت ہی سنگدل اوبے رحمی کیساتھ قتل کر ڈالا تھا۔ ایسا تو کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس پل میرے پورے وجود پر کپکپاہٹ طاری تھی اور بوند بوند پانی میرے چہرے پر ٹپک رہا تھا۔ خوف کی وجہ سے میرا دم بھی نکلنے لگا تھا۔ نیلے رنگ کا رومال استعمال کرنا پھر پھینک دینا میری سرشت میں شامل تھا۔ چنانچہ اس پل بھی اپنی حالت پر قابو پانے کے لیے اپنی پاکٹ سے رومال نکال کر چہرہ خشک کر کے وہی پھینک دیا تھا۔ میں بُری طرح ان کے بنائے ہوئے جال میں پھنس چکا تھا۔ اس لئے وہی کیا جو ان دونوں نے چاہا تھا۔ پھر قتل کرنے کے بعد گاڑی کو کسی سنسان جگہ پر جا کر روک دی تھی۔ اور ان کے ساتھ گھر کی جانب چلا آیا تھا۔ لیکن تب سے لیکر اب تک میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے۔ تمام روداد سنانے کے بعد سفید کے چہرے پر ندامت عیاں تھی۔ اب وہی نیلا رومال تم تینوں کے لیے پھانسی کا پھندرہ بن چکا ہے۔ ہما خان نے اس کی بات کے مکمل ہونے پر کہا۔ کچھ پل یونہی بیت گئے۔ پھر ہما خان سفید سے مخاطب تھی۔ تم نے دولت اور نوکری کی خاطر رزق حلال کی بجائے اپنے خمیر کا گلہ دبا کر حرام کو ترجیح دی اور بُرے لوگوں کا ساتھ دے کر کیا حاصل

کیا؟ سوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اچھے لوگ اچھا راہ دکھاتے ہیں۔ اور بُرے لوگ محض سراب ہوتے ہیں۔ جنکی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ دین و دنیا میں اپنے لئے خسارہ پسند کرتے ہیں ایسے لوگوں کا ضمیر مردہ ہو چکا ہوتا ہے۔ بظاہر اندر کہ وہ جو کچھ غلط کام کر رہے ہیں۔ ٹھیک کر رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ پاک کا خوف ایسے لوگوں کے دل و دماغ پر قطعاََ اثر انداز نہیں ہوتا۔ جبھی تو ایسے لوگ صراط مستقیم کی بجائے ابلیس کے بتائے ہوئے طریقے پر چل پڑتے ہیں پھر اختتام حسرت، افسوس اور کاش پر ہوتا ہے۔۔۔۔!! جیسا کہ اس وقت تم تینوں کے چہرے پر عیاں ہے۔۔۔ ہما خان نے نہایت ہی دلکش انداز میں سفید دلاور شاہ اور عذرا بتول کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے حق اور باطل میں فرق واضح کیا۔ پھر کچھ پل وہ سانس درست کرنے کے لیے خاموش رہی۔ اور پھر اپنی بات کو جاری کر کے دلاور شاہ کی طرف اشارہ کیا۔ جس جائیداد کی خاطر تم نے منصوبہ تیار کر کے معصوم اور بے گناہ لڑکی کو بے دردی اور وحشت کیساتھ قتل کیا ہے۔ وہ دولت اور جائیداد تو اب مکمل طور پر ٹرسٹ کے منتقل ہو چکی ہے۔ شاید تم نے اپنی سابقہ بیوی رابعہ بیگم کی وحیت کو توجہ سے نہیں پڑھ تھا۔ کہ شازیہ کے بعد تمام جائیداد اور دولت ٹرسٹ کے نام منتقل ہو جائے گی۔ دلاور شاہ! ابلیس ہمیں صراط مستقیم سے ہٹا کر سرسبز سنہری خواب دکھا کر اپنی راہ پر لے آتا ہے۔ مگر اختتام خسارے پر ہوتا ہے۔ کوئی مجرم بچ نہیں سکتا کیونکہ آج کی انتظامیہ بیدار ہو چکی ہے۔ اور ہر مجرم اپنے کئے کی سزا بھگت کر رہے گا۔ پھر ہما خان نے ان تینوں کی گرفتاری کا حکم دے کر اپنے فرض کو ایمانداری کے ساتھ پورا کر کے دکھایا۔۔ سفیر، دلاور شاہ اور عذرا بتول ندامت سے سر جھکائے اپنے مکروہ اور وحشی فعل کی سزا بھگتنے کے لیے سی آئی ڈی آفیسر ہما خان کے سنگ دھیرے دھیرے چل پڑے۔۔۔۔!

سو لفظی کہانی

سپورٹ از ثوبیہ اجمل

وہ نئ نئ اسکول میں آئی تھی. جلد ہی اسے دو سہیلیاں مل گئیں. بہت سی باتیں ہوئیں. جلدی ہی تینوں بیسٹ فرینڈز ہونے کا دعوہ کرنے لگیں. وہ اپنی ہر بات ان سے شیئر کرتی. اس کے لئے اسکی سہیلیاں بہت اہمیت اختیار کر چکی تھیں. ایک دن اس کا کسی سے جھگڑا ہوا. بات اس کے کردار تک آنے لگی. اس کی سہیلیاں خاموش کھڑی رہیں. وہ منتظر رہی ان کی سپورٹ کی. وہ کچھ نہ بولیں. وہ لڑائی بھول کر وہاں سے چل دی. سہیلیوں پر جو اسے مان تھا وہ مان ٹوٹ گیا.

سچی خوشی

پیا سحر

فرید تمہیں یاد ہے کل چاند رات ہے، موج مستی کا فل پروگرام ہے" مومن نے فرید کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔ فرید اور مومن گہرے دوست تھے مومن کھاتے پیتے Under گھر سے جبکہ فرید ایک غریب گھر کا لڑکا تھا مگر دونوں میں بلا کی تھی۔ بالکل یار مجھے اچھی طرح یاد ہے تم فکر نا کرو میں پہنچ جاؤں گا۔ فرید نے گھڑی پہ ٹائم دیکھ کر کہا اور پھر بولا اچھا Standing اب میں چلتا ہوں امی انتظار کر رہی ہوں گئیں۔ یہ کہہ کر وہ گھر کی جانب چل پڑا چاند رات ان لوگوں کے لیے اصلی عید اور سچی کا باعث بنتی تھی کیونکہ چاند رات کو وہ لوگ تمام رات گھومتے اور شاپنگ کرتے تھے فرید کے لیے پہلے پہل کرنے یہ سب افورڈ کرنا مشکل تھا لیکن جب سے اس نے پارٹ ٹائم جاب شروع کی تھی تب سے اپنی اس واحد عیاشی کے لیے کچھ نا کچھ بچا کر رکھ لیتا تا کہ چاند رات پہ کام آئے گھر آکر فرید کھانا کھا کر سونے کے لیے چھت پر چلا گیا گرمی غضب ڈھا رہی تھی بدن سے پسینہ یوں بہہ رہا تھا جیسے نہا کر آئے ہوں فرید بھی گرمی سے بے چین ہو اٹھا اس نے شرٹ اتار کر رکھ دی اور خود منڈیر پر بیٹھ گیا وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا جب اس نے کچھ آوازیں سنی۔۔۔ جن کو سن کر وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا گیا اس کی سوچیں دور کہیں ماضی میں بھٹکنے لگیں بابا سب کے نئے کپڑے ہیں مجھے بھی اس عید پہ نئے کپڑے دلا دیں۔ اس نے معصومیت سے باپ سے مانگ کی، باپ کے ماتھے پہ سوچ کی لکیریں گہری ہو گئیں باپ نے بچے کو شانوں سے پکڑا اور کہا، بیٹا جی آپ کے پاس تو ابھی کپڑے ہیں نا پھر کیا ضرورت ہے کپڑوں کی، وہ آٹھ سال کے بچے کو ایسی باتیں سمجھانا چاہ رہا تھا وہ باتیں اس عمر میں سمجھنا بچے کے بس کی بات نا تھی، لیکن بابا جانی وہ تو پرانے ہو گئے ہیں مجھے نئے کپڑے چاہیے بس۔۔۔ بچے نے ضد شروع کر دی باپ نے بچے کو گود میں بٹھا لیا اور اس کے

بالوں پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ بیٹا آپ سمجھ نہیں رہے بابا جانی کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں جن سے وہ آپ کو نئے کپڑے بھی دلا دیں اور گھر کا نظام بھی چلا سکیں اگر ہم کپڑے لے لیں گے تو عید پہ مزے مزے کے کھانے کیسے پکائیں گے؟ کھانے کے نام پہ بچہ سوچ میں پڑ گیا بچے کو سوچ میں ڈوبا دیکھ باپ مزید بولا، آپ کو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا شوق بھی تو ہے، بس جس انسان کے پاس زیادہ سامان ہو مثلا جوتے، کپڑے، کھلونے کوئی بھی چیز وافر مقدار میں ہو اس کا حساب بہت سخت ہوتا ہے جس کے بعد وہ جہنم میں چلا جائے گا اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر باپ کی پیچیدہ وضاحت بیٹے کی سمجھ میں آئی یا نہیں پر وہ احترام میں چپ رہا ماں نے اس کو سمجھا رکھا تھا باپ سے بحث اور بے جا بات نہیں کرتے سو وہ جا کر گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ بچوں کے اونچا اونچا بولنے کی آواز اس کو ماضی سے کھینچ لائی نیند میں بھی اس کے ایک بات گردش کرتی رہی۔ سچی خوشی تو عید کی روزے دار کے لیے ہوتی ہے جو اسے مل کر رہتی ہے نئے کپڑے جوتے تو ایک رواج سا بن گیا ہے۔ اگلے دن فرید نے روزہ رکھا اور تلاوت قرآن پاک کرنے لگا پھر جیسے ہی اجالا ہوا وہ ماں کو کسی کام کا بتا کر گھر سے نکل گیا صبح سے دوپہر ہو گئی دوپہر سے سہ پہر مومن بھی کافی دفعہ پوچھنے آ چکا تھا ہر بار اس کو فرید کی ماں سے ایک ہی جواب ملتا کسی کام کا کہ کر گیا تھا ابھی تک لوٹا نہیں اسی طرح شام ہو گئی افطاری کا وقت قریب آ رہا تھا مومن نے سوچا اب ضرور فرید گھر آ چکا ہو گا اسی امید پہ

مومن ایک بار پھر وہ فرید کے دروازے پر پہنچ گیا ابھی اس نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ یکایک اس کو گلی کے کونے سے فرید اتار اد کھائی دیا اس کے دونوں ہاتھوں میں ڈھیر سارے شاپنگ بیگز تھے مومن انتظار کرنے لگا جیسے ہی وہ قریب آیا مومن اس پہ برس پڑا کو یار سانس تو لینے دو۔۔۔ آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔ فرید اس کو گھر کے اندر لے آیا ابھی وہ بیٹھے ہی تھے اتنے میں فرید کی امی نے افطاری کے لیے دستر خوان پر بلا لیا مومن کا موڈ خراب تو تھا ہی مگر آنٹی کے خیال سے چپ رہا کچھ دیر میں روزہ بھی افطار ہو گیا جب افطار کر چکے تو فرید مومن کو ایک بار پھر کمرے میں لے گیا اور اس سے پہلے کہ فرید کچھ بولتا مومن بول پڑا تم ہو کدھر صبح سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں اتنے چکر لگا چکا ہوں لگتا ہے اب تو جوتے بھی گھس گئے ہوں گے۔ فرید اس کی بات سن کر مسکرایا بولا کچھ نہیں اوے میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ مومن نے اسکی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تو فرید مسکرا کر بولا۔ میں صبح سے خود کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مومن نے کچھ نا سمجھنے والے انداز میں کہا، کہنا کیا چاہتے ہو صاف صاف کہو پہیلیاں مت بجھواو مومن نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا تو فرید سنبھل کر بیٹھ گیا پھر بولا، یار مومن کال رات مجھ سے پر آگہی کا ایسا در کھال جس نے میری آنکھیں کھول کے رکھ دیں۔۔۔ اور میں پہلی بار ایک حقیقت سے ملا ایک ایسی حقیقت جو ہمیں جھنجھوڑ کے رکھ دے! یار کیوں الجھا رہا ہے صاف صاف بول جو بھی بات ہے۔ اچھا تو سنو، رات کو میں

گرمی کی وجہ سے میں چھت کی منڈیر پر بیٹھا تھا کے مجھے منزہ خالہ کے گھر سے ان کے بچوں کی آواز آئی ان کے بیٹے کے کپڑے نہیں ہیں بیٹی کا دوپٹہ پھٹ چکا ہے گھر میں راشن نہیں عید سر پر ہے پھٹے پرانے کپڑے بھی پھٹ چکے ہیں وہ لوگ عید کیسے کریں گے مومن۔۔۔۔ مظہر چچا کے جانے کے بعد ان کے حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کے بتا نہیں سکتا۔۔۔ منزہ خالہ کی سسکیاں اور آہ زاری سن کر مجھے میرے بابا کی بات یاد آگئی۔ فرید اتنا کہہ کر رک گیا۔ کون سی بات ؟ مومن نے بے قراری سے پوچھا تو اس نے بات آگے بڑھائی۔ بابا کہتے تھے عید ہی روزے در کی سچی خوشی ہے عید کی خوشی خرید و فروخت سے نہیں ملتی روزے دار کو تو اللہ خوش کرتا ہے ن کے عید کے موقع پر کی جانے والی فضول خرچی اگر ہم اسی مال کو کسی کی مدد کرنے میں لگا دیں تو ہی حقیقی خوشی ملتی ہے بالکل سچی خوشی فرید اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا مومن پوری بات سن کر چپ ہی بیٹھا رہ گیا۔ پھر اب ؟ کافی دیر بعد مومن کے منہ سے یہ مختصر جملہ نکلا۔ پھر یہ کے میں اس حقیقی خوشی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں چاند رات پر انجوائیمنٹ کے نام پر فضول خرچی کرنے کے بجائے سچی خوشی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ فرید کی آنکھوں میں پختہ عزم دیکھ کر مومن کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے دل کی دنیا بدل چکی ہے فرید نے شاپنگ بیگز پکڑ کر کہا۔ آؤ اس چاند رات کو یادگار بنائیں کچھ اچھا کر کے سچی خوشی حاصل کریں۔ وہ دونوں شاپرز لیے گھر سے نکل گئے۔

رشتے ناطے

میں ایک خوبصورت انسان ہوں پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا ہوں اپنا بزنس ہے خدا کا دیا ہوا بہت کچھ ہے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میری عمر چالیس سال ہے اور مجھ ایسی عورت کی تلاش ہے جو بہت زندگی سے بیزار ہو جو بیوہ ہو مطلقہ ہو یا پھر کوئی اور مسلہ ہو میں اس کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اس کو زندگی کا ایس اساتھ بناؤں گا وہ اپنے تمام دکھوں پریشانیوں کو بھول جائے گی کبھی بھی اس کو تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ اپنی تمام زندگی اس کے نام لگو دوں گا فوری رابطہ کریں۔

زاہد۔ لاہور

روشنی کا سفر

شازیہ کریم

اوہم کہ اپنے پیاروں کے لئے چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتابی جی کبھی کبھی انسان اتنا بے بس ہو جاتاہ۔ اس دکھ ہی اتنا بڑا ہوتا ہے کہ دو بول تسلی کے بھی ہم بول نہیں پاتے اس وقت سوائے آنسو بہانے کے آپ کچھ بھی نہیں کرسکتے اور ایسا سہارا کسی انسان کی صورت وقت دل چاہتا ہے کوئی ایسا سہارا کندھا مل جائے جس پر سر کر آپ اپنا سارا دکھ بہا دیں ٹمپریری ہوتا ہے بی جی کو شاید کمزوری بھی کیونکہ یہ جسٹ مسٹیک ہوتی ہے اور میں ڈھونڈنا شاید ہماری زندگی کی سب سے بڑی بھی بہنے لگے بی جی مجھ سے بھی بس یہی مسٹیک ہوئی بی جی کو اس نے کہا اور ساتھ ہادیہ نے بتایا اور ساتھ ہی اسکی آنکھوں سے آنسو کر ایک ہی اس کی ہچکیاں پر کنٹرول کرنے کے لیے اپنے ہی کانپتے لرزتے ہاتھ ہونٹوں پر رکھنا کام سی کوشش کر رہی تھی۔ بی جی اس کے بولنے کی منتظر رہی اوچپ چاپ اسکے کرب کو محسوس کر رہی تھی۔ آج بی جی ہادیہ کو بولنے دینا چاہتی تھی تا کہ یہ نازک لڑکی اکیلے خود سے لڑنا چھوڑ دے اسکی آواز میں جو درد کرب تھابی جی کو وہ درد اندر تک چیر رہا تھابی اور کا سوال تحریر تھا جو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کیا معصوم جی نے اسکے معصوسے چہرے کو دیکھا جہاں اپنے اوپر کیئے گئے ہر اس درد ظلم جذبات روند دے اور اسکی ذات عزت کو پیروں تلے روند دے بی جی کو سادہ ہونا بڑا جرم ہے کہ لوگوں کا جب دل چاہے گا اسکے کی مالک لڑکی کے چہرے پر کچھ نہ ملا سوائے ظلم اس پاکیزہ دل اور اتنے پیارے دل اسکے معصوم اور کسی عیاری سے پاک چہرے پر ساتھ ہی بی جی۔۔۔اسکی آنکھوں کی اداسی کرب میں کچھ اور اضافہ ہو اتھابی جی آپکو ایک بات بتاؤاور یہ کہتے ہوئے کی داستاں کے اپنے آپکو سکون دیکنے کی کے لئے کسی اپنے کی پناہ کرتے کرتے انسان تھک جاتا ہے اور کی گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا جیسے بہت سفر میں بھر کر بہت سارا جو بی جی نے نوٹ کی تو انکادل بے ساختہ اس معصوم لڑکی کو اپنی بانہوں کیفیت تھی ہو ہادیہ کی بھی یہی چاہتابی جی جسے ہم اپنا سہارا سمجھ کر اپنا آپ ۔اپنا سب کچھ سونپ پیار کرنے کو چاہا لیکن بی جی ایسے خاموش بیٹھی رہی اور اسے بولنے دیا وہ ہمارے دکھ پر مرہم تو رکھ دیتے ہیں جسٹ وقتی اور جنہیں ہم اپنا سب کچھ سمجھ کر

اپنی چھوٹی چھوٹی دکھ شیئر دیتے ہیں تا کہ عادی ہو جاتے ہیں
کہ پھر ہر کوشی ہر غم اس انسان سے وابسطہ ہو جاتا ہے ان کے
بغیر جینا کا تصور بھی نہیں کر سکتے کرنے کے اتنی انکی زندگی کی
واحد خوشی وہی تو ہوتی ہے انکی آنکھوں کی چمک زندگی کی
سب رونقیں اس ایک انسان سے تو وابسطہ ہو جاتی ہے پھر
وہی ایک دن ایسا زخم دے جاتے ہیں جسکی کمی انہیں عمر بھر
رلاتی ہے اور سوچتے نہیں کہ اپنی مادی خواہش کو پورا کرنے
کے لئے عمر اندھیروں کی نظر کر کے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں
اور پیچھے مڑ کر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کوئی ان کے روشنی بجھا کر
بھر کسی کی آنکھوں کی روشنی اسطرح چھوڑ کر جانے پر اندر
سے مر گیا ہے جس کی زندگی اب وہ اندھیروں کے حوالے کر
کے جھوڑ گیا ہے تو کیا وہ اندھیرا گا وہ میں بدلے گا اور وہ کمی وہ
خلا کبھی بھرے گا یا کوئی اور فریب و مکر کا چہرہ لئے پھر اس
معصوم کی زندگی کو اور اجیران کر جائے کبھی بھر تا نہیں ہے
بی جی جس سے ہر پل ہمارا خون رستا ہے یہ ایسا دکھ ہوتا ہے جو
نہ مرنے دیتا ہے اور نہ ہی جینے انسان زندہ کمی وہ خلا جو سب
کچھ اس انسان کو سونپ کر آزاد ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں
اب یہ انسان ہمیں لاش بن جاتا ہے۔ کیونکہ ہم کمزور لمحوں
میں ہم سے زیادہ جانتا ہے ہمارا ہر دکھ ہر غم کا ساتھی ہے جسے
ہمارے ٹوٹنے نظر آتا ہے ہماری تکلیف کا دنیا میں سب سے
زیادہ پتہ ہے کہ کس حالات سے ہم کب کس وقت گزرے
کیا تکلیف ہمیں محسوس ہوئی ٹوٹ کے بکھرنے کا دکھ کیا ہوتا
ہے ہمارا جسٹ یہی ایک سمجھتا ہے اور کیوں یہ یقین کر لیتے

ہیں اس انسان پر کہ وہ زمانے کی ہر بری نظر سے سرد و گرم
انسان ہے جو پوری دنیا میں ہمیں حالات سے بچا کر رکھے گا
اور ہمیں تنہا نہیں چھوڑے اپنے بہت پاس اپنے سینے سے لگا
کر رکھے گا لیکن نہیں بی جی ایسا نہیں ہوتا وہ ہم غلط ہوتے ہیں
جسٹ اس وقت سب جھوٹے سہارے آپ کو اکیلا دنیا کی
بھیڑ میں پل پل مرنے تڑپنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو ہماری
روح میں چھپی اذیت کو بھی جان لیتا ہے ہمارا ٹوٹ کر بکھرنا
جسٹ ہے جو ہمیں سنبھلتی ہے ایک پاک رب کی ذات ہوتی
ہر اس رات کو جو ہم نے تنہا ایک واحد رب کی ذات جانتی ہے
ہمارے دکھ کو ہمارے کرب میں گزری تڑپتے بلکتے گواہ ہوتی
ہے تو بی جی ہم کیوں بھٹک جاتے ہیں کیوں جھوٹے سہاروں کو
دائمی پاک رب کی ذات واحد گزاری ہوتی ہے جسٹ اس
سہارا سمجھ لیتے ہیں کیوں نہیں اپنا دکھ جسٹ اپنے رب کو
سناتے جبکہ ہمیں سب پتہ ہے کہ وہی ہنستا ہے وہی رولاتا ہے
ایک وہی ہے اور ساتھ ہی سوال بھی کرتی جا رہی تھی اوبی جی
اسکے چہرے پر پھیلی جو ہمارے دکھ کو سمجھتا ہے آج ہادیہ اپنا
دکھ بی جی کو بتا رہی تھی زردی دکھ کو محسوس کر کے اس نازک
تان پان سی لڑکی کے لئے اندر تک رنجیدہ تھی وہ چاہا کر بھی
اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی بی جی نے گہرا سانس لیا
جب دیکھا کہ اب وہ اپنے اندر کا سارا دکھ کرب نکال چکی اور
اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی تو بی جی نے کہا ہے تو وہ بس
خاموش آنسو بہاتی سر اٹھا کر بی جی کو دیکھنے لگی اس لیے کہ وہ
رب ہمیں کیوں آزماتا ہمیں وہ پاک رب بیٹا پتہ ہے تمہیں

اپنے قریب کرنا چاہتا ہے تمہیں عام سے خاص بنانا چاہتا ہے
تمہیں اپنا آپ دینا چاہتا ہے کیوں کہ وہ تم سے بہت پیار کر تا
ہے اس لیے تک جو رب جب جب تک یہ آزمائش جاری
رہتی ہے تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہے اپنے لیے تمہاری محبت کو
خالص بنانا چاہتا ہے اس لئے جاتی وہ آزمائش تکلیف کرب ہی
لگتی ہے لیکن جب تم اسکو سمجھ گئی اسکی محبت کے معیار پر
پوری اتر سکھانا چاہتا ہے تم اس کو سیکھ نہیں گئی اور تمہارا دل
ہر طرح کے کھوٹ وسوسوں سے پاک ہو گیا۔

اسے پتہ تھا کہ وہ انتہائی خوش ہم لڑکی ہے ہر بات سے اپنی پسند کے مطالب خود ہی اخد کر لیا کرتی۔ مگر اپنے بارے میں زونیشہ کے خیالات سن کر اصفان کا سچ مچ چکرا گیا تھا۔ وہ خوش فہم لڑکی اصفان کے خیلار کھنے، فکر کرنے کو اس کی محبت سمجھ بیٹھی تھی۔ہاں وہ اس سے محبت کر تا تھا مگر ایک دوست، رہنما اور ہمدرد کی حیثیت سے۔ وہ کیسے ماں کو بتا تا کہ وہ ان کی بھانجی کا اس قدر خیال صرف انہیں خوش دیکھنے کے لیے رکھتا ہے۔ خالہ کے گزر جانے کے بعد ان لوگوں نے کبھی اسے ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ مگر اب زونیشہ کی آنکھوں میں اپنا نام دیکھ کر اصفان عجب دوہر اہے پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف اس کی ماں کی خواہش اور زونیشہ کی خوشی تھی تو دوسری طرف اس کا پیار تھا۔ماور اس کا عشق تھی جنون تھی الگ بات کہ ماں کے سامنے اس کا ذکر تا حال نہ کر پایا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماوف ہو تا جار ہا تھا۔ زونیشہ معصوم تھی وہ کیسے اس کانچ سی گڑیا کے کچے خواب پل بھر میں زمین بوس کر دیتا مگر اپنے خوابوں سے دستبر دار ہونا بھی اس کے لیے جان لیوا تھا مور اسے دستبر داری کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ اے رب دوجہاں میری مدد فرما۔ میں مشکل میں نہیں ہوں بلکہ مشکلوں نے مجھے گھیر الیا ہے۔ میرے لیئے فیصلہ کرنا بہت کٹھن ہے مجھے راستہ دکھا۔ صنم لاگی تم سے من کی لگن۔

از قلم مہوش ملک

آپ کا بہترین دوست کون ہے؟

*میرا بہترین دوست غلام مصطفی ہے مگر آجکل رابطہ ذرا کم ہے وہ اور میں دس سال ایک ساتھ پڑھتے رہے۔ وہ اچھی ذہانت کا مالک ہے ایم فل کیمسٹری کی چکا ہے۔ (عبد السلام آرائیں بہاولنگر)

*میرا دل ہے میں اسے جو سمجھاتا ہوں یہ سمجھ لیتا ہے جہاں سے روکتا ہوں رک جاتا ہے میرا کہنا مان لیتا ہے مجھے رسوا نہیں کرتا اسی وجہ سے میرا دل میرا بہترین دوست ہے۔ اے دل سانول تجھے سلام۔ (آصف سانول۔ بہاؤلنگر)

*میرا سب کچھ مدھو جی ہے جب سے ان سے ملاقات ہوئی ہے کسی اور سے بات کرنے کو دل نہیں کرتا مجھے ناز ہے اپنی جان پر سدا خوش رہو آمین۔ (ایم وائی سچا۔ جدہ)

*میرا بہترین دوست جواب عرض ہے کیونکہ اس کی وجہ سے نہ صرف میرے علم میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے مجھے کافی اچھے دوست ملے ہیں۔ (ایم اکرم، حسن پیر بلوچستان)

*میری بہترین دوست ایس وریام ہے اس نے بہت زیادہ مجھ کو خوشی دی بہت اچھی دوست ہے اس کی آواز بہت اچھی ہے اس کی آواز بہت اچھی ہے اس سے بات کرتے بہت اچھا لگتا ہے ایک بار اس سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ (عبد الرحمن گجر۔ نین رانجھا)

*میرا بہترین دوست میری جان مدھو ہے وہ اس لیے اچھی ہے کسی کی باتوں میں نہیں آتی اور بہت پیاری ہے بولتے ہوئے اور بھی اچھی لگتی ہے اس جیسی کوئی نہیں۔ (نامعلوم)

*میرا بہترین دوست قادر تھا لیکن وہ مجھ سے بچھڑ گیا آخر کیوں اچھے دوست جلدی چلے جاتے ہیں اس کی یاد مجھے بہت آتی ہے مگر وہ اب لوٹ کر نہیں آسکتا۔ (رانا بابر علی ناز۔ لاہور)

*میرے بہت سے دوست ہیں میں دوستی میں ہر وعدہ پورا کرتا ہوں مگر میرے ساتھ سب سے دوست وفا نہیں کرتے آج کل صرف پیسہ ہیں اور پیسے سے دوست بھی خریدے جا سکتے ہیں۔ (ایگل محسن علی جٹ، ساہیوال)

*میرا بہترین دوست مجید ہے جو مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑتا اور میں جان دے کر بھی اس ک حفاظت کرتا ہوں آج تک اس نے جو بھی مانگا میں اسے دیا اور وہ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہے۔ (رانا بابر علی ناز، لاہور)

*میرا بہترین دوست لیاقت علی وٹو ہے کیونکہ ہم بچپن سے اکٹھے پڑھتے رہے ہیں اس کا کردار بہت اچھا ہے اور بہت ذہین لڑکا ہے۔ (عبد السلام چوہدری، بہاولنگر)

*میرا بہترین دوست منظور اکبر تبسم ہے جو کہ اس کا عمر ابھی عشق کرنے کا نہیں بلکہ کرکٹ کھلینے کا ہے پلیز پڑھئے یا کرکٹ میں چھکے چوکے لگائیں۔(پرنس مظفر شاہ۔ پشاور)

*میرا بہترین دوست صرف ایک ہی حاجی نصیر تھا جس نے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا اللہ تعالیٰ اسے آباد رکھے آمین۔(محمد صفدر دکھی، کراچی)

*میرا بہترین دوست ثاقب پنڈی وال ہے اس لیے کہ میرے اور اس کے خیالات بہت ملتے جلتے ہیں اور وہ پورے خلوص سے دوستی نبھانا جانتا ہے۔(مظہر نظیر، کیوائی)

*میری بہترین دوست کتابیں ہیں کیونکہ کتابیں ہمیں علم سکھاتی ہیں اور علم ہی کی وجہ سے ہمیں اچھے اور برے کام کا پتہ چلتا ہے۔(ایس انمول، بھابڑا شریف)

*میرا بہترین دوست میری ماں تھیں خداوند انکو جنت نصیب کرے جس کی بے لوث محبت اور شفقت سے آج میں محروم ہوں تنہا ہوں سب رشتے ناطے مطلب کے ہو سکتے ہیں مگر ماں کی دوستی محبت جیسا کچھ نہیں۔(شازیہ چوہدری، شیخوپورہ)

*جی دوستو تو کہتے ہیں کہ آپ اچھے دوست ہو خاص کر سحر کہتی اس آپ وہ بہت اچھے ہو اور وہ میری سب سے اچھی دوست ہے اس سے کال پر بات کرتے بہت اچھا لگتا ہے جس دن بات نہ ہو دن بہت بور گزرتا ہے۔(پرنس عبدالرحمن، گجر گاؤں نین رانجھا)

*میرا بہترین دوست داستانِ دل ہے کیونکہ اس دور میں داستانِ دل جیسا دوست ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے اس لیے میں نے داستانِ دل کو ہی اپنا بہترین دوست بنالیا ہے آئی لو یو داستانِ دل۔(جبرائیل آفریدی، کمر مشانی ناصر آباد)

*میرا بہترین دوست وہ ہے جس کے دل میں قوت ہے برداشت زیادہ ہو اس لیے کہ وہ زندگی میں شکست نہیں کھاتا اور زندگی میں پریشانیوں سے بچ جاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے گھر کے لیے اور پورے معاشرے کے لیے اچھا انسان بن جاتا ہے اور ایسی وجہ سے میرا بھی پسند ہوتا ہے۔(فنکار شیر زمان پشاوری، پشاور)

*میرا بہترین دوست میری کتاب ہے جو نہ ناراض ہوتی ہے نہ مجھ سے کوئی شکوہ بس اب تو ایک میں ہوں اور میری کتاب ہے میرے ساتھ میرے دوستو!(امداد علی عرندیم عباس تنہا، میرپور خاص)

*میرا بہترین دوست وہ ہے جو اچھا انسان بن جاتا ہے اس لئے وہ گھر میں بھی خوش ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ ہمارے معاشرے کے لیے ایک اچھا انسان بن جاتا ہے اور اسی وجہ میرا بھی بہترین دوست بن جاتا ہے۔(فنکار شیر زمان)

نوٹ: آئندہ ماہ کے لیے اس میں آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں جلدی سے ہمیں لکھ کر مسیج کریں اور چند لائن میں اپنے بہترین دوست سے اپنے پیار کا اظہار کریں

Mobile; 0322.5494228

آپ کی زندگی میں چاند کون ہے؟

میری زندگی کا چاند AR ہے، اے آر میں تم کو کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتا آہ میں کتنا بد نصیب ہوں۔ (محمد ارسلان احمد دکھی شانی۔ ڈھوک مراد)

میری زندگی کا چاند میرا لخت جگر محمد شمس الضحیٰ اور میری جان T ہے۔ (حافظ شفیق۔ کوٹلی آزاد کشمیر)

میری زندگی کا چاند میری ماں ہے اور ماں نے بچپن سے لے کر آج تک مجھے روشنی دی ہے اور باقی سب نے دھوکہ دیا۔ (الٰہی بخش غمشاد۔ کیچ مکران)

میری زندگی کا چاند وہ وقت ہے کہ جب میں اپنی ماں کی یاد اتنا روتا ہوں اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری ماں میرے پاس ہے۔ (محمد لقمان اعوان۔ شیخوپورہ)

میری زندگی کا چاند جس کی زندگی میں صرف دکھ ہی دکھ ملے ہوں جس کے مقدر کا ستارہ ٹوٹ گیا ہو اور چاند کو کالا بادل اپنے اندر سمیٹ لیا ہو، وہ کیا بتاؤں کہ زندگی کا چاند کون ہے ابھی منزل ہی چاند ہے۔ (محمد اسماعیل آزاد۔ گھر بونگ)

میری زندگی کا چاند زندگی کا چاند اندھیرا لاتا ہے چڑھتے ہوئے سورج کو سب سلام کرتے ہیں۔ (ساجد رکن۔ شاہ جمال)

میری زندگی کا چاند میری ماں ہے ہم دو بھائی ہیں ہر نماز کے بعد میری ماں ہمارے لئے کامیابی کی دعا کرتی ہے اور اچھے اچھے کھانے پکاتی ہے۔ (آصف وصال، بنوں)

میری زندگی کا چاند میری پیاری امی جان تھی جو مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی ہے دوسرا چاند میرا بھائی ہے اللہ اس کو سلامت رکھے اور میری زندگی کا چاند بن کر چمکتا رہے۔ (نرگس ناز۔ سکھر)

میری زندگی کا چاند میری جان ثناء کنول ہے جس نے مجھے میری سوچ سے بھی زیادہ محبت دی میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں کیسے شکریہ ادا کروں۔ (ایم افضل کھرل۔ ننکانہ صاحب)

میری زندگی کا چاند میرے والدین ہیں اے خدایا اس چاند کو میرے سر پر رہتی دنیا تک قائم رکھنا۔ (ساگر گلزار کنول۔ فورٹ عباس)

میری زندگی کا چاند میری جان نازیہ ہے جس سے میں پیار

کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا نازی میری دنیا تم سے روشن ہے اور تم پر ہی ختم ہے تم ہی تو ہو میری زندگی کا چاند۔(امداد علی عرف ندیم عباس تنہا۔میر پور خاص)

میری زندگی کا چاند اک لڑکی ہے جس سے میں بے انتہا محبت کرتا ہوں۔اور اس کو پانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں میری جان H میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔(رئیس ارشد۔خان بیلہ)

میری زندگی کا چاند وہ جو دور رہ کر بھول جاتا ہے اسے پتہ نہیں میرے پیار پر یقین نہیں میں تمہیں بہت پیار کرتا ہوں۔(محمد سلیم ناز۔خانیوال)

میری زندگی کا چاند میرا بھائی چاچازاد سردار اطہر خان مرحوم میری زندگی کا چاند تھا۔آج اس کی کمی ہے۔(سردار اقبال کان۔سردار گڑھ)

میری زندگی کا چاند وہ لوگ جو اپنے والدین سے محبت سے پیش آتے ہیں۔اور اپنے بڑوں کا احترام کرتے ہیں اور اگر کسی سے محبت کرتے ہیں تو اپنی محبت کو اک امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔(رانا وارث اشرف عطاری۔احمد نگر)

میری زندگی کا چاند میرے والدین ہیں اگر ماں باپ ہیں تو سب کچھ ہے ماں باپ نہیں تو کچھ بھی نہیں خدا تعالیٰ میرے ماں باپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔(عنصر دکھی دیدار۔احمد پور سیال)

میری زندگی کا چاند جنید جانی ہے جو کہ بہت بے وفا انسان ہے جو خود دوستی لگا کر پھر توڑ دیا لیکن پھر بھی میری زندگی میں چاند کی حیثیت رکھتا ہے۔(پرنس مظفر شاہ۔پشاور)

میری زندگی کا چاند میرے ماں باپ ہیں جنہوں نے مجھے دنیا کی ہر خوشی دی اور میرا بھی یہ فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں ماں گھر میں بھی چاند ہے اور زندگی میں بھی چاند کی مانند ہے ان سے بڑھ کر میرے لئے اور کون چاند ہے چاند کے اس پار۔(ممریز بشیر گوندل۔گوجرہ)

میری زندگی کا چاند میں خود ہوں۔کیونکہ ماں جی بچپن سے مجھے چاند کہتی آئی ہیں۔(ناہید۔ساہیوال)

میری زندگی خود ایک چاند ہے۔کبھی گرہن لگ جاتا ہے تو کبھی چاندنی بکھیر دیتا ہے۔لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے میں خود پریشان ہوں(فہد،ایبٹ آباد)

میری زندگی کا چاند آسمان کا چاند ہے۔جو ہر روز طلوع ہوتا ہے۔(واجد۔ملتان)

نوٹ: آئندہ ماہ کے لیے اس میں آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں جلدی سے ہمیں لکھ کر مسیج کریں اور چند لائن میں اپنے بہترین دوست سے اپنے پیار کا اظہار کریں

Mobile; 0322.5494228

کیا آپ اچھے دوست ہیں؟

میں واقعی ایک اچھا دوست نہیں ہوں، مجھ سے کوئی بھی دوستی کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ میرے مزاج ہر کسی سے نہیں ملتے باقی جو پیارے دوست ہیں وہی کافی ہیں۔ پلیز کوئی میرا سکون خراب نہ کرے۔ (شہزاد سلطان کیف۔ الکویت)

میں واقعی ایک اچھا دوست میں ایک اچھا دوست ہوں مگر مجھ سے جو دوستی کرتا ہے پھر بے وفا ہو جاتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس کی سوچ سے بھی زیادہ پیار دیتا ہوں۔ (سفیر اداس موہری پچکوٹ۔ مظفر آباد)

میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں، اچھا دوست میں اچھے دوستوں کا قدر کرتا ہوں بے شک آپ بھی کریں۔ (اللہ جوڑ ماگبول۔ عبدالوحید گوٹھ، کراچی)

میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں، انشااللہ میری اس دوستی کا ثبوت میرے دوست دیں گے۔ دوستوں سے وفا کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔ (محمد ہارون قمر۔ سیج پور ہزارہ)

میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں اور میرے دوست اور بھائی اختر بہت اچھے دوست ہیں اور ہم بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ (سمیع اللہ سمعی۔ ڈی آئی خان)

میں واقعی ایک اچھا دوست میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں اگر یقین نہ آئے تو میرے دوستوں سے پوچھ لیں۔ (ایم اشفاق بٹ۔ لالہ موسی)

میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں اور اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہوں کہ دوستی نبھاؤ جو چیز پاس ہوتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی اس لئے میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ میری قدر کیا کرو۔ (مجتبی عامر بھٹی۔ تاندلیانوالہ)

میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں، میں اچھا دوست ہوں یا برا ہوں۔ یہ آپ میر دوستوں سے ہی پوچھ سکتے ہیں کہ میں اچھا ہوں یا برا ہوں میں خود اپنے منہ سے کیا میاں مٹھو بنوں۔ (محمد حنیف عابد دکھی دل۔ رحیم یار خان)

میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں کیونکہ میں نے زندگی میں ایسے انسان سے دوستی کی ہے جو ہر وقت میری دوستی کے گن گاتا رہتا ہے۔ (مس کوثر احمد نور۔ بہاولپور(

میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں، میری دوست ایس تو بہت ہی اچھی ہے اس کی جتنی تعریف کروں کم ہے، اچھی دوست خدا کی طرف سے حسین تحفہ ہے (رخسانہ آفتاب، موضع بھٹہ)

میں واقعی ایک اچھا دوست میرا بہترین دوست شہزاد سلطان

الکویت۔) محمد بلال کھوفلی۔(K.S.A Taif
میں واقعی ایک اچھا دوست ننبے کی کوشش کرتی ہوں میری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ مجھ سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو اور میں ہر کسی کے ساتھ اچھا سلوک کروں (نرگس ناز۔ سکھر)
میں واقعی ایک اچھا دوست کوشش تو کرتے ہیں کہ دوستوں کی دل شکنی نہ کریں ہماری طرف سے انہیں کوئی تکلیف نہ ملے کبھی منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکالیں جس سے ہماری دوستی کمزور پڑ جائے آگے ہمارے دوستوں کی مرضی۔ (گلشن ناز۔ ٹھٹھہ قریشی)
میں واقعی ایک اچھا دوست آج تک میں نے کسی سے دوستی کی ہی نہیں ہے۔ (سراج اللہ خٹک۔ کرک)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہم دوست بہت ہی اچھے ہیں وہ اب بھی میرے دل کے قریب ہیں اور میں بھی ان کے لئے مخلص ہوں۔ (محمد افضل جواد۔ کالاباغ)
میں واقعی ایک اچھا دوست جی ہاں میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں۔ یہ بات آپ میرے دوستوں سے پوچھ سکتے ہیں۔ (عکاس احمد۔ حضرو)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہاں میں واقعی بہت اچھا دوست ہوں جس سے دوستی کرتا ہوں اس کو انشااللہ نبھاتا بھی ہوں۔ (سید اشتیاق حسین نقوی۔ گوجرانوالہ)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں۔ مخلص بھی ہوں اور اپنی زندگی میں مجھے یہی روشن سب سے زیادہ پسند ہے اور میرے دوستوں کو بھی۔ خاص کر یہ کہ میں کسی کو ناراض نہیں دیکھ سکتا۔ (رحیم اللہ۔ کراچی)
میں واقعی ایک اچھا دوست جی ہاں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ دوست کا درجہ بھائی سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ دوست اور بھائی کی مثال سونے اور ہیرے کی ہے۔ سونا ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے۔ اور ہیرا ٹوٹ کر کبھی نہیں جڑتا۔ (واصف علی آرائیں۔ بھر ماروڈ)
میں واقعی ایک اچھا دوست میں تو کیا لکھوں جن سے دوستی ہے وہ ہی بتا سکتے ہیں (محمد اقبال رحمن۔ سہیگی بالا)
میں واقعی ایک اچھا دوست بننے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں میری کوشش ہوتی ہے کہ میری طرف سے سے میرے دوستوں کو کوئی شکایت کا موقعہ نہ ملے۔ (جمیل فدا خیر پوری ۔ خیر پور میرس)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہم تو اچھے دوست ہیں لیکن آج تک ہمیں اچھا دوست کوئی نہیں ملا سب ہی مطلبی دوست ملے ہیں۔ (محمد صفدر دکھی۔ کراچی)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں یا نہیں یہ تو میرے دوست مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے دوستوں کے ساتھ پر خلوص دوستی کروں (ایم مظہر نذیر۔ کیوائی)
میں واقعی ایک اچھا دوست آج کل میری مصروفیت اور صحت کا ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے کئی بہت ہی اچھے دوستوں سے رابطے میں نہیں ہوں یہی خلش مجھے چھلنی کر رہی ہے۔

کہ اب کیسی ہے میری دوستی۔(احمد نجمی بے وسی۔کالا باغ)
میں واقعی ایک اچھا دوست میں واقعی ایک بہت اچھا دوست ہوں سیاہ چین کے برف پوش پہاڑوں سے بھی جواب عرض کے ذریعے آپ سے رابطے می رہتا ہوں۔مجھے یاد رکھنا پلیز۔(امداد علی عرف ندیم عباس تنہا۔میر پور خاص)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں کیونکہ میں اپنے دوستوں کی دل سے قدر کرتا ہوں اور ہمیشہ ان کا تہہ دل سے ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔(رئیس ساجد کاوش۔خان بیلہ)
میں واقعی ایک اچھا دوست میں اچھا دوست ہوں کیونکہ میرے جتنے بھی دوست ہیں وہ سب مجھے بہت اچھا دوست کہتے ہیں۔(محمد خادم خٹک۔ڈیرہ مراد جمالی)
میں واقعی ایک اچھا دوست میں کوشش کرتا ہوں کسی کو پریشان نہ دوں اب خدا جانتا ہے کون اچھا ہے کون برا ہے۔(نذیر احمد خان جوئیہ۔اسلام آباد)
میں واقعی ایک اچھا دوست دوست قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں ان انمول موتیوں کو سنبھال کے رکھنا چاہیے۔بے شک دوست سونے سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔(ڈاکٹر رئیس اقبال شاد۔رڑیالہ جگ دیو)
میں واقعی ایک اچھا دوست دنیا میں ایسے کام کر جاؤ تا کہ تمہارے مرنے کے بعد تمہیں اچھے نام کے ساتھ یاد کیا جائے۔اگر تمہارا اخلاق اچھا ہے تو سب تمہیں اچھے دوست ہیں ملیں گے۔(سیف الرحمن زخمی۔مقابر شریف)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں کیونکہ مجھے اپنی دوستی اور دوست پر یقین ہے جو لوگ کہتے ہیں مجھے نہیں پتہ اصل میں ان کی دوستی کمزور ہوتی ہے اور ان کو اپنی دوستی پر یقین نہیں ہوتا۔(سید اظہر حسین شاہ کاظمی۔چیز آزاد کشمیر)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔میں صرف اپنے دوستوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سب کی محبت کی ضرورت ہے۔(الٰہی بخش عمشاد۔کیچ مکران)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں لیکن انسان کا پتہ تب چلتا ہے جب لوگ اسے اچھا دوست مانیں میری اور اداکار عصمت اللہ کی دوستی بہت عظیم دوستی ہے۔خدا ہر کسی کو اچھا دوست دے۔(اداکار میاں شکیل چوعظہ۔خان پور)
میں واقعی ایک اچھا دوست ہوں(امین اللہ اور کزئی۔ہنگو)
میں واقعی ایک اچھا دوست میں ایک اچھا دوست ہوں کیونکہ مجھے تنہائی بہت پسند ہے۔اور میں چاہتا ہوں میں ہر وقت تنہا رہوں۔(مدثر اقبال تنہا۔کلیر کلاں)

نوٹ: آئندہ ماہ کے لیے اس میں آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں جلدی سے ہمیں لکھ کر مسیج کریں اور چند لائن میں اپنے بہترین دوست سے اپنے پیار کا اظہار کریں

Mobile; 0322.5494228

غم کے بعد خوشی ملتی ہے تو کیسا لگتا ہے

میری رائے میں جیسے پھولوں کی دنیا میں بہار آگئی ہو، جیسے زندگی کا مزہ آگیا ہو، خدا سب کو خوشیاں دے۔ خوش رہو خوش رکھو۔ جدا کے دوستوں کو خدا خوش رکھے۔ (ایم وائی سچا۔ جدہ)

میری رائے میں ایک زمین کا بخبر ٹکڑا ساہوں بعد پانی سے زیر آب ہو کر فصل دیتا ہے۔ سمجھنے والے سمجھ گئے ہوں گے۔ (قمر زمان بوبی گجر۔ دوبئی)

میری رائے میں بہت اچھا لگتا ہے لیکن وہ خوشی بھی تو کچھ دنوں کی مہمان ہوتی ہے۔ بعد میں پھر غم یہ تو انسان کی زندگی ہے۔ (عباس علی گجر پردیسی۔ چکسواری)

میری رائے میں میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کبھی کوئی غم ملا ہی نہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے اتنی خوشی بعد انسان جب زندہ ہو جاتا ہے تو میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ (فریاد علی جٹ۔ ملتان کینٹ)

میری رائے میں بیان کرتا بہت مشکل ہے بس اتنا سمجھ لیجئے ایک لمحے کی خوشی سالوں کے غم کو بھلا دیتی ہے۔ کتنے ٹائم کے لئے یہ معلوم نہیں۔ (قمر زمان۔ دوبئی)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی مل جائے تو انسان کافی حد تک غم بھول جاتا ہے۔ (بشیر سانول۔ واہ کینٹ)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی کا احساس بہت دلفریب ہوتا ہے کیونکہ انسان کو غم زیادہ اور خوشیاں کم ملتی ہیں جب غمگین انسان کو خوشی ملتی ہے تو اس کی فیلنگ کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ (رائیس ارشد۔ خان بیلہ)

میری رائے میں بہت اچھا لگتا ہے خوشی کا احساس بھی بہت ہی ہوتا ہے جب غم کے بعد خوشی ہو۔ بنا غم خوشی کی کوئی قدر نہیں میں بہت خوشی ہوں۔ اپنے غم ہیں۔ (ساگر گلزار کنول۔ فورٹ عباس)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی ملتی ہے لیکن ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ اس خوشی کے لئے ہمیں کتنے غم سہنے پڑے اور ان خوشی کے لمحات میں سب کو شریک کیا جائے۔ (عمران فنا۔ حب ڈیم)

میری رائے میں یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ انسان کو دکو تمام دکھوں سے آزاد سمجھتا ہے۔ یہ لمحات مختصر سہی لیکن انسان کے لئے نہ ٹوٹنے والی امید کی بنیاد ہوتے ہیں اللہ سب کو خوش رکھے۔ (راجہ فیصل مجید۔ کراچی)

میری رائے میں غم کے بعد جب خوشی ملتی ہے تو انسان بیان نہیں کر سکتا کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ (مدیحہ، مقدس، فاروق آباد)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی ملتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے پنوں کو سسی ملتی ہے۔ (امین اللہ اور کرزئی۔ ہنگو)

میری رائے میں جب غم کے بعد خوشی ملتی ہے تو اس کا ذائقہ کچھ مختلف ہوتا ہے اور وہ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں غم کے بعد خوشی ملتی ہے۔(الٰہی بخش غمشاد۔ کیچ مکران)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی ملے تو ایسے لگتا ہے جیسے برسات کے بعد دھوپ، رات کے بعد دن، آنسو کے بعد مسکراہٹ، ہار کے بعد جیت، نیند کے بعد جاگنا، شادی کے بعد ولیمہ، گوشت کے بعد قیمہ، یعنی کہ بہت ہی اچھا۔(سید اظہر حسین شاہ۔ چیئر آزاد کشمیر)

میری رائے میں غم کے بعد جب انسان کو خوشی ملتی ہے تو انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں نے تو دنیا آباد کی ہے غم کے بعد خوشی کا اپنا ہی مزہ آتا ہے۔(محمد رمضان رضا حسین۔ میاں چنوں)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی ملنی چاہیے اس طرح انسان سارے غم بھول جاتا ہے اور اپنے خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ جس نے اسے خوشی عطا کی کاش سب کو غم کے بعد خوشی ملے خدا کرے ایسا ہی ہو۔(سیف الرحمن زخمی۔ مقابر شریف)

میری رائے میں غم کے بعد جب خوشی ملتی ہے تو اک عجیب سی کیفیت ہوتی ے ایسا لگتا ہے جیسے دکھ کبھی تھے ہی نہیں خوشی کا ایک لمحہ تمام غموں پر بھاری ہوتا ہے۔(ایم شفیع تنہا۔ امرہ خورد)

میری رائے میں مجھے اتنی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ آنسو آجاتے ہیں خدا پاک کا شکر ادا کرتا ہوں۔ کہ خوشی ملی اور آگے کی دعا کرتا ہوں۔ کہ خدا پاک میری طرح سب کے غم ختم کرے اور اسی طرح سب کو خوشی دے خدا سب کچھ کرنے والا ہے۔(نذیر احمد خان جوئیہ۔ اسلام آباد)

میری رائے میں غم کے بعد جب خوشی ملتی ہے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس کی آزمائش ختم ہوئی خوشی اور غم دونوں چیز سے انسان کے لئے ہے خوشی میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور بس اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔(محمد شہباز گل۔ گوجرانوالہ)

میری رائے میں اگر غم کے بعد خوشی ملے تو ایسا لگتا ہے کہ غم آیا ہی نہیں۔(رائے جاوید کھرل۔ فورٹ عباس)

میری رائے میں ہم ہر وقت خوش رہتے ہیں ہمیں کوئی غم نہیں ویسے بھی خوشی کی بات سن کر بہت خوش رہتے ہیں۔ (محمد خادم جٹک۔ ڈیرہ مراد جمالی)

میری رائے میں آج تک ایسی خوشی نہیں جس کو بیان کروں آرایم وہ خوشی آپ بن سکتے ہو۔(سراج اللہ جٹک۔ کرک)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی ملتی ہے تو بہت اچھا لگتا ہے انسان کو ایسا لگتا ہے جیسے جنت میں داخل کر دیا گیا ہو میری خوشی میری جان کے مسکرانے میں ہے۔(عابد رشید۔ راولپنڈی)

میری رائے میں کبھی کہ اب جینے کا انداز بدل گیا ہے بہت سکون ملتا ہے جیسے کڑی دھوپ سے چھاؤں مل گئی ہو۔(ظفر نور۔ اوباوڑہ)

میری رائے میں غم دکھ درد تو زندگی کا حصہ ہیں زندگی بہت ہی انمول ہے لیکن جب دکھی حصہ زندگی کا گزار کر خوشی ملتی

ہے تو انسان اپنے آپ کو دنیا کو خوش نصیب ترین انسان تصور کرتا ہے۔ زندگی میں جس سے محبت ہوتی ہے تو وہی محبت انسان کی غم اور خوشی ہوتی ہے (احمد نجمی۔ کالاباغ)

میری رائے میں ہمیں تو زندگی میں غم ہی غم ملے ہیں خوشی تو ابھی تک دیکھی ہی نہیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ خوشی دکھا دے۔(محمد صفدر دکھی۔ کراچی)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی کا ملنا ایسا لگتا ہے جیسے صحرا سے گلشن میں آ جانا۔(جمیل فیدا خیر پوری۔ خیر پور میرس)

میری رائے میں غم کے بعد جب خوشی ملتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے دنیا کی ہر چیز مجھے مل گئی ہے اور دل کو بہت سکون ملتا ہے۔(واصف علی آرائیں۔ بھریارو ڈ)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی مل جائے تو انسان اپنا سب کچھ دکھ و غم بھول جاتا ہے اور خود کو خوش نصیب سمجھنے لگتا ہے۔(محمد افضل جواد۔ کالاباغ)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی کا ملنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ (سید اشتیاق حسین نقوی۔ گوجرانوالہ)

میری رائے میں خوشی ایک ایسا انمول تحفہ ہے جو خوش قسمت انسان کو ملتا ہے۔ آج کل زندگی میں دکھ بہت ہیں اور خوشی کم۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کی زندگی میں خوشی لکھے۔(شجاہد اقبال خٹک۔ کرک)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی ملتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ زندگی میں بہار آ گئی ہو، جیسے ابھی سے ہی میری زندگی کی شروعات ہوئی ہے۔ پھر حقیقی خوشی کے کچھ آثار آنے شروع ہوتے ہیں۔ دل خوب چاہتا ہے اڑنے کی جی کرتا ہے۔ افسوس کہ اڑنے کے لئے پر نہیں ہوتے۔(عبدالرشید بزنجو۔ گڈانی)

میری رائے میں غم کے بعد جب خوشی ملتی ہے تو رب تعالیٰ کی ذات پر رشک ہوتا ہے۔ اس کے لوگوں پر پیار آتا ہے۔ اس کی کائنات پر پیار آتا ہے۔ اس نے انسان کے لئے کیا کیا چیزیں پیدا کر دیں۔(مجید احمد جانی۔ ملتان)

میری رائے میں جب غم کے بعد خوشی ملتی ہے تو انسان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں اور وہ ہوتے ہیں خوشی کے آنسو ہوتے ہیں۔ وہ آنسو زندگی میں یاد بن جاتے ہیں اور کبھی بھی نہیں بھولتے۔(مدد حسین بلوچ۔ عارف والا)

میری رائے میں غم کے بعد خوشی ملتی ہے تو انسان زندگی ک مطلب سمجھتا ہے کہ انسان کی اصل زندگی کیا ہے۔(سلیم خان شہزاد۔ لکھن کے)

نوٹ: آئندہ ماہ کے لیے اس میں آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں جلدی سے ہمیں لکھ کر مسیج کریں اور چند لائن میں اپنے بہترین دوست سے اپنے پیار کا اظہار کریں

Mobile; 0322.5494228

ماں سے پیار کا اظہار۔۔۔!!

*۔۔۔۔ماں کے بغیر پوری دنیا ویران ہے ماں ہی وہ ہستی ہے جو آپ کے دکھ سکھ کو سمجھ سکتی ہے دعا کریں کہ میری ماں کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر قائم رہے۔(مدد حسین بلوچ۔ عارف والا)

*۔۔۔ماں کے سوا کوئی محبت نہیں کرتا ماں سچی محبت کرتی ہے ماں کے دل میں محبت ہی محبت ہے ماں کی محبت کامیابی ہے(الٰہی بخش عمشاد۔ کیچ مکران)

*۔۔۔ماں تو ماں ہی ہے اس کے بارے میں جتنا بھی لکھ لو کم ہے ماں سدا خوش رہو۔(شہزاد سلیم۔ لکھن کے)

*۔۔۔میری ماں میری دنیا کی وہ نعمت تھی جو اب مجھ کو اس دنیامین کبھی بھی نہیں مل سکتی۔ اللہ میری ماں کو جنت میں جگہ دے۔(محمد لقمان اعوان۔ شیخوپورہ)

*۔۔۔ماں جنت کے باغوں میں ایک باغ ہے لہذا سارے لوگ اپنے والدین کی خدمت کرتے اپنے لئے جنت ثقلین بنائیں۔(سردار زاہد۔ باغ)

*۔۔۔میری ماں میرا سب کچھ میری ماں مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی ہے اور میرا بہت خیال رکھتی ہے، دعا ہے اللہ پاک میری ماں کا سایہ مجھ پر قائم رکھے۔(حافظ شفیق۔ کوٹلی)

*۔۔۔ماں میرا جہاں میری ماں ہی میرے لئے سب کچھ ہے اے پیاری والدہ دنیامیں نہ آیا نہ آئے گا کوئی نہ تیرے نال دا۔(محمد ارسلان احمد۔ ڈھوک مراد)

*۔۔۔ماں پھولوں کی مہک چاند کی چاندنی ماں کی وہ واحد ہستی ہے جس سے سچے دل سے پیار ملتا ہے۔ماں قدرت کا انمول تحفہ ہے۔(زاناوارث اشرف عطاری۔ احمد نگر)

*۔۔۔ماں سے پیار کا اظہار کیا لکھوں اگر جتنا بھی لکھوں زندگی بھر لکھتا رہوں تو وہ بھی کم ہے۔(محمد یسین شفیق۔ خانیوال)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے محبت کا اظہار چند الفاظ میں نہیں کر سکتا کیونکہ وہ میرے لئے ایک عظیم ترین ہستی ہے اور میں اس کے قدموں کی خاک ہوں۔(رئیس صدام ساحل۔ سٹی خان بیلہ)

*۔۔۔اس مطلبی دنیامیں کوئی بھی کسی سے سچا پیار نہیں کرتا

ماسوائے ماں کے سب ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں مگر ماں نے کبھی بھی اپنی اولاد کو دھوکا نہیں دیا۔ماں مجھے آپ سے باتیں کرنے کا بہت ارمان ہے کاش میں تجھ سے اپنے دل کی باتیں کر سکتا مگر دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئیں اور تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔(خلیل احمد ملک۔شیدانی شریف)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت محبت کرتا ہوں میری ماں دنیا کی عظیم ترین ماں ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ میری ماں کا سایہ میرے سر پر رکھے۔(رئیس ارشد۔خان بیلہ)

*۔۔۔ماں آنکھوں کی ٹھنڈک، آنکھوں کا نور،ماں دل کی دھڑکن، دل کا سکون،ماں کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔(عثمان غنی۔قبولہ شریف)

*۔۔۔میری دنیا میری ماں سے شروع ہوتی ہے ماں پر ہی ختم ہوتی ہے۔مجھے ماں سے بڑھ کر کوئی بھی عزیز نہیں ہے۔(منتظر عباس۔برج)

*۔۔۔ماں باقی سارے رشتے کھوکھلے ہیں صرف آپ کا رشتہ ہی افضل ہے۔(ظفر نور۔اوباوڑہ)

*۔۔۔ماں کے روپ میں ہے خدا کا روپ۔۔۔فدا ماں کی تو ہستی ہے۔پوجاؤں کے لئے۔(جمیل فیدا خیر پوری۔خیر پور میرس)

*۔۔۔میری ماں تو سدا اسلامت رہے، آپ کا سایہ قیامت تک ہمارے سروں پر قائم رہے۔(احمد نواز تبسم۔چندور بالا)

*۔۔۔سب سے زیادہ مجھے ماں کے قدموں میں سکون ملتا ہے۔(بوس دین محمد بگٹی۔کراچی)

*۔۔۔میری امی جان بے مثال ہستی تھیں وہ ہر کسی کی بہترین دوست تھیں ان کا حسن سلوک آج بھی ہر زبان پر ہے اللہ ان کو جنت میں اچھا مقام دے۔(نرگس ناز۔سکھر)

*۔۔۔میری ماں یہ جو میری کامیابیوں کا سلسلہ ہے۔یہ سب تیری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔میری ماں میری پہچان تیرے دم سے ہے۔(ایم احسان دانش۔جوہر آباد)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں۔ماں سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی رشتہ نہیں ہے ماں سے تو یہ دنیا ہے ماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔(ارے راحیلہ منظر۔جھمرہ سٹی)

*۔۔۔صرف ماں ہی وہ ہستی ہے اس انیا میں جس کی محبت اولاد کے لئے سچی اور بے لوث ہوتی ہے۔ماں کی عظمت کو سلام(ڈاکٹر رئیس اقبال۔جہلم)

*۔۔۔اللہ کا بہترین تحفہ ماں ہے۔اچھی ماں اچھی جنت کا مکان۔(ریاض حسین۔سخی سرور)

*۔۔۔ماں قدرت کی طرف سے ایک انمول تحفہ ہے میں اپنی ماں کو پریشان نہیں دیکھ سکتا، خدا میری ماں کو ہمیشہ خوش رکھے۔(شہباز گل ناگاں۔فیصل آباد)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتی ہوں میں ان کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھ سکتی ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔(سعدیہ ارشاد۔گوجر خان)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا ہوں۔قارئین دعا کرو کہ اللہ ہماری ماں کی عمر لمبی کرے۔(زیب ظہور احمد بلوچ۔

ڈیرہ مراد جمالی)

*۔۔۔ماں کائنات کی عظیم ہستی ہے اس لئے انسان کو ماں کا دل دکھانا نہیں چاہیے۔ماں باپ کی قدر ان لوگوں سے پوچھو جن کے ماں باپ نہیں۔(اکبر علی شاہین۔چولستان)

*۔۔۔ماں کی قدر کرنا سکیھو کیونکہ ماں تب بھی روتی تھی جب بیٹا بھوکا ہوتا تھا اور اب بھی روتی ہے جب بیٹا روٹی بھی نہیں دیتا۔(جاوید کھرل۔فورٹ عباس)

*۔۔۔اے ماں تیری عظمت کو سلام۔جی چاہتا ہے سنوں تیرا کلام، میری ساری زندگی ہو جائے تیرے نام، مشکل گھڑی میں میرا تن من تیرے توں قربان(ساجدہ ذاکر۔فیصل آباد)

*۔۔۔ماں دنیا کی عظیم ترین ہستی ہے۔یہ وہ ہستی ہے جس میں خدانے اپنی طرف سے مھبت شامل کر دی۔خدا اسدا سلامت رکھے اس ہستی کو۔(میاں شکیل۔خان پور)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا ہوں اور اپنی ماں کے لئے جان تک کو قربان کر دوں گا۔(علی رضا ندیم۔چکر نمبر 172،مراد)

*۔۔۔مجھ سے ماں سے پیار کا اظہار کیا نہیں جاتا میں بس یہی کہوں گا کہ دنیا کی سب ماؤں کو میں سلام کرتا ہوں۔(محمد جاوید بلوچ۔ڈی جی خان)

*۔۔۔ماں تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔دنیا کی تمام ماؤں کو سلام کرتا ہوں۔اللہ پاک میری ماں کو جنت میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے۔آمین(محمد رمضان جانی ڈھکو۔ساہیوال)

*۔۔۔ماں تو ماں ہے ماں سے پیار کا اظہار لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا ماں تو دنیا کی سب سے پیاری اور عظیم ہستی ہے (محمد حسین۔ڈی جی خان)

*۔۔۔جب بھی میرے دل کی مسجد میں تیری یادوں کی اذان ہوتی ہے ماں۔۔۔میں اپنے ہی آنسوؤں سے وضو کر کے تیرے جینے کی دعا کرتا ہوں۔(ثمر اعجاز گوندل۔گوجرہ)

*۔۔۔ماں نہ ہوتی تو دنیا میں محبت نہ ہوتی مگر یہاں تو کوئی ماں جتنی پیاری ہستی کی قدر نہیں کرتا اے ماں تیری عظمت کو سلام۔(محمد ارسلان احمد دکھی شانی۔ڈھوک مراد)

*۔۔۔مجھے اپنی ماں سے بہت ہی زیادہ پیار تھا میری ماں جب سے ہم سے جدا ہو تئی ہے دنیا کا ہر کونا ویران لگتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔(محمد صفدر دکھی۔کراچی)

*۔۔۔ماں کے تو مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ ساری زندگی اس کی غلامی کروں تو کم ہے اللہ ہمیشہ میری ماں کو سلامت رکھے۔(عمران فنا۔حب ڈیم)

*۔۔۔ماں سے پیار کرنے کے لئے الفاظ کم پڑ جائیں گے لیکن یہ کہ آئی مس یو ماں۔(ثابت نواز آفریدی۔کوہاٹ)

*۔۔۔میں اپنی دونوں ماؤں سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔میری چھوٹی ماں کے بعد بڑی ماں نے ہمیں احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہماری اپنی ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا ہوں۔(علی رضا)

*۔۔۔میں اپنے بارے میں اتنا نہیں سوچتا جتنا میں اپنی ماں کے بارے میں سوچتا ہوں کیونکہ میری ماں جان ہے۔ (چوہدری یاسین احمد۔ سٹی خان بیلہ)

*۔۔۔میری ماں نے مجھے بہت زیادہ پیار دیا ہے جس کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ پس سب کو یہی کہوں گا وہ اپنے ماں باپ کا خیال رکھیں۔ (رئیس صدام ساحل۔ سٹی خان بیلہ)

*۔۔۔ماں کے دم سے یہ دنیا قائم ہے میں جب بھی اپنی ماں کو یاد کرتا ہوں۔ مجھ سکون ملتا ہے ماں میرے لئے جنت سے کم نہیں۔ (سیف الرحمن زخمی۔ مقابر شریف)

*۔۔۔ماں کے بغیر گھر قبرستان ہے۔ ویرانہ ہے بیابان ہے بلکہ بالکل ویران ہے (پرنس مظفر شاہ۔ پشاور)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔ دنیا کا وہ رشتہ ہے جو اپنی اولاد کو کبھی بھی بد دعا نہیں دیتی ماں تیری عظمت کو سلام۔ (ایم افضل کھرل۔ ننکانہ صاحب)

*۔۔۔میری ماں میرا دین ہے میرا ایمان ہے میری چاہت ہے میرا سکون ہے ماں میری جنت ہے اور میری جنت میرے پاس ہے۔ (محمد عمران خان۔ ڈنگہ)

*۔۔۔اپنی سانسوں سے بھی بڑھ کر ماں کا پیار دل میں زندہ ہے اور خدا اچھی طرح دلوں کے بھید بھی جاننے والا ہے۔ (محمد افضل اعوان۔ گوجرہ)

*۔۔۔اے ماں تمہارے بغیر زندگی عذاب بن کے رہ گئی ہے کوئی میری قدر نہیں کرتا یہاں تک سب نفرت کے لائق سمجھتے ہیں۔ (منیر رضا۔ ساہیوال)

*۔۔۔ماں تجھے سلام ماں تو ہمیشہ پھولوں کی طرح مسکراتی رہو اور تمہاری زندگی میں کبھی غم نہ آئے ماں ہم کو صرف دعاؤں میں یاد کرو، خوش رہو۔ (شاہد اقبال خٹک۔ کرک جندری)

*۔۔۔میں اپنی ماں کے بغیر ایل پل بھی جی نہیں سکتا ہوں اے اللہ میری ماں کو میری عمر دے دے یاروں ماں کی قدر کرو۔ (مصطفی گل۔ کراچی)

*۔۔۔ماں قدرت کا دیا ہوا ایک تحفہ ہے ماں جنت کا پھول ہے ماں آسمان کا چاند ہے جس سے پوری کائنات میں روشنی پھیلتی ہے۔ ماں تجھے سلام (محمد خادم جتک۔ ڈیرہ مراد جمالی)

*۔۔۔ماں کی طرف پیار بھر نظروں سے دیکھنا بھی عبادت ہے دوستوں اپنی ماں کی عزت کرواے میری ماں تجھ کو سلام (محمد اسماعیل آزاد۔ گھر بونگ)

*۔۔۔ماں جنت کا باغ ہے اس سے محبت کرو۔ (محمد اسحاق انجم۔ کنگن پور)

*۔۔۔اپنی ماں سے پیار کرو کیونکہ ماں کی قدر وہ جانتا ہے جس کی ماں نہیں ہوتی پلیز ماں سے پیار کرو۔ (شاہد نذیر۔ گوجرہ)

*۔۔۔ماں تو دنیا کا عظیم رشتہ ہے اللہ میری ماں سلامت رکھے والدین کو خوش رکھیں۔ (شاہد احمد۔ رسول نگر)

*۔۔۔ماں میں تیرے کن کن احسانوں کا بدلہ دوں میری پیاری ماں تیری یادیں بہت ستاتی ہیں ماں تو کتنی عظیم ہے

تیری عظمتوں کو سلام۔(مجید احمد۔ ملتان)

*۔۔۔اپنی ماں کو کبھی بھی دکھ مت دینا یہ انمول تحفہ ہے قدرت کا اس لئے میری دوستوں اپنی ماں کا خیال رکھو۔ (امداد علی عرف ندیم عباس تنہا۔ میر پور خاص)

*۔۔۔تیری انگلی پکڑ کر چلا ماں کے آنچل میں چلا ماں اور میری ماں میں تیرا لاڈلہ ماں تجھے سلام۔(شان علی بٹ۔ خانیوال)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میری ماں عظیم ماں ہے ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔(غزل شاہین۔ فاروق آباد)

*۔۔۔ماں ایک عظیم ہستی ہے موسیٰ کو خدا نے کوہ طور پر جوتے اتار کر آنے کو کہا کیوں اے خدا اس لئے کہ تمہارے پیچھے دعا کرنے والی ماں نہیں رہی۔(محمد سلیم ناز۔ خانیوال)

*۔۔۔میری ماں ایک اچھی ماں ہے۔ دن رات میرے لئے دعائیں کرتی ہے میں سمجھتا ہوں میری ماں کی دعاؤں میں بڑا اثر ہے اللہ میری ماں کو لمبی زندگی دے۔(محمد ہارون قمر سیج پور ہزارہ)

*۔۔۔میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ خدا میری ماں کو صحت یاب کرے سب قارئین سے التجا ہے کہ وہ میری ماں کے لئے دعا کریں۔(رفاقت علی۔ بھاگ نگر)

*۔۔۔ماں ایک عظیم ہستی ہے اور دنیا کی سب اچھی ماں ہے اور ماں سے پیار کرنا چاہیے۔(سردار اقبال۔ سردار گڑھ)

*۔۔۔ماں دنیا میں پیار کی وہ دیوری ہے جس کے پیار میں آپ کو رکھا وانہیں ملے گا سچا پیار صرف ماں ہی اپنی اولاد سے کرتی ہے۔(ایم مجاہد چاند۔ فیصل آباد)

*۔۔۔پیاری ماں پردیس میں حالات اور مجبوریاں ہوتے ہیں مگر میں حوصلہ مند ہوں آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ (راجہ فیصل مجید۔ کراچی)

*۔۔۔ماں باپ کی قدر کرو ان کی خدمت کرو میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا ہوں ماں تجھے سلام (ملک افضل ساگر۔ صفدر آباد)

*۔۔۔ماں ہی زندگی کا سکون ہے ماں وہ پھول ہے جس کی خوشبو انسان کو مہکا دیتی ہے ماں کی گود ہی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔(حماد ظفر ہادی۔ گوجرہ)

*۔۔۔ماں ان دیواروں کی طرح ہوتی ہے کہ اگر دیواریں نہ ہوں تو گھر نہیں کہتے، اسی طرح ماں کے بغیر گھر گھر نہیں ہوتا۔ ماں تجھے سلام (نامعلوم)

نوٹ: آئندہ ماہ کے لیے اس میں آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں جلدی سے ہمیں لکھ کر مسیج کریں اور چند لائن میں اپنے بہترین دوست سے اپنے پیار کا اظہار کریں

Mobile; 0322.5494228

ملاقات

غلام مصطفی عرف موجو

عمر:۔24سال

مشغلے:۔ فلمی دوستی کرنا جواب عرض پڑھنا

پتہ ورنگی قیوم آباد، گلی مکان 168 کراچی

ریاض احمد

عمر:۔18سال

مشغلے:۔ماں کی تلاش کوئی ماں ہے جو مجھ کو بیٹا کہہ کر پکار ہے۔

پتہ:۔ ضلع رحیم یار خان تحصیل صادق آباد، ڈاک خانہ رحیم یار بستی محمد ابراہیم بلوچ۔

غلام فرید جاوید

عمر:۔20سال

مشغلے:۔وفا کرنا اور دھوکے کھانا

پتہ:۔چونیاں روڈ حجرہ شاہ مقیم

ایم یعقوب

عمر:۔17سال

مشغلے:۔ سچے دوستوں سے سچی دوستی کرنا

پتہ:۔ تحصیل کوٹ چھوٹہ ضلع ڈیرہ غازی خاں چوٹی روڈ، جامپور چوک پیر انگ۔

عبدالغفار تبسم

مشغلے:۔ ہمسفر کی تلاش ہے

پتہ:۔ فلیٹ نمبر 229 سی این بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور

شہزاد سلطان کیف

عمر:۔30سال

مشغلے:۔شاعری، سیر و تفریح

پتہ:۔الکویت (بھمبر آزاد کشمیر)

عاشق حسین طاہر

عمر:۔35سال

مشغلے:۔جواب عرض پڑھنا دکھی لوگوں کی خدمت کرنا

پتہ:۔منڈی نونانوالی، کھاریاں ضلع گجرات

عثمان غنی

عمر:۔20سال

مشغلے:۔جواب عرض میں لکھنا

پتہ:۔ڈاک خانہ الجامہ اسلامیہ تحصیل عارفوالا ضلع پاکپتن، قبولہ شریف

ایم وائی سچا

مشغلے:۔ ہر وقت مدھو کو مس کرنا اس کے لیے دعائیں کرنا اللہ قبول کرے آمین

پتہ:۔ ص ب 690 جدہ السعودیہ

سردار اقبال خان مستوئی

عمر:۔29 سال

مشغلے:۔ اچھے لوگوں سے دوستی کرنا

پتہ:۔ڈاکخانہ خاص سردار گڑھ تحصیل و ضلع رحیم یار خان

تمریز اعوان ارمانی

عمر:۔27 سال

مشغلے:۔ جواب عرض پڑھنا، کسی کو یاد کرنا

پتہ:۔ ضلع و تحصیل ہری پور ہزارہ، ڈاکخانہ کھیری گاؤں ماڑی ہزارہ

مجید احمد جائی ملتانی

عمر:۔25 سال

مشغلے:۔ باوفا مخلص لوگوں سے دوستی اور لکھنا پڑھنا

پتہ ریکٹ بینکرز 37 کلو میٹر ملتان روڈ نزد مانگا منڈی لاہور

رفاقت علی

عمر:۔30 سال

مشغلے:۔ باوفا لوگوں سے قلمی دوستی کرنا

پتہ:۔ بمقام گاؤں بمب کی ملیاں ڈاکخانہ خاص منوں پور تحصیل و ضلع شیخوپورہ

محمد عبداللہ

عمر:۔19 سال

مشغلے:۔ لڑکوں سے دوستی کرنا

پتہ:۔ مرحبا ریسٹورنٹ عبدالحکیم کبیر والا خانیوال

آصف سانول

عمر:۔22 سال

مشغلے:۔ فوک شاعر اینڈ رائیٹر

پتہ:۔ کھر کالونی مین حاصلپور روڈ تحصیل چشتیاں ضلع بہاولنگر

اللہ دتہ بے درد

مشغلے:۔ صرف جواب عرض میں لکھنا

پتہ:۔CMH مری کینٹ NCB اللہ دتہ

محمد صفدر دکھی

مشغلے:۔ اچھے اور خلص دوستوں کی تلاش

پتہ:۔ معرفت غرناطہ مسلم اسکول نزد مدینہ مسجد خالد بن ولید روڈ گلستان کالونی کراچی نمبر 53

محمد قاسم لاشار بلوچ

عمر:۔20 سال

مشغلے:۔ قلمی دوستی کرنا اور ملک کی خدمت کرنا

پتہ:۔ شہر گنداواہ تحصیل و ڈاکخانہ گنداواہ ضلع جھل مگسی بلوچستان

عمران فنا

عمر:۔20 سال

مشغلے:۔SMS کرنا جواب عرض پڑھنا

پتہ:۔شاہ نورانی روڈ تحصیل حب ڈاکخانہ حب ضلع لسبیلہ بلوچستان

راشد لطیف صبرے والا

عمر:۔32سال

مشغلے:۔کام کرنا اور جواب عرض پڑھنا

پتہ:۔ ضلع ملتان تحصیل جلال پور پیر والا بستی صبرے والا

بشیر احمد بھٹی

عمر:۔51سال

مشغلے:۔داستانِ دل پڑھنا قلمی دوستی، مطالعہ

پتہ:۔مکان نمبر CD52 نزد جامع مسجد غوثیہ بستی غربی، بہاولپور

فنکار شیر زمان پشاوری

عمر:۔30سال

مشغلے:۔داستانِ دل پڑھنا پڑھنا، پاکستانی فلمیں دیکھنا

پتہ:۔توحید کالونی نمبر 1 گلی نمبر چار شاہین مسلم ٹاؤن نزد توحید ماڈل پھندو روڈ پشاور

محمد لقمان اعوان

عمر:۔21سال

مشغلے:۔داستانِ دل پڑھنا لکھنا پڑھنا

پتہ:۔گاؤں سریانوالہ پوسٹ آفس بکس مالوال تحصیل و ضلع شیخوپورہ

ایگل محسن علی جٹ

عمر:۔21سال

مشغلے:۔بندہ بندی سے دوستی کرنا کہانیاں پڑھنا لکھنا

پتہ:۔فرید ٹاؤن ساہیوال

مریز بشیر گوندل

ع

تیری دریاؤں سی عادت ہی تجھے لے ڈوبی
میں بتاتا بھی رہا یہ ہے کنارہ، پاگل

ہر کسی سے نہیں امید لگائی جاتی
ہر کوئی دے نہیں سکتا ہے سہارا، پاگل!

وہ بھی قسطوں میں دکھاتا ہے ادائیں اپنی
وہ بھی ہونے نہیں دیتا مجھے سارا پاگل

اس پہ کیا رونا، تمہیں کوئی سمجھتا ہی نہیں
مجھ سے آکر تو کہو، میں ہوں تمہارا، پاگل!

ساتھ تم تھے تو ہمیں راس تھا پاگل پن بھی
اب ترے بعد کریں کیسے گزارہ؟، پاگل!

دور تم جب سے ہوئے تب سے ہمارے حصے
بس خسارہ ہے، خسارہ ہے، خسارہ، پاگل!

انتخاب: ثوبیہ اجمل

مختصر اشتہارات

این کے نام

پھول پتے سے جدا اسے خوشبو سے نہیں تم مجھ سے جدا ہو میرے دل سے نہیں۔(عابد رشید۔راولپنڈی)

ایم خالد محمود سانول کے نام

آپ کی سبق آموز کہانیاں پڑھنے سے یقین مانیں ہمیں بہت کچھ مل جاتا ہے۔بے شک آپ ہمیشہ ہی ایسے اپنے قلم کو، داستانِ دل کے لئے بر قرار رکھیں۔(عبدالوحید ابرار بلوچ۔آواران)

قارئین کے نام

میں تمام قارئین کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔خلوص دل کے ساتھ جو بھی مجھے خط لکھے گا اسے میں خلوص کے ساتھ جواب دوں گا۔(سیف الرحمن زخمی۔مقابر شریف)

جان کے نام

جان زندگی رک جاتی ہے خود کو نامکمل محسوس کرتا ہوں۔جب تم میرے پاس نہیں ہوتی ہو، تمہارے بغیر یہ زندگی عذاب ہے جان خدا کی قسم۔(محمد افضل اعوان۔گوجرہ)

ایس گوجرہ کے نام

میں تمہاری نظروں میں انسان نہیں، مجھے وفا تمہاری یادیں آنسو بن کر میری زندگی کو تڑپاتی رہیں گی میں آج بھی تمہارے نام پر تڑپ اٹھتا ہوں تم کبھی آؤ تو سہی تمہارا منتظر ہوں جانو!(ممریز بشیر گوندل۔گوجرہ)

KK کے نام

میڈم میں آپ کا بہت پرانا فین ہوں اور آپ ہیں کہ کسی کا جواب ہی نہیں دیتے آپ میرے ساتھ پلیز رابطہ کریں۔ میں آپ کا بہت شکر گزار رہوں گا۔(مسٹر ایم ارشد وفا۔گوجرانوالہ)

قارئین کے نام

میں تمام قارئین سے قلمی دوتی کرنا چاہتا ہوں پہلے میں داستانِ دل نہیں پڑھتا تھا لیکن اب ایک دفعہ پڑھنے کو ملا تو داستانِ دل کا دیوانہ ہو گیا ہوں۔میں ہر ماہ ضرور پڑھوں گا۔ میری حوصلہ افزائی ضرور کرنا(سرفراز ڈاہر۔لکڑیانوالہ)

فیصل آباد کے دوستوں کے نام

شاید آپ کی فطرت میں بے وفائی لکی ہوئی ہے جو آپ کو کسی بات کا یقین نہی آتا۔(بشیر سانول۔واہ کینٹ)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

رشتے ناطے

مجھے اپنی دو بہنوں کے لیے دو رشتوں کی تلاش ہے میری بہنیں مڈل پاس ہیں اور نہایت ہی شیر یف ہیں اور خوبصورت ہیں انکی عمریں اٹھارہ اور بیس سال کے قریب ہیں ان کے لیے ایسے رشتے درکار ہیں جو حقیقت میں شادی کے خواہشمند ہوں جن کا اپنا کاروبار ہو یا پھر وہ سرکاری ملازم ہو یا پھر کسی بھی اچھی ملازمت میں ہوں شریف ہوں اور انکی عمریں پچیس سال سے زیادہ نہ ہوں لاہور اوکاڑہ۔ قصور والوں کو ترجیح دی جائیگی۔

نازبی بی۔ لاہور

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مجھے اپنی ایک کزن کے لیے ایک اچھے رشتے کی تلاش ہے میری کزن خوبصورت شریف فیملی سے ہے اس کی عمر بائیس سال ہے لڑکے کی عمر پچیس سال سے اٹھائیس سال تک ہو سرکاری ملازم ہو تو بہتر ہے ورنہ کسی بھی اچھی جاب میں ہو لڑکا شیر یف ہو جہیز کا لالچی ہو۔ اچھی سوچ کا مالک ہو فوری رابطہ کریں۔ لاہور والوں کو ترجیح دی جائیگی۔

زیبا۔ لاہور

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مجھے اپنی بیٹی کے لیے رشتے کی تلاش ہے میری بیٹی کی عمر 21 سال ہے نہایت شریف ہے تعلیم بہت کم ہے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ہم لوگ اس کو آگے نہ پڑھا سکے تھ لیکن پڑھنا لکھنا سب جانتی ہے۔ اس کے لیے ایسے رشتے کی تلاش ہے جو نہایت شریف ہو جو میٹرک پاس ضرور ہو اپنا کام کرتا ہو یا پھی کسی بھی اچے ادارے میں ملازم ہو برائے کرم جہیز کے لالچی لوگ رابطہ نہ کریں کیونکہ ہم اتنے زیادہ امیر نہیں ہیں اور وہ لوگ رابطہ کریں جن کو ایک اچھی شریک حیات کی تلاش ہو ہم جلدی اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں

ک بیگم

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

میں شادی کا خواہشمند ہوں میری عمر بیس سال ہے نہایت شریف فیملی ہے تعلمی انٹر ہے مجھے ایک ایسی شریک حیات کی تلاش ہے جو کم از کم میٹرک پاس ہو یا اس سے بھی کم ہو تو کوئی حرج نہیں شریف ہونا ضروری ہے۔ باپردہ ہو اور اچھے اخلاق کی مالک ہو میں اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کروں گا اس کو اچھے شوہروں جیسا پیار دوں گا فوری رابطہ کریں۔

الفت جان۔ سیالکوٹ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

دل کی آواز

نعت رسول ﷺ

جو شب غم میں شہ دین کو صدا دیتے ہیں

ان کی سوئی ہوئی قسمت وہ جگا دیتے ہیں

پوچھتے ہو کہ وہ آقا ہمیں کیا دیتے ہیں

کیا یہ کم ہے کہ وہ بندوں کو خدا دیتے ہیں

میرے سرکار ﷺ سے کرتا ہے جو اُلفت کوئی !

میرے سرکار ﷺ ضرور اس کو صلہ دیتے ہیں!

جب بھی تپتے ہوئے صحراؤں میں گھر جاتا ہوں

میرے آقا ﷺ مجھے دامن کی ہوا دیتے ہیں

یہ درُودوں کے چراغ اور سلاموں کے دیئے

اہل ایمان کو شب غم میں ضیا دیتے ہیں

کاش! ہر وقت رکھیں یاد مسلماں اس کو

جو سبق پیار کا شاہ ﷺ دوسرا دیتے ہیں

جب بھی ہو جاتا ہوں میں ہجر میں بے چین پرنس بابر

خواب میں سرور دین ﷺ جلوہ دکھا دیتے ہیں

پرنس بابر علی خاں بلوچ

☆ ☆ ☆

گھروندہ

موقع ہے جشن کا

میں آزادی مبارک کیسے کہوں ؟

میرے ہمنوا

میرے ہم وطن

مجھ کو یاد ہے تو

بس اتنا کہ۔۔

ایک گھروندہ تھا محبت کا

جس کا نام تھا پاکستان

قہقہے تھے فضا میں گونجا کرتے

خوشحالی تھی

احساس تھا

صبر بھی تھا، لحاظ بھی

پھر یوں ہوا

نا دیکھا گیا شر پسندوں سے

سکون، چین اور خوشی

پھر تلخیاں بڑھی

بڑھتی گئیں

نفرت پھیلی

پھیلتی گئی

خون بہا

اور بہتا گیا

گونجے لگیں یہاں

چیخیں بھی

اور آہیں بھی

اب اک گھروندہ ہ نفرت کا

جس کا نام ہے پاکستان

تو بتلاؤ مجھ کو

میرے عزیزوں

میں آزادی مبارک کیسے کہوں؟

میں جشن آزادی مبارک کس کو کہوں؟

(عائشہ انصاری)

☆ ☆ ☆

سنا ہے باغ میں پھولوں کا کھلنا اب نہیں

ممکن سنا ہے آسماں سے ہر گھڑی آنسو

برستے ہیں سنا ہے جنگلوں میں خوف

طاری ہے سنا ہے اب کہ بچے ہنس نہیں سکتے

سنا ہے اب کے دھرتی خوں کی پیاسی ہے

سنا ہے موسموں پہ اب خزاں

رت چھائی رہتی ہے بہاریں اب جھلستے

پھول دیتی ہیں عجب ہے نا گھڑی کسی

یہ آئی ہے مکمل خوف طاری ہے فضاؤں

میں ہواؤں میں عجب ہے نا عجب ہے نا

زمانے پہ نجانے کیوں کڑا شاہوں کا پہرہ

ہے عجب افکار ہیں ان کے عجب للکار

ہے ان کی کوئی زندہ یہاں دیکھو کبھی

زندہ سا لگتا ہے؟؟ اگر ممکن ہے تو دیکھو

کہو تم آنکھ والے ہو؟؟؟ کہوں بینائی رکھتے

ہو؟؟ سنو ایسا نہیں ممکن سنو ایسا نہیں

ممکن انوکھے کھیل ہیں ان کے انوکھی

سوچ رکھتے ہیں تماشے خوب کرتے ہیں

سبھی انداز کہتے ہیں کبھی جینے نہیں

دینگے سنو جینا نہیں ممکن تو پھر کس

کام کا جینا ہماری سوچ باغی ہے اسے اب

کام لانا ہے کہ اس جینے سے اچھا ہے

جہاں سے کوچ کر جانا مگر ایسے نہیں

جانا جہاں کو سوچ کا اب کے نیا اک

خواب دینا ہے زمانے بھر کے لوگوں کو

انوکھا باب دینا ہے سنو افکار بدلیں گے

سنو معمار بن جاؤ زمانہ چھو کے نہ

گزرے کہ یوں دشوار ہو جاؤ سنو جینے

سے اچھا ہے فسانہ دے کے مر جاؤ

از قلم نائمہ غزل

☆ ☆ ☆

جو مجھ کو چھوڑنا چاہو

جو مجھ کو توڑنا چاہو

فقط اتنا ہی تم کرنا

سبھی وعدے وناؤں کے

یوں پل بھر میں بھلا دینا

جو نا بڑا سنگ میرے تھا
اس کو تم مٹا دینا
میری آس کا جگنو
مٹھی میں اپنی قید کرنا کہ
اندھیرے چار سو کرنا
ٹھوکر کھا کے گروں تو
اپنا ہاتھ مت دینا
پھر تم یوں پلٹ جانا
کہ جیسے ہم ملے نہ تھے
نہ تھے ہم آشنا جاتم
جو مجھکو چھوڑنا چاہو
نہ پیچھے مڑ کر بھر مکنا
نہ میرے زخم پھر بھرنا
جو مجھ کو چھوڑنا چاہو
جو مجھ کو چھوڑنا چاہو
فقط اتنا ہی تم کرنا

مہک

☆ ☆ ☆

کہاں ڈھونڈوں تجھے

صبح سے شام تک سجنا
تیری ہی یاد آئی ہے
تیری ہی فکر رہتی ہے
کہ موسم تو بدلتے ہیں

کبھی بارش برستی ہے
کبھی کن من کبھی ساون

کبھی بادل کبھی برسات

میری کھڑکی کے ہر پٹ میں
جب بھی اہٹ ہوتی ہے

ہر اہٹ پہ یوں لگتا ہے
کہ جیسے تم لوٹ آئے ہو

میری یہی گزارش ہے کہ اب کہ لوٹ آو
تم مجھے یوں نہ رولا و تم

ساکن سانس لگتی ہے
ہر چیز بے جان لگتی ہے

اب کہ لوٹ آؤ تم
مجھے یوں نہ ستاؤ تم
شاعرہ مہوش ملک

☆ ☆ ☆

زندگی

اے مہربان زندگی الجھ گی ہوں میں
کتنا اور کیسے سنبھالوں خود کو
اب بس بکھر سی گی ہوں میں
ہنستی ہوں ہاں مسکراتی ہوں
ہر اک سے حال دل چھپاتی ہوں میں
ہر اک سے خلوص اور محبت سے ملکر
خلوص اور محبت نہ پا کر اشک بہاتی ہوں میں
زندگی کو کچھ پل سوچوں کیا ہے
یہ ویسی تو نہیں جیسے سپنے میں نے سنجوے
زندگی اتنی کٹھن کیوں ہے
منزل دور اور راہیں نہ ہموار ہیں
پریشان سی ہر جانب دیکھتی ہوں میں
کوئی شاتھ نہیں کتنی تنہا اکیلی ہوں میں
زندگی تو اپنوں کے سنگ گزارنا چاہی تھی ہر دم
اپنوں نے ہی زندگی کو کر دیا ہے تنگ
کتنا ضبط کتنا حوصلہ کروں میں
کب تک ہر بات سہتی رہوں میں
ایسا تو نہیں کہ بہت بُری ہوں میں
میں کب کہہ رہی ہوں کہ بہت اچھی ہوں میں
کہنے سننے کو تو جانے دو نور
نگاہوں میں ہے حقارت کیا اسی قابل ہوں میں
زندگی مختصر ہے گلے شکوے بھلا کر
مسکرا دو کہ مسکرا رہی ہوں میں

از قلم ریمانور رضوان

☆ ☆ ☆

اس شوخ کی جو مجھ پہ عنایت نہیں رہی
وابستہ مجھ سے کوئی مصیبت نہیں رہی
اپنوں نے وہ سلوک کیا ہے کہ اب مجھے
اغیار سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی
مکر و فریب، بغض و عداوت ہے ہر طرف
دنیا میں کیا کہیں بھی محبت نہیں رہی
واقف ہوا ہوں جب سے میں خود اپنے آپ سے
ہمدردیوں کی مجھ کو ضرورت نہیں رہی
بارِ غمِ جدائی نے یہ حال کر دیا
اب اور غم اٹھانے کی ہمت نہیں رہی
دنیائے رنگ و بو میں مجھے جانِ آرزو
تیرے سوا کسی کی بھی چاہت نہیں رہی
اس نے نگاہِ مست سے دیکھا تھا ایک بار
جام و سبو سے پھر مجھے رغبت نہیں رہی
مجبور کر دیا ہے غمِ روزگار نے
چاہت میں اب وہ پہلی سی شدت نہیں رہی
یاسرؔ مداوا درد کا ہوتا بھی کس طرح
مجھ کو غمِ زمانہ سے فرصت نہیں رہی...

(غلام مجتبیٰ یاسرؔ ہاشمی, حیدرآباد)

☆ ☆ ☆

غزل

حیات چاک گریباں ہے کیا کیا جائے
ترے بچھڑنے کا امکاں ہے کیا کیا جائے

لگے لبوں پہ تھے جو قفل توڑ ڈالے ہیں
خموش رہنے میں نقصاں ہے کیا کیا جائے

اداس چہرہ مرا اس لیے سبھی کو لگا
خفا خفا لب لرزاں ہے کیا کیا جائے

ابھی نہیں وہ گیا چھوڑ کر مجھے یارو
ابھی سے دل یہ پریشان ہے کیا کیا جائے

میں ہار دوں گا مقدمہ تری عدالت میں
مرے خلاف جو سلطان ہے کیا کیا جائے

ہوا ہوں دست گریباں میں تیرے غم سے آج
تو مجھ سے دور مری جاں ہے کیا کیا جائے

مرے چمن میں ہیں اترے خزاؤں کے موسم
چمن وفا کا یہ ویراں ہے کیا کیا جائے

شاعر خورشید زوہیب AK

☆ ☆ ☆

تم تو اپنی دنیا میں خوش ہوں گے
میرے دل کی دنیا تم سے آباد ہے
میری آنکھوں سے آنسو نکلتے ہیں
رُخسار کو چُھو کر قدموں پہ گرتے ہیں
پھر رو رو کر احتجاج کرتے ہیں جاناں
یہ یاد کرو اس کو جو تجھے بُھول گیا ہے ورنہ
ہم بھی آنکھوں سے بچھڑ جاتے ہیں جیسے
وہ بچھڑ گیا ہو تم سے جاناں
روز دلہن کی طرح بیٹھی ہوں
روز تیرا انتظار کرتی ہوں
لوٹ آؤ بس
اب لوٹ آؤ
میری جان کی قسم صنم اب لوٹ آؤ
سیدہ راشدہ عمران چک حعمرہ

☆ ☆ ☆

یہ کیسے موسم میں لوٹے ہو تم...
اب تو نہ پھولوں میں شبنم ہے باقی
نہ بہاروں کی رونقیں ہیں باقی
دریائوں کی طغیانیاں بھی نہیں باقی
اب کیوں لوٹے ہو تم..؟؟
ہے پت جھڑ کا موسم اب
زرد زرد سا منظر ہے سب

مرجھا رہی ہیں ساری کلیاں

ٹوٹا بکھرا ہے شجر کا پتہ پتہ

یہ کیسے موسم میں لوٹے ہو تم جاناں

کہ نہیں باقی رہی اب جزباتوں میں حدت

نہ نگاہوں میں بسی آس کوئی

نہ چہرے پہ رقم یاس کوئی

کیوں لوٹے ہو اس موسم میں تم

کہ اب تو بارشوں کی طلب نہیں رہی۔

خواہش محبت بھی نہیں رہی

کچھ بھی تو باقی نہ رہا.

میں بھی نہیں رہی باقی...

کیوں لوٹے ہو اب تم...

شاعرہ. اقصیٰ سحر

کراچی

☆ ☆ ☆

غزل عنوان ہے تنہا

چھوڑ کر نہ تنہا مجھ کو جاناتم

مر جائیں گے نہ پھر پچھتاناتم

زخم دے ہیں آپکی محبت نے مجھ کو

نیا زخم کوئی نہ ہم کو لگاناتم

اپنوں میں خلوص ہوتا ہے بہت

نبھا کر یہ قول بھی دکھاناتم

انکار نہیں جان دینے سے مجھ کو نور

اس بات کو بھی کبھی آزمانہ تم

سیدہ راشدہ عمران

☆ ☆ ☆

شعر عید

میں نے کہا کہ کیا تحفہ دو گے

مجھ کو اس عید پر عمران

کئی سالوں بعد یہ امگن

جاگی ہے میرے دل میں

سیدہ راشدہ عمران چک حعمرہ

☆ ☆ ☆

غزل

بھیگی پلکوں کی ہے آرزو دل میں بسالو

خاموش ہونٹوں کی ہے فریاد دل میں بسالو

جب بھی ڈائری میں کچھ لکھا تیر لے لیے

سادہ صفحوں کی لکیروں پر لکھا دل میں بسالو

تنہائیوں کے بادل چھائے ہیں دل پہ

خوشی بن کے برس جائیں دل میں بسالو

شام ڈھلتے ہی جو لکھے ہیں تیرے نام ندیم

ان بکھرے لفظوں کی ہے پکار دل میں بسالو

شاعر:۔ ندیم احمد ندیم ملتان

☆ ☆ ☆

غزل

زندگی میں زندگی کی ادا نہیں ملتی

حقیقت میں کسی کی دعا نہیں ملتی
تم لاکھ آزماتے رہو لوگوں کو
کسی سے دل نہیں ملتا تو کسی سے طبیعت نہیں ملتی
مجھے مغرور مت سمجھو دنیا والو
اک بس اسکی یاد سے مجھے فرصت نہیں ملتی
بات صرف محبت کی ہے دوست
کسی کو ملتی ہے بے حد تو کسی کو نفرت بھی نہیں ملتی
یوں تو ملتی ہے ہر چیز دنیا کے بازار میں
نہیں ملتی اگر کچھ تو وفا نہیں ملتی
وسیم طاہر ڈھکو ساہیوال

☆ ☆ ☆

غزل
کوئی آتا ہے یاد بہت سونے سے پہلے
جو چھین لیتا ہے آنسو میرے رونے سے پہلے
اب نیند بھی آئے تو میں سونا نہیں چاہتا
کسی قیمت پے بھی میں اسکو کھونا نہیں چاہتا
ہو جائے وہ کاش میرا مجھے کھونے سے پہلے
جو آتا ہے یاد بہت سونے سے پہلے
وسیم طاہر ڈھکو ساہیوال

☆ ☆ ☆

خیرات میں ملی خوشی مجھے اچھی نہیں لگتی فراز
میں اپنے دکھوں میں رہتا ہوں نوابوں کی طرح
وسیم طاہر ڈھکو ساہیوال

☆ ☆ ☆

سنو محبت کا مان ہو تم
میرے لئے سب سے خاص ہو تم
ہمارے درمیاں میں جو گزرے پل
اسے ہمیشہ یاد رکھنا تم
میں جو روٹھ جاؤں
تو منا لینا تم
محبت کا بھرم رکھنا تم
مجھے روٹھنے مت دینا
میری ذات ایک کا حصہ ہو تم
میری زیست کا حاصل ہو تم
میری زندگی کے سبھی رنگ تم سے ہیں
میری سبھی وفائیں تم سے ہیں
میرے جینے کا سہارا ہو تم
میری سبھی ضد سبھی مان ہو تم سے ہیں
اسے توڑنے مت دینا
میرا مان میری محبت ہو تم
اسے توڑنے مت دینا
مجھے روٹھنے مت دینا
از قلم شازیہ کریم

☆ ☆ ☆

نظم
تم کہتی ہو

میں تمہیں بھلا دوں
ہر یاد پرانی
میں مٹا دوں
تم کہتی ہو
جب یاد مجھے تمہاری آئے
تو میں آنسو نا بہاؤں
میں تم کو بس بھول جاؤں
جاناں تم بتاؤ مجھے
میں تمہیں کیسے بھول جاؤں
بتاؤ مجھے ؟
کیا میں تمہاری نظموں کا
عنوان نہیں رہا؟
کیا تمہاری زندگی میں اب میرا کوئی مقام نہیں رہا؟
بتاؤ مجھے ؟
میں کیسے تمہیں بھول جاؤں
تم تو کہتی تھی
خوشیکا گیت ہو تم
میری پریت ہو تم
پھر بتاؤ مجھے
میں کیسے تم سے دور ہو جاؤں
تم تو کہتی تھی
میں حصہ ہوں
تمہاری نظموں کا

اور تمہارے ہر لفظ سے
میں ہی لپٹا ہوں
پھر بتاؤں نا مجھے ؟
کیوں قلم تم اپنا
توڑ دو گی
مجھ سے میرے جینے کی امید
کیوں تم چھین لو گی
آخر کیوں تم
اپنی نظروں سے
مجھے دور کر دو گی
سنو تمہاری خاطر
میں جینا چھوڑ دوں گا
مسکرانا بھی
میں چھوڑ دوں گا
سارے وعدے قسمیں
اپنے خواب سب توڑ دوں گا
مگر جاناں
میں پھر بھی تمہیں
کبھی بھلا نہ پاؤں گا
نہ تم مجھے بھول پاؤں گئی
میں تو بس مر کے بھی
تمہاری سانسوں میں

زندہ رہ جاؤں گا

شاعرہ کنول خان

☆ ☆ ☆

غزل

جب فیصل وقت پر کچھ سانحے رہ جائیں گے

داستان زندگی کے تذکرے رہ جائیں گے

جانے والے کاش اتنا سوچ لیتا تو کبھی

اس شب تاریک میں سب در کھلے رہ جائیں گے

منزلوں کی جستجو میں چل پڑیں گے کارواں

گرد میں لپٹے ہوئے یہ راستے رہ جائیں گے

ہم نے سوچا ہی نہیں تھا اس تغیر کے لیے

ہر خوشی مٹ جائے گی بس دکھ ہرے رہ جائیں گے

آؤ مل کر دور کرتے ہیں سبھی شکوے، گلے

بدگمانی بڑھ گئی تو وسوسے رہ جائیں گے

ایک دن اس زندگانی کی غزل ہو گی تمام

جو نہ باندھے جا سکے وہ قافیے رہ جائیں گے

نیند سے آنکھوں کی ارشد چپقلش اچھی نہیں

دوریاں بڑھتی رہیں تو رتجگے رہ جائیں گے

ارشد محمود ارشد

☆ ☆ ☆

تم کون ہو

بھلا میرا سکوں اور چین

چھین لے گ ئے

ان انکھیوں کو ن ئے خواب دے گ ئے

دل میں نئی چاہت نئی امنگ جگا گ ئے

ہم نے تو پل بھر بات بھی نہ کی

بس ایکدوجے کو لمحہ بھر ہی دیکھا تھا۔

میرا دل یکبارگی ڈھڑکا تھا

تمھاری جھکی نگاہیں اٹھیں تھیں

ان نگاہوں میں اپنا آپ بہت حسین لگا تھا

دل چاہت کا طلبگار بن بیٹھا

نہ جانے کیوں کیسے پیار کر بیٹھا

از قلم۔ ریما نور رضوان

☆ ☆ ☆

غزل

غم کی سیاہ رات تھی اور میں تھا.

اشکوں کی برسات تھی اور میں تھا.

یہ منظر تو سارے شہر نے دیکھا ہو گا.

میری ذات زیرِ حادثات تھی اور میں تھا

شب بھر آنکھوں کے در کھلے رہے.

دل سے رنج کی ملاقات تھی اور میں تھا.

دلِ مضطر کی ہر بات سنائی تھی.

روبرو اس کی ذات تھی اور میں تھا.

وہ لزتِ گریہ کا منظر اللہ اللہ

اُس کی نظرِ التفات تھی اور میں تھا.

میں بات کو کشور طول نہیں دیتا.

اک عزاب بھری رات تھی اور میں تھا

عبدالخالق کشور. (پتوکی)

☆ ☆ ☆

بتاؤ کون کہتا ہے, محبت بس کہانی ہے

محبت تو صحیفہ ہے, محبت آسمانی ہے

محبت کو خدارا تم, کبھی بھی جھوٹ نہ سمجھو

محبت معجزہ ہے__ معجزوں کی ترجمانی ہے

محبت پھول کی خوشبو, محبت تتلیوں کا رنگ

محبت پربتوں کی جھیل کا شفاف پانی ہے

محبت اک ستارہ ہے, وفا کا استعارہ ہے

محبت سیپ کا موتی, بحر کی بیکرانی ہے

زمیں والے بتاؤ کس طرح سمجھیں محبت کو

محبت تو زمیں پر آسمانوں کی نشانی ہے

محبت روشنی ہے, رنگ ہے, خوشبو ہے, نغمہ ہے

محبت اڑتا پنچھی ہے, محبت بہتا پانی ہے

محبت ماؤں کا آنچل, محبت باپ کی شفقت

محبت ہر جگہ, ہر پل, خدا کا نقش ثانی ہے

محبت بہن کی الفت, محبت بھائی کی چاہت

محبت کھیلتا بچہ ہے...

محبت حق کا کلمہ ہے, محبت چاشنی من کی

محبت روح کا مرہم, دلوں کی حکمرانی ہے

محبت تو ازل سے ہے, محبت تا ابد ہو گی

محبت تو آفاقی ہے, زمانی نہ مکانی ہے

فنا ہو جائے گی دنیا, فنا ہو جائیں گے ہم تم,

فقط باقی محبت ہے, محبت جاودانی ہے

فریحہ_چوہدری، سرگودھا

☆ ☆ ☆

"دل"

دل ہے ناداں

فقط تیرا ہی

ہونا چاہے

تیرے سنگ

ہنسے

تیرے سنگ

رونا چاہے

تیری آمد

سے یہ کھل

اٹھتا ہے

تیری دید

سے شاد

ہوتا ہے

ہر آن بس

تجھ کو

دیکھنا چاہے

دل ہے ناداں

فقط تیرا ہی

ہوناچاہے
تیری جدائی
کے خوف
سے لرز جاتا ہے
تیرے ملن
کی دعا
یہ کرتا ہے
تیری خاطر
ہی اب
دھڑکناچاہے
دل ہے ناداں
فقط تیرا ہی
ہوناچاہے
یہ مانتا نہیں
دنیا کے رسم
ورواج
نہ دیکھتا ہے
زمانے کا مزاج
تجھ کو ہر
صورت یہ
پاناچاہے
دل ہے ناداں
فقط تیرا ہی

ہوناچاہے
شاعرہ: فرح بھٹو

☆ ☆ ☆

معطل نہیں تو روانی بھی نہیں
دائم نہیں محبت تو فانی بھی نہیں
عجب دوراہا سفر میں ہوں
منزل کھونی بھی نہیں تو پانی بھی نہیں
اس سے بچھڑنے کا خدشہ کیونکر ہو
یقین نہیں اگر تو بد گمانی بھی نہیں
وہ اس تناسب سے گویا ہوا
بات ٹالی بھی نہیں بات مانی بھی نہیں
ایسے آشیانے کی باسی ہوں
جسے راہ جانی نہیں تو آنی بھی نہیں
انیلہ مرتضی,ڈسکہ

☆ ☆ ☆

اے وطن اے وطن
تجھ پر قربان
میرا تن میرا من
تو ہے پہچاں میری
تجھ میں ہے جاں میری
سدا مہکتا رہے یہ چمن
اے وطن اے وطن
تجھ پر قربان

میرا تن میرا دھن
یہ لہو جو میرا ہے
صدقے یہ تیرا ہے
جب بھی مانگے
میں باندھ لوں کفن
اے وطن اے وطن
تجھ پر قربان
میرا تن میرا دھن
تجھ کو پانے کی
خاطر کیسی قربانی دی
ہمارے بڑوں نے ہمیں
کیسی سی آسانی دی
اب ہمیں دکھانی ہے
اپنی بھی لگن
اے وطن اے وطن
تجھ پر قربان
میرا تن میرا دھن
یہ جو دشمن تیرے
تجھ سے بیزار ہیں
ان کو بتانا ہے ہم
تیرے جاں نثار ہیں
نہ جیت پائیں گے یہ
کر لیں کیسے ہی جتن
اے وطن اے وطن
تجھ پر قربان
میرا تن میرا دھن
شاعرہ: فرح بھٹو (حیدر آباد)

☆ ☆ ☆

خاموشی رات کی دیکتھا ہوں اور تجھے سوچتا ہوں
مدہوش اکثر ہو جاتا ہوں اور تجھے سوچتا ہوں

ہوش والوں میں جاتا ہوں تو الجھتی ہے طبعیت
سو باہوش پڑا رہتا ہوں اور تجھے سوچتا ہوں

تو من میں میرے آ جا میں تجھ میں سما جاؤں
ادھورے خواب سمجھتا ہوں اور تجھے سوچتا ہوں

جمانے لگتی ہیں جب لہو میرا فرخت کی ہوائیں
تو شال قربت کی اوڑھتا اور تجھے سوچتا ہوں

(انتخاب: دانش انقلابی)

ممتاز شاعرہ کنول خان کا کلام پیش خدمت ہے

گڑیا

رورو کہ مانگی تھی جو
بابا آپ سے گڑیا
پیاری سی
نیلی آنکھوں والی گڑیا
میری سہیلی میری ہم جولی
تھی وہ میرے بچپن کی گڑیا
سوتی تھی لپٹ کہ جس سے
کھیلتی تھی ہر وقت جس سے
بابا آپ ہی
لائے تھے نہ وہ گڑیا
لوٹ آئیں نہ بابا
کہ یاد دلاتی ہے
بہت رلاتی ہے
آپ کی لائی گڑیا

☆ ☆

نظم

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
جب میں اور تم
ہنستے مسکراتے
اس پیڑ کہ سائے میں
بیٹھ کے اک دوسرے کا نام
ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ کر کے
لکھا کرتے تھے
تو یاد ہے تم کو
پھر ایک دوجے کو دیکھ کہ
کتنا مسکرایا کرتے تھے
آنکھوں ہی آنکھوں میں
بے شمار سپنے سجایا کرتے تھے
یاد ہے تم کو؟
رنگ برنگی تتلیوں کو
پکڑنے کی خواہش میں
ان کے پیچھے بھاگنا
اور پھر ناکام ہو کہ
وہیں زمین پے بیٹھ جانا
پھر اپنی ہی حرکتوں پہ
ہنس ہنس کہ لوٹ پوٹ ہو جانا
جانے پھر کیا ہوا
قسمت ساتھ نہ تھی یا جائے!
مقدر ہی میں تھا بچھڑنا
بس پھر اداسی تھی
تیری یاد تھی
وہی پیڑ، وہی نام
وہی رنگ برنگی تتلیاں
بس فرق اتنا تھا
ساتھ تم نہ تھے
لیکن!
ساتھ دے رہے تھے
تیری یاد میں
آنکھوں سے بہتے آنسو

☆ ☆ ☆

نظم (آواز)

صبح سویرے، ہنستے کھلتے
کندھوں پہ سکول کا بیگ اٹھانے
جب میں اپنے ہم عمر بچوں کو
ماں باپ کا ہاتھ تھامنے
سڑک کے اس پار
حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوں
تو ایک آواز مجھ میں بہت شور مچاتی ہے
کہ یہ میرا بھی حق ہے
کیونکہ میں بھی تو
جناح کا وارث ہوں

☆ ☆ ☆

محبت نامے

السلام علیکم! تمام داستانِ دل کے قارئین کو سب سے پہلے گذشتہ یوم آزادی کی مبارک باد۔ دوستو! آج داستانِ دل کا پہلا شمارہ ڈائجسٹ کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ کچھ گورنمنٹ اشوز کی وجہ سے فی الحال یہ آن لائن پبلش ہو رہا ہے لیکن آپ کی دعاؤں کی بدولت انشاء اللہ یہ داستانِ دل آپ کے ہاتھوں میں آپ کے پاس ہو گا۔

دوستوں جہاں یوم آزادی کو آپ نے جوش و جذبہ سے منایا وہاں ہمیں اپنے کشمیری بھائیوں کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ اپنی آزادی میں انہیں بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ آج اگر ہم آزادی منا رہے ہیں تو وہ آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کر رہے ہیں۔ روزنہ نا جانے کتنے معصوم کشمیری صرف اس جرم کی پاداش میں شہید کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے ملک کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ دوستو! ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہمارے بزرگوں نے بھی بالکل ایسی ہی قربانیوں کے عوض یہ پاک سرزمین حاصل کی۔ ہماری آزادی آج صرف ہلا گلا اور شور شرابے پر ہی محیط ہو چکی ہے۔ ہم ان قربانیوں کو پس پشت ڈال چکے ہیں جو ہمارے بزرگوں نے ہمارے پیارے وطن کی خاطر پیش کی۔ ایک وقت تھا جب آزادی کا مطلب قربانی اور بچھڑوں کی یاد میں دعائیں کرنا تھا مگر آج کی نسل صرف شور شرابے کو ہی آزادی سمجھتی ہے۔ سیر و تفریح کر لینے سے ایسا سمجھتے ہیں جیسے آزادی کا حق ادا کر دیا۔ نہیں دوستو۔۔۔ یہ سب ہماری بھول ہے۔ آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ فیس بک پر آزادی مبارک کا سٹیٹس لگا لیا یا پھر سبز و سفید لباس پہن لیا بلکہ آزادی کا مطلب تو وطن کے لئے دعائیں کرنا ہے۔ آزادی کا مطلب اپنے ملک کے پرچم کو سربلند کرنا ہے۔ ہم بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ پاکستان کا جھنڈا اپنے گھروں کی چھت پر لگاتے ہیں۔ بازاروں اور گلی محلوں کو چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں سے سجاتے ہیں لیکن میرا آپ سب سے سوال ہے کہ آپ میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جو چودہ اگست گزر جانے کے بعد انہی جھنڈیوں کو پاؤں میں آنے سے بچاتے ہیں۔ کتنے لوگ انہیں اتار کر احترام کے ساتھ ایک طرف رکھتے ہیں؟ کیا یہی عزت ہے ہمارے دلوں میں اپنے پرچم کے لئے؟ صرف چودہ اگست ہی محب وطن بننا ہوتا ہے ہمیں؟ اگر یہی محب

وطنی ہے تو اس وطن کو ایسے محب وطن کی ضرورت نہیں۔۔۔

دوستو! محب وطن تو وہ لوگ تھے جنہوں نے 6 ستمبر کو اپنی جانوں کا نذرانہ دیا۔ جنہوں نے دشمنوں کو ایسے للکارا کہ اس نے پسپا ہو کر کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ محبت وطن تو وہ لوگ تھے جو خود تو اس دنیا سے چلے گئے مگر اپنا نام اور پہنچان اس وطن پر قربان کر گئے اور دیکھیے اس وطن نے ان کی قربانیوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا۔ انہیں دنیا سے گئے کتنے برس بیت گئے مگر ان جاں نثار نوجوانوں کو دنیا آج بھی سلام کہتی ہے۔

آخر میں آپ سب سے ہی گذارش ہے اگر محب وطن بننا ہے تو ایسی محب وطنی اختیار کیجیے کہ دنیا آپ کی بدولت آپ کے وطن کی عزت کرے کیونکہ پاکستان ہے تو ہم ہیں۔

آپ سب کے سامنے داستانِ دل کا ستمبر 2016 کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے اور قلم اٹھائیے اور اپنا محبت نامہ لکھ بھیجیے۔ اگلے شمارے میں انہی صفحات پر دوبارہ ملاقات ہو گی۔ تب تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ محمد شعیب ☆☆

☆ پہلا محبت نامہ بھیجا ہے ہمیں **علی رضا** نے بھیجا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ۔ داستانِ دل بہت عمدہ ہے۔ نئے لکھنے والوں کے لئے ایک عظیم تحفہ ہے۔ داستانِ دل پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بہت عمدہ تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ شاعری میں غزلیں اور اشعار کمال کے تھے۔

(آپ کا شکریہ! آئندہ بھی تبصرہ کرتے رہئے گا)

☆ اب آگے محبت نامہ شامل کیا جا رہا ہے **نایاب ملک** کا، انہوں نے صرف ہمارے شمارے کی ایک ناول "لازوال" پر ہی تبصرہ لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں: شروع میں ہی نصیحتیں، مگر چلو اسلامی تھی۔ اس لئے اچھی لگی اور پھر وجیہہ کی انٹری بھی خوب تھی مگر انمول کچھ زیادہ ہی گھمنڈی نہیں تھا کیا۔ پوری کی پوری دادی کی روح ہے وجیہہ تو۔ دوسری طرف ضرغام کیا ڈائلاگ تھے اس کے۔ میں تو فدا ہو گئی۔ ایک پیج پر صرف اسی کے ڈائیلاگ، ہیروئن کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ واقعی ہیرو لگ رہا تھا۔ اب اگلی قسط کا انتظار رہے گا

(لازوال آپ کا اچھا لگا۔ اس کے لئے آپ کا مشکور ہوں لیکن باقی شمارے پر بھی تبصرہ لکھا کریں)

☆ آگے تشریف لا رہی ہیں سیدہ راشدہ عمران: آپ لکھتی ہیں۔ اسلام علیکم! سر ندیم عباس صاحب آپ کیسے ہیں امید ہے کہ خیریت سے ہونگے سر میرا آپکے داستان دل میں پہلا لیٹر ہے۔ اُمید کرتی ہوں کہ شائع ہو جائے گا آپ کا داستان دل تو سچ میں داستان دل ہی ہے اللہ تعالیٰ آپکو دن بادن درجہ با

درجہ ترقی دے میری اپنے بہن بھائیوں سے گزارش ہے کہ عید کی خوشیاں اپنے پیاروں کے ساتھ انجوائے کریں جو روٹھے ہیں آنکو منائیں جو بچھڑے ہیں اُنکے لیے دُعا کریں اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پر اپنی رحمت فرمائے۔

عید نا م ہے محبت کا
عید نام ہے خوشی کا
عید نام ہے اپنے پیاروں کا گلے لگانے کا
عید نام ہے بھائی چارے کا
عید نام ہے مہندی کی خوشبو کا
عید احساس ہے کھنکتی چوڑی کا
عید احساس ہے محبوب سے ملنے کا

میرا بھائی ملک سے باہر رہتا ہے بھائی اگر آپ تک داستان دل پہنچا ہے تو مس ۔یو۔ اللہ تعالیٰ آپکو اپنی حفاظت میں رکھے آمین۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا سب کو میری طرف سے دلی آزاد مبارک ہو۔(بہت شکریہ ،،جی انشاء اللہ ہم سب کو جگہ دیں گے ،آپ بس اب لکھتے جاؤ ،ہمارے پاس کوئی ردی کی ٹوکری نہیں۔ آپکو بھی بہت بہت آزادی مبارک ہو)

☆اب تشریف لاتی ہیں راشدہ لطیف۔ وہ کہتی ہیں: السلام علیکم !ماہ جون بطور گفٹ وصول ہوا دیکھ بہت خوشی ہوئی بہت ہی اچھی کاوش ہے امید کرتا ہوں کہ یہ سلسلہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا تحریروں میں سب ایک دوسرے سے لاجواب تھی غزلیں ، نظمیں بے حد پسند آئی اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے آمین۔(بہت شکریہ ہمیشہ آتے رہنا۔نوازش)

☆ہماری محفل میں چار چاند لگانے اب آرہے ہیں حافظ عنایت اللہ: السلام علیکم !جناب ایڈیٹر ملک ندیم عباس ڈھکو صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ ہماری پبلک لائبریری ہے جس کے لیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے آپ اپنا میگزین ہماری لائبریری کے لیے اعزازی جاری کر دیں۔یا اپنے پرانے شمارے مطالعے کے لیے عطیہ کر دیں(جی انشاء اللہ ضرور،،،،بہت شکریہ ہمیشہ آتے رہنا۔نوازش)

☆شعیب حمید خان سعودی عرب سے لکھتے ہیں کہ داستانِ دل ایک اچھی کاوش ہے۔ ادب کی دنیا میں ایک نیا نام ہے۔ امید ہے کہ آگے چل کر یہ بہت ترقی کرے گا۔ آج کل خواتین کے بہت سے ڈائجسٹ تھے جبکہ مرد حضرات کے کئے بہت کم ڈائجسٹ ہیں اور خاص طور پر رومانوی ڈائجسٹ تو بہت ہی کم ہیں۔ داستانِ دل میں ہر قسم کی تحریر کو پڑھ کر اچھا لگا اور پھر مرد حضرات کی رومانوی تحاریر پڑھ کر خوشی محسوس ہوئی۔ دوسرے اداروں کو بھی سوچنا چاہیئے کہ ہم مرد بھی کچھ رومانوی لکھ سکتے ہیں۔ صرف خواتین کے لئے ڈائجسٹ کو خاص کر دینا کوئی معقول بات نہیں۔ خیر ان کا مسئلہ ان کے ساتھ۔ بہر حال داستانِ دل ایک اچھی کاوش

ہے۔ مجھے امید ہے کہ آگے چل کر یہ بہت ترقی کرے گا اور ایک دن اآئے گا جب اس کا شمار پاکستان کے صف اول ڈائجسٹ میں شامل ہو گا۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ (شکریہ آپ کا، داستانِ دل کو اتنا سراہا۔۔۔ ہم آپ کے بھروسے کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیں گے اور انتھک محنت کریں گے تاکہ داستانِ دل آپ کے خوابوں کو پورا کرے)

☆ سوات سے محمود اقبال لکھتے ہیں: داستانِ دل کو اس ناچیز کا سلام! بعد عرض آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ سب سے پہلے آپ کو اس نئے اخبار کی مبارکاں۔۔ چلیں اب جلدی سے مٹھائی کھلائیں اور مجھے گلاب جامن پسند ہے، برفی تو بالکل مت بھیجنا وہ آپ کھالینا۔ کیونکہ اتنے اچھے میگزین کو ہم تک پہنچانے کے لئے۔ داستان دل میں نئے رائیٹرز کو آپ سراہتے ہیں۔ بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ آج کل نئے رائیٹرز کو سراہنے والے ڈائجسٹ بہت کم ہیں اور خوشی ہوئی کہ آپ کا میگزین انہی میں سے ایک ہے۔ تبصرے کے لئے پھر کبھی حاضری ہوگی۔ اس دفعہ تو بس مٹھائی کھانے تشریف لائے ہیں ہم۔ دیکھتے ہیں کہاں تک ہمارے کہے کا مان رکھتے ہیں۔ (ماشاء اللہ اتنی اچھی اچھی باتیں: اگر مٹھائی کھانی ہے تو آجائیں جلدی سے ہمارے پتے پر۔ اب ٹی سی ایس تو کرنے سے رہے۔۔!!!)

☆ جھنگ سے ہمیں محبت نامہ بھیجا ہے ثریا محمد حسین نے، آپ لکھتی ہیں: السلام علیکم! پیارے بھائی مجھے آج ہی داستان دل ملا ہے۔ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی (یقین نہیں آتا اتنا پیار نوازش) شمارے کا سب سے پہلے بھائی شام تنہائی پڑھی بہت ہی اچھی لگی ہے۔ بھائی پورا مہینہ انتظار کرتی ہوں لیکن پھر بھی باقی آئندہ شمارے کے لیے لکھ دیتے ہیں۔ کب پوری ہو گی؟ (اس دفعہ چیک کرنا آئندہ ماہ رائے دینا) مجھے بے حد پسند آئی آپکی سٹوری۔ باقی سب تحریریں بہت اچھی ہیں منظور اکبر تبسیم جھنگ کی سٹوری کو بھی جگہ دی جائے اچھا لکھتے ہیں۔ (ہمارے پاس جو آئی آپی وہ شائع ہو گی ہم انتظار کر رہے ہیں خود جناب کی تحریروں کا) میری دعا ہے کہ داستان دل پوری دنیا میں چھا جائے اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے بھائی آمین۔

☆ جمیلہ انور سرگودھا سے لکھتی ہیں: مجھے بس آپ سے ایک ہی شکوہ ہے کہ اتنا اچھا اخبار ڈائجسٹ کیوں نہیں بن رہا؟ آخر اتنے اچھے اخبار کو ڈائجسٹ کی شکل میں انٹری کرنی چاہئے تھی۔ مجھے انتظار ہے کہ کب ہمارا ڈائجسٹ ہمارے ہاتھوں میں ہو گا اور ہم اسے جب دل چاہے پڑھ سکیں گے۔ جو بات ہاتھوں میں لے کر کہانیاں پڑھنے میں ہے۔ وہ نیٹ پر پڑھنے میں کہاں؟

آپ اب جلدی جلدی ڈائجسٹ کی شکل میں لے آؤ۔ کیونکہ میری اتنی تحاریر رہتی ہیں جو میں نے داستان دل میں بھیجنی ہے مگر صرف اس لئے میرے پاس پڑی ہیں کیونکہ آن لائن

پبلش ہورہا ہے۔ جیسے ہی یہ ڈائجسٹ کی شکل میں آئے گا۔ میرے پاس رکھی ہوئی تحریر آپ کے پاس ہونگی۔ تو پھر فٹافٹ ڈائجسٹ میں لائیے اور میری تحاریر کو حاصل کریں۔ کیونکہ اتنا اچھا اخبار صرف ڈائجسٹ کی شکل میں ہی اچھا لگتا ہے۔(لو جی۔۔۔ یہ تو پیشکش کر دی آپ نے۔۔۔آپ جلدی سے ہمیں بھیج دیں اپنی تحاریر۔۔ہم اپنے پاس محفوظ کرلیں گے۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔بس ایک دوماہ مزید۔۔اس کے بعد آپ کا داستانِ دل آپ کے ہاتھوں میں ہوگا)

☆ واجد لکھتے ہیں اسلام آباد سے: داستانِ دل ایک بہت اچھا میگزین ہے۔ ادب کی دنیا میں بہت اچھا نام ہے۔صرف چند شمارے شائع ہوتے ہی اتنی شہرت حاصل کرنا کسی عام کی بات نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی ایسی تحاریر کو شائع کرکے اس شمارے کو چار چاند لگائیں گے۔(دعا کے شکریہ)

☆ اقدس منصور عباسی لکھتے ہیں: داستانِ دل کا شمارہ ملا، پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔یقیناً ادب کی دنیا میں ایک نیا اضافہ ہے۔ میری دعائیں اور نیک تمنائیں داستانِ دل کے ساتھ ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ داستانِ دل دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔(آمین)(آپ کا شکریہ اتنی اچھی دعائیں دینے کے لئے)

داستانِ دل میں تحریر بھیجنے کا طریقہ

آپ اپنے لکھے گئے افسانے،ناولٹ اور ناولز ہمیں ڈاک کے ذریعے بھیج سکتے ہیں یا پھر وٹس ایپ کر سکتے ہیں یا پھر ہمیں موبائل پر میسج کر سکتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ آپ کی تحریر اردو میں لکھی گئی ہو۔ ہمارا ایڈریس ہے

ندیم عباس ڈھکو، چک نمبر 5/79 L: تحصیل و ضلع ساہیوال 5/78 L ڈاکخانہ.

ہمارا نمبر ہے:03225494228

abbasnadeem283@gmail.com

اگر آپ داستانِ دل کے ریگولر رائیٹرز بننا چاہتے ہیں تو ابھی اپنی بارہ عدد تحاریر ہمیں بھیجیں اور بن جائیں ہمارے ریگولر رائیٹر

صاحب زادہ عبد الرزاق آفرین

ساہیوال کے معروف نعت خواں اگلے ماہ آ رہے ہیں آپ سے ملنے میں۔ تیار رہے ان کے انٹرویو کے لئے

صاحب زادہ عبد الرزاق آفرین

چئیر مین ملک ندیم کامران سے ایوارڈ لیتے ہوئے

اور

ساہوال چئیر مین سے ایوارڈ لیتے ہوئے

قارئین رائیٹر سے ادارہ تک؟

آپ کو یہ مکمل شمارہ پڑھ کر کیسا لگا؟ ⁕

اس میں کیا کیا سلسلے دیکھنا چاہتے ہیں؟ ⁕

اس شمارے میں آپ کو کیا کمی نظر آئی؟ ⁕

ہماری ٹیم میں سے کسی سے کوئی شکایت؟ ⁕

کس رائیٹر کی تحری آپ ہر ماہ پڑھنا چاہتے ہیں اور کیوں؟ ⁕

ایڈیٹر سے آپ کا کوئی سوال؟ ⁕

نوٹ:۔ قارئین رائیٹر سے ادارہ تک کے تمام سوالوں کے جواب آپ ہمیں0322-5494228 SMSپر یا واٹس ایپ کریں انشااللہ آپ کے جوابات کو آئندہ شمارے میں آپ کے نام کے ساتھ جگہ دی جائے گی اور آپکی رائے پر عمل بھی کیا جائے گا کیونکہ داستان دل ہمارا نہیں بلکہ آپ کا سب کا ہے۔(ایڈیٹر)